ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کی مرحلہ وار تاریخ

برِصغیر میں اسلام

این میری شمل

مترجم : ارشد رازی

برصغیر میں اسلام

این میری شمل

مترجم: محمد ارشد رازی

پرنٹ لائن پبلشرز

32۔ لیک روڈ پرانی انار کلی لاہور فون: 7234002-7233389 فیکس نمبر: 7244226

ضابطہ

کتاب ——— برصغیر میں اسلام

مصنفہ ——— این میری شمل

مترجم ——— محمد ارشد رازی

سن اشاعت ——— اپریل 2000ء

ایڈیشن ——— پہلا ایڈیشن

اہتمام ——— مجاہد حسین

پروڈکشن ——— محمد علی۔ آصف خالد

معاونین ——— ذوالفقار حیدر، ارشاد الحق

کمپوزنگ ——— جٹ انٹر پرائزز لاہور Ph: 6311951

قیمت: ——— =/180 روپے

﴿میاں محمد خالد نے یہ کتاب المطبعۃ العربیہ سے شائع کی﴾

فہرست

رومی کی دوسری مرید

ہمارے عہد میں رومی کے مرید اول علامہ اقبال تھے۔ اقبال کے شاہکار ''جاوید نامہ'' میں مولانا ان کے ورجل بنے۔ اسلامی تہذیب و تمدن پر اہلِ الرائے زندہ افراد میں سے عظیم ترین این میری شمل کو اقبال اور رومی سے یکساں لگاؤ ہے۔

ابھی حال ہی میں وہ گوئٹے سنٹر میں ''اسلام اور مغرب'' کے موضوع پر لیکچر دینے کے لئے موجود تھیں۔ ہوٹل آواری کے اپنے کمرے میں بیٹھے انہیں بمشکل چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی بجی اور کسی نے ملاقات کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ جون 1997ء تک ان کے اوقات کار کے ہر گھنٹہ کی مصروفیات طے ہو چکی ہیں۔ ان مصروفیات میں اقبال پر لندن میں ایک لیکچر بھی شامل تھا۔

انہوں نے پشاور میں رحمان بابا پر ایک لیکچر پشتو میں دیا تھا۔ جو ان کے خیال میں سندھی کی طرح ان کی پہلی محبت یعنی ترکی زبان سے زیادہ مشکل ہے (ماہرین متفق ہیں کہ سیکھنے کے اعتبار سے ترکی مشکل ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے) انہیں سندھ سے محبت ہے۔ وہ اس کے دانشوروں' روادارانہ تمدن اور عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف کی مداح ہیں۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ وہ بڑی محبت سے سندھ کے اولین دانشور علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی اور ان کے شاگرد پیر حسام الدین راشدی کو یاد کرتی ہیں۔ انہوں نے کئی بار ماکلی کے مقابر کی سیر کی ہے۔ بون کے ایک کیفے میں صحافی ٹونی روسیٹنی (Tony Rositni) نے سرگوشی میں مجھے بتایا کہ وہ ماکلی میں دفن ہونا پسند کریں گی۔

1982ء میں انہوں نے گوئٹے کی ڈیڑھ صد سالہ برسی پر حکومتِ پاکستان سے درخواست کی تھی کہ کسی سڑک کو اقبال کے اِس ممدوح اور جرمنی کے قومی شاعر کے نام

سے موسوم کیا جائے۔ حکومتِ پاکستان نے مال روڈ سے جیل روڈ تک نہر کنار کی سڑک گوئٹے کے نام موسوم کر دی۔ یہی نہیں بلکہ نہر کی دوسری طرف کی سڑک این میری شمل سے موسوم کر دی گئی۔ یہ جڑواں سڑکیں جرمنی اور پاکستان کے خصوصی تعلق کی آئینہ دار ہیں۔ یہ تعلق پاکستان کے قومی شاعر نے قائم کیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں بغرض تعلیم جرمنی میں مقیم رہے۔ شمل ہنستے ہوئے کہتی ہیں "پاکستان نے میرے مرنے کا انتظار بھی نہیں کیا" وہ عمر کی آٹھویں دہائی میں ہیں اور اچھی صحت کی مالک ہیں۔

اسلامی تہذیب پر ان کے علم کی اسلامی دنیا معترف ہے۔ ابھی حال میں انہوں نے مصر میں کلاسیکی عربی شاعری پر عربی میں لیکچر دیا تھا جہاں صدر مبارک نے ان کا استقبال کیا تھا۔ انہوں نے یمن' شام اور مراکش میں بھی اس ورثہ پر لیکچر دیئے تھے' جسے بیشتر عرب بھی فراموش کر چکے ہیں۔ تیونس میں انہوں نے اقبال کے افکار احیاء نو پر لیکچر دیا۔ تہران میں ایک فارسی لیکچر مولانا رومی کے عشق رسولؐ پر دیا جس میں جدید انقلابی مسلمانوں میں ماضی کے عظیم صوفیاء کے متعلق پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انہوں نے ازبکستان میں ایک لیکچر وہاں کے عظیم مسلم ورثہ پر دیا۔ کہتی ہیں "اگر کوئی ازبک کم رفتار سے بولے تو میں سمجھ سکتی ہوں اور اوسمانلیؒ (Osmanli) میں جواب بھی دے سکتی ہوں"

پاکستان ان کی پہلی محبت ہے۔ پاکستان کا جواب بھی اسی طرح کا ہے۔ وہ بڑی محبت سے گورنر سٹیٹ بینک ممتاز حسن' فلسفہ کے عظیم استاد ایم ایم شریف' مورخ ایس ایم اکرام' عالم خلیفہ عبدالحکیم اور پیر حسام الدین راشدی کو یاد کرتی ہیں جو انہیں دور جوانی میں بار بار پاکستان میں خوش آمدید کہتے تھے۔ انہیں 1963ء میں بزم اقبال کی دعوت پر گورنمنٹ کالج لاہور کا اردو میں لیکچر دینا یاد ہے۔

آج کل علامہ اقبال کے بیٹے جاوید اقبال ان کے معتقد ہیں اور بو لینے سٹریس' بون میں واقع ان کی رہائش گاہ پر اکثر و بیشتر انہیں ملنے جاتے ہیں۔ قومی اعزازات دیئے جانے لگے تو انہیں اعلیٰ ترین ہلال امتیاز اور ستارہ قائد اعظم دیا گیا۔

اپنے موضوع سے ان کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ انہیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کس درجہ محنت کرتی ہیں۔ حالانکہ وہ بون یونیورسٹی میں 1961ء اور ہارورڈ میں 1970ء

سے پڑھا رہی ہیں۔ اسلامی دنیا نے بھی ان کے کام کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ مصر کے حسنی مبارک سے سائنس اینڈ آرٹس کا فرسٹ کلاس ایوارڈ اور ترکی سے ترک ثقافتی ورثہ کی خدمت کرنے پر گولڈ میڈل ملا۔ آسٹریا نے انہیں (Hammer Purgstall) اعزاز دیا۔ لاس اینجلس نے اسلامیات میں ان کے کام پر انہیں Dirlla Vida ایوارڈ دیا۔ جرمنی نے انہیں مشہور Ruecart میڈل اور Vass میڈل برائے ترجمہ دیا۔ جرمن پبلشرز کی یونین نے انہیں اپنا اعلیٰ ترین اعزاز دیا ہے جو ان کے نزدیک بہت وقیع ہے۔ بین المذاہب تفہیم پر ان کے کام کے اعتراف میں انہیں کچھ اور جرمن اعزاز بھی دیئے گئے۔

این میری شمل ایک قصبے Erfurt میں پیدا ہوئیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقی جرمنی میں چلا گیا۔ ان کا گھرانہ ملازمت پیشہ تھا اور شاعری اور فلسفہ سے خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ انہیں گھر میں کلاسیک جرمن شاعری کا پڑھنا یاد آتا ہے جن میں ان زلکے کا کام بھی شامل تھا۔ جرمن ڈرامہ اور شاعری میں مشرقی افکار نے انہیں مشرق کی طرف متوجہ کیا۔ سات سال کی تھیں کہ ان کے والدین پر کھل گیا کہ یہ بچی عام نہیں اور نہ اس پر پرورش اور تعلیم وتربیت کے معمول کے طریقوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ پندرہ برس کی عمر میں انہیں عربی کا استاد مل گیا۔ جس میں کلاسیکی عربی شاعری کا ذوق موجود تھا۔ ان کی دوسری محبت ترکی زبان تھی جو انہوں نے یونیورسٹی پہنچنے سے پہلے سیکھ لی تھی۔ اپنے مضمون کے باعث انہیں فارسی سیکھنا پڑی جو مولانا رومی میں ان کی دلچسپی کا سبب بنی۔

انہیں افسوس ہوتا ہے کہ انگریزی اچھی طرح نہ سیکھ سکیں (واقعی!) کیونکہ وہ ایک سال کے دورانیہ میں دو جماعتیں پاس کرنے میں مصروف تھیں۔ حیرت ہے کہ جب انہیں ڈاکٹریٹ ملی تو ان کی عمر صرف انیس برس تھی۔ یہ جرمن ریکارڈ ہے اور پھر ایسے زمانے میں جب اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں خواتین کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی جاتی تھی۔ ان کا تبصرہ ہے کہ تعصب اب بھی موجود ہے کہ انہیں بون یونیورسٹی میں چیئر نہ دی گئی۔ ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع تھا "مملوک مصر میں قاضی اور خلیفہ کا رتبہ"۔

بتاتی ہیں کہ جنگ ختم ہونے سے چار دن پہلے ان کے والد مارے گئے۔ دوران تعلیم چھ ماہ تک جبری مزدوری کرنا پڑی جس میں چھ یوم فی ہفتہ ایک فیکٹری میں کام کرنا پڑتا تھا۔ جنگ کے بعد وہ مغربی جرمنی میں تھیں۔ یہاں وہ وزارت خارجہ میں ترکی کی ترجمان اور

مترجم کا کام کرتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے تدریسی مقالہ کے لئے تحقیقی کام بھی جاری رکھے ہوئے تھیں۔ جب ماربرگ یونیورسٹی (Marburg University۔) نے انہیں عربی' فارسی' ترکی' اسلامی مذہب اور فنون کی تاریخ کا پروفیسر مقرر کیا تو ان کی عمر فقط تئیس برس تھی۔

1949ء میں انہوں نے تاریخ مذاہب پر ایک اور مقالہ لکھا اور الٰہیات اور مشرقی علوم پر دو ماہ کے مطالعاتی دورہ پر سویڈن چلی گئیں۔ 1952ء میں انہیں ترکی کے دورہ کا موقع ملا۔ وہ قونیہ جانے کی مشتاق تھیں جہاں ان کے مرشد رومی دفن ہیں۔ 1953ء میں وہ ایک بار پھر ترکی گئیں اور انقرہ یونیورسٹی میں اسلامی فنون اور اسلام پر لیکچر دیئے۔ یونیورسٹی نے اس غیر مسلم کو تاریخ مذاہب کی چیئر پیش کی' جس پر یہ پانچ برس تک فائز رہیں۔ اس دوران انہوں نے ترکی میں تصنیف و تالیف کی۔ ان میں علامہ اقبال کے "جاوید نامہ" کا ترکی ترجمہ بھی شامل ہے۔

انہوں نے سینکڑوں مقالے اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے موضوع اتنے متنوع ہیں کہ ان میں اسرار الاعداد' عربی نام اور فارسی صوفی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ بھی شامل ہیں۔ جنہیں یہ پہلی مسلم خاتون قرار دیتی ہیں۔ جس ؒ نے عورت کے حق کے لئے آواز اٹھائی۔ پاکستان میں ان کی پہلی کتاب جسے شہرت ملی (Gabriels Wing) تھی۔ ہالینڈ میں چھپنے والی یہ کتاب پاکستان میں مناسب طور پر تقسیم نہ ہو پائی تھی۔ حیرت ہے کہ پاکستانی پبلشروں نے ان کی "بر صغیر ہند میں اسلام" جیسی عظیم کتب کے حقوق اشاعت حاصل نہیں کئے۔ یہ کتاب پندرہ برس قبل چھپی تھی۔ ایسی ہی کتب "Mystery of Numbers" اور "Decipliering the Science of God" شامل ہیں۔ جیسا کہ ان کو ملنے والے ایوارڈ سے پتہ چلتا ہے' انہوں نے سینکڑوں اسلامی کلاسیک کے تراجم بھی کئے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی اور رومی پر ان کی کتب پاکستان میں کچھ دکانوں پر دستیاب ہیں۔

جرمن زبان میں ان کے کام کو بین الاقوامی سطح تک رسائی پانے میں وقت لگے گا۔ اس میں فارسی شاعری میں متخیلہ پر تحقیقی کام بھی شامل ہے۔ لیکن انگریزی تصانیف بھی یورپ اور امریکہ کے غیر معروف اشاعتی اداروں میں پڑی ہیں اور ان کے پاکستان پہنچنے کا کوئی

امکان نظر نہیں آتا۔ اشاعتی معاملات میں یہ خاصی لاپرواہ ہیں۔ ان کے پبلشر بھی ان سے کم ہی رابطہ کرتے ہیں۔ "دولت نہ کمانے کی مجھے کچھ زیادہ پرواہ نہیں میرے پاس گزارے کے لئے موجود ہے" لینیئر اس میں ان کا گھر اسلام پر نادر مخطوطات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ انہیں بتدریج بون یونیورسٹی جیسے اداروں کو عطیہ میں دے رہی ہے۔ جہاں ان کی بہتر دیکھ بھال اور زیادہ افادیت ہو سکتی ہے۔

تہذیبی تصادم کے فکری رجحانات رکھنے والے ہم جیسوں کی سوچ کے برعکس وہ مطالعہ مشرقی کی سیاسیات میں ملوث نہیں ہیں۔ مغرب کے مطالعہ مشرقی پر ایڈورڈ سعید کی تنقید کو بجا قرار دیتے ہوئے وہ زور دیتی ہیں کہ جرمن اور روسی روایات بقیہ مغرب سے مختلف ہیں۔ اسلام میں ان کی دلچسپی کی بنیادیں اہلِ مشرق کی دانش اور روحانیت کے احترام سے پھوٹی ہے۔ وہ ایسی عالم ہیں جو میزیناں کی مداح ہیں اور اسلام کے فلسفیانہ پہلوؤں کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال واحد مسلم نابغہ تھے جنھوں نے دانشورانہ سطح پر گوئٹے کے "مغربی' مشرقی دیوان" کا جواب دیا۔ آپ مغرب کی واحد عالم ہیں جس نے اسلام کی حقیقی روح کا ادراک کیا۔ ان کی جرمن اور انگریزی نظموں کے چھپنے والے دو مجموعے ثابت کرتے ہیں کہ ان کی دلچسپی فقط بے روح تحقیق تک محدود نہیں۔ محض خامیاں تلاش کرنے کے لئے کسی مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے شمل سودمند نہیں۔

خالد احمد
زمان پارک' لاہور

تعارف

1289ء میں ترکِ خدا طوطی ہند امیر خسرو نے دلی میں اپنی تاریخی نظم "قران السعدین" میں ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے اسے اسلامی زندگی اور تمدن کا وطن قرار دیا۔

خوشا ہندوستان رووثق دین — شریعت راکمال عز و تمکین
نہ علم با عمل دہلی بخارا — زشاہان کشتہ اسلام آشکارا
از غزنین تالب دریا درین باب — ہمہ اسلام بیفی بر یکی آب
مسلمانان نعمانی روش خاص — زول ہر چار آئین را باخلاص
نہ کیں بہ شافعی نی مہر بازید — جماعت راو سنت راس جان صید

زہی خاک مسلماناں خیز دین جوی
کہ ماہی تیر سی خیرو از جوی

چھ سو سال بعد 1879ء میں دلی ہی کے ایک اور شاعر نے مسلمانوں کی حالتِ زار کا ذکر کیا تھا۔ حالی نے اپنی مسدس میں برصغیر کے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ وہ اسلام سے قطع تعلق کر بیٹھے ہیں اور اپنے ماضی کے سنہرے ایام کو بھول گئے ہیں۔

برصغیر ہندوپاک میں اسلام کی تاریخ اور حالات کے جائزے کی کوشش کرنے والے مورخ کو متواتر تضادات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف وہ جذبے کے صادق صوفیاء کی تمدنی سرگرمیوں' ان کے سلسلوں اور بھائی چارے کی تعریف کرتا ہے۔ جو دورِ وسطیٰ کی روحانی زندگی کے محور ہیں اور جن کے باعث بہت سے ہندو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ دوسری طرف اسے وراثت کی مسلسل جنگوں میں شورش' شرانگیزی اور سیاسی تاریخ کے

تاریک ترین پہلوؤں کے ظہور پر افسوس ہوتا ہے۔ یہ تاریخ ان بادشاہوں کی ہے جو اکثر و بیشتر اپنے وفاداروں کو حکم دیا کرتے تھے کہ ان کے دشمنوں (یا رشتہ داروں) کو سر کے بوجھ سے نجات دلوادی جائے اور ان بادشاہوں کی بھی جنہوں نے ہندوستان کو دنیائے اسلام کی عظیم ترین مقدس عمارتوں سے سجایا۔ یہاں عوام الناس کے اسلام، جس میں ان کے ہندو ہمسایوں کے رسوم و رواج شامل ہو چکے تھے، کے ساتھ ساتھ ان مصلحین کی اصلاحی تحریکیں بھی نظر آتی ہیں جو اسلامی وحدت کے لیے لڑے۔ بعض صوفیاء ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اسلامی وحدت کی تشریح ادونیا کی اصطلاحات میں کی۔ بلند آہنگ اور پر تخیل فارسی شاعری میں پیچیدہ صوفیانہ سلسلوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہ سلسلہ زیادہ تر شہروں تک محدود تھا۔ لیکن محبوبِ حقیقی یا پیغمبر اسلام محمدؐ سے وصال کی خواہش مند روح کا بیان مقامی زبانوں کی عوامی شاعری میں ملتا ہے۔ جس نے سارے ملک میں دیہی آبادی کے دل جیت لئے۔ بعد میں ملک پر مسلط غیر مسلم حکومت کے خلاف جنگ اور ایک جدید مغربی طرز کی حامل ذہنیت کی نشوونما انیسویں صدی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

ہندوستانی اسلام کی رنگا رنگی اور کثیر پہلو ماہیت سے جنم لینے والی کشاکش کا بہترین اظہار شاہ جہان اور ممتاز محل کے دو بیٹوں صوفی منش دارا شکوہ اور عمل پسند اورنگ زیب میں ہوتا ہے۔ یہی دو رجحانات بالآخر 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کا سبب بنے۔

اس موضوع پر دستیاب مواد بھی اتنا ہی غیر واضح اور مبہم ہے۔ اس صورتِ حال کو تحریک پاکستان کے نظریہ سازوں (آئی۔ ایچ۔ قریشی)، تقسیم مخالف ہندوستانی مسلمانوں کے ترجمانوں (محمد مجیب)، نقاد عیسائی مبلغین (ایم۔ ٹائیس) اور ہندو مورخین نے قلمبند کیا ہے۔ ہندوستانی اسلام کی لمبی تاریخ میں زیادہ تر ممتاز شخصیات کی تعریف کی گئی یا ان پر الزامات لگائے گئے جنہیں پھر مختلف تاریخی، مذہبی اور سیاسی مکاتبِ فکر نے اپنا لیا۔

حقائق کے اتنے پیچیدہ جال کو محدود گنجائش کی کتاب میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اپنے پیش روؤں کی طرح اس مصنفہ نے بھی کچھ پہلوؤں پر دوسروں کی نسبت زیادہ توجہ دی ہے اور انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں معاشرتی تجزیے کی بجائے ان بہت سی مذہبی شخصیات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہندوستانی اسلام کے مختلف رجحانات کی تجسیم ہیں۔ کتاب کے مکمل اور مکتفی ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ اگر برصغیر میں مختلف اسلامی رجحانات اور خیالات قریب قریب درست بیان ہو گئے ہیں تو یہی کافی ہے۔

پہلا باب

بر صغیر میں اسلام کا ظہور اور استحکام

بر صغیر کی سرحدوں میں داخل ہونے والی پہلی مہم کا ردِ عمل بلادری نے بڑی صحت سے بیان کیا ہے۔ جب عرب ہر اول دستے واپس لوٹے تو خلیفہ عثمانؓ نے اس ملک کا حال پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا:

> "پانی کمیاب، پھل ادنیٰ، ڈاکو بکثرت، فوج مختصر ہو تو لٹ جائے، کثیر ہو تو بھوک اور پیاس سے نیست و نابود ہونے کا ڈر" (بلادری "کتاب فتوح البلدان")

اس پر خلیفہ حیران رہ گئے کہ آیا ان کے سپاہی اطلاعات فراہم کر رہے ہیں یا شعر کہہ رہے ہیں۔

مکران، جہاں حضرت عثمانؓ کے سپاہی پہنچے تھے، یقیناً مستقبل کی مسلم ہندوستانی بادشاہت کا نمائندہ پُرکشش علاقہ نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی ہندوستان داخلے کی کوئی بڑی کوشش ستر سال سے پہلے نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس دوران کئی چھوٹی چھوٹی دراندازیاں کی گئیں۔ ہندوستان پہنچنا بہر حال ضروری تھا۔ کیونکہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا:

> "خدا نے میرے صحابہ کے دو گروہوں کو جہنم کی آگ سے بچا لیا، اولاً وہ جو ہندوستان پر حملہ کریں گے اور دوسرے جو (آخری زمانہ میں) عیسیٰؑ ابنِ مریم کے ساتھ ہوں گے" (سنن)

تاہم ہندوستانی روایات کے مطابق عربوں سے ان کے تعلقات ظہورِ اسلام سے بہت پہلے کے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے بادشاہ شکروتی کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے کہ راجہ بھوج کی طرح وہ بھی معجزہ شق القمر دیکھ کر مسلمان ہوا تھا۔ در حقیقت فوجوں کے شمالی علاقوں میں داخلے سے بہت پہلے ہندوستان کے جنوبی اور مغربی ساحلوں پر عرب مسلمانوں کی بستیاں موجود تھیں۔ کچھ عرب خاندان الحجاج کے دور میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان آ بسے تھے' جس کے ڈیڑھ سو سال بعد کچھ اور خاندان یہاں پہنچے۔ 875ء میں انہیں ایک تامل تانبے کی پلیٹ دی گئی تھی جس پر انہیں پناہ دیئے جانے کا فرمان درج تھا۔ ان کی اولاد نے آگے چل کر جنوبی ہندوستان میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بدھوں اور ہندوؤں کو اہلِ الکتاب کے برابر خیال کرتا تھا۔ اسی لیے اس نے ان پر جزیہ لگا دیا جس کا اطلاق برہمنوں پر نہیں ہوتا تھا۔ اس روایت کی پیروی بعد کے ہندو مسلم حکمرانوں نے بھی کی۔ ''سونے کے شہر'' یعنی ملتان میں محمد بن قاسم نے مشہور سوریا مندر مسمار نہ کیا اور دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی ایک مسجد بنائی۔ اس کے جانشینوں نے قاسم کے چلے جانے کے بعد بھی اس طرز عمل کو برقرار رکھا۔ محمد بن قاسم کو عراق میں سازش سے قتل کر دیا گیا۔ آج کے بھنبھور' جسے قدیم دیبل خیال کیا جاتا ہے' کی کھدائی سے نکلنے والی مسجدوں میں سے ایک مشرقِ وسطیٰ کی سی ہے۔ دیبل وہ جگہ تھی جہاں مسلمانوں نے سب سے پہلے قدم رکھا۔ اس مسجد میں ایک کندہ کیا ہوا کتبہ نکلا ہے جسے سادہ کوفی میں تحریر کیا گیا ہے اور بغرضِ آرائش حرفوں کے سرے دوشاخہ کئے گئے ہیں۔ اس وقت منصورہ سندھ کا بڑا شہر تھا۔ یہ غالباً 740ء یا 750ء میں تعمیر کیا گیا اور جزیرے کی شکل میں تھا۔ دریائے مہران یعنی سندھ کی ایک شاخ اس کے دونوں طرف بہتی تھی۔ بقول ابن خورد رازلی۔

یہ ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا شہر تھا۔ اسے یہ لوگ عراقیوں کی طرح نظر آنے والے قریش لگے۔ جن کے حکمرانوں نے اپنے ملبوسات میں ہندی انداز اختیار کر لیا تھا۔

ابنِ حاقل اور ادریس نے بھی اس گنجان آباد عظیم شہر منصورہ کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے۔ بقول ان کے زرخیز زمینوں سے گھرا ہوا یہ شہر تجارت کا مرکز تھا جس کی

منڈیاں سستے گوشت اور پھلوں سے بھری پڑی تھیں۔ اس شہر کے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ یہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا تاہم سوختنی سلیں اور مصالحہ بھی بکثرت استعمال ہوا تھا۔ ایک اور شہر محفوظ نامی اس کے مقابل تعمیر کیا گیا تھا۔ مسعودی نے منصورہ اور ملتان ہر دو کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں عربی اور سندھی بولی جاتی تھی۔ ان اولین عرب شہروں کا تفصیلی حال درج کرنا مشکل ہے کیونکہ صدیوں پر محیط اس عرصے میں دریائے سندھ نے اپنے زیریں علاقے میں کئی بار راستہ تبدیل کیا ہے جس کے باعث پرانے رجحانات اور پیمائش کسی طور معاونت نہیں کرتیں۔ لیکن اولین مسلم سندھ کے مادی آثار غائب ہونے پر بھی اس کا ثقافتی ورثہ اب تک موجود ہے۔ ہندوستان قریب مشرقی دنیا میں اپنے سائنسی کارناموں کے باعث لمبے عرصے سے مشہور رہا ہے۔ سندھ وہ جگہ تھی جس کی وساطت سے ہندوستانی ریاضی اور فلکیات کا ابلاغ مرکزی اسلامی علاقوں کو ہوتا۔

چونکہ اس نو مفتوح ملک کو مذہبی اساتذہ کی ضرورت تھی اس لیے کئی علماء نے خود کو حدیث کی تدریس و تدوین کے لیے وقف کر دیا۔ علماء کی ایک لمبی فہرست ہے جن کے نسب ناموں میں منصوری، دیبلی اور سندھی شامل ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ میں رہنے والے اور یہاں سے نکلنے والے علماء کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ اس علاقے کے اولین سیاحوں میں سے ایک بزرگ ابنِ شہریار نے اپنی "عجائب الہند" میں لکھا کہ ماہر خوان ابنِ رائق شاہِ رے نے 883ء میں شاہِ منصورہ سے کہا کہ وہ اسلامی علوم کے ماہر کسی کو اس کی خدمت میں بھیجے۔ مطلوبہ شخص رے کو روانہ ہو گیا۔ اس نے فقہ کے کچھ مسائل کو منظوم کرنے کے بعد قرآن کے ترجمے کا آغاز کیا جس کی ابتداء سورۃ یٰسین سے کی گئی۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت سندھ میں تصوف آمیز مذہب اپنی مقبولیت کے کس درجے پر تھا۔ اسرارِ تصوف میں بایزید بسطامی کے مبینہ استاد کی اصلی وطنیت مشکوک ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کا تعلق بسطام کے قریب سندھ نام کے کسی چھوٹے سے گاؤں سے ہو نہ کہ وادی سندھ سے۔ یاد رہنا چاہئے کہ عظیم صوفی الحلاج جسے بالآخر شہید عشقِ الٰہی بننا تھا (بغداد میں 922ء) تقریباً 905ء میں بغرضِ تبلیغ سندھ آئے۔ ان کے دشمنوں نے اس سفر کو ایسے جادوئی شعبدے سیکھنے کی خواہش سے منسوب کیا جن کے لیے ہندوستان مشہور تھا۔ تاہم حلاج کا یہ سفر بظاہر کچھ زیادہ بار آور ثابت نہ ہوا۔ لیکن ان کا نام، یا یوں کہیے کہ کنیتی نام،

منصور آج ہر شخص کو پتہ ہے۔ ملک کے دور دراز گوشوں تک میں اس نام کے جاننے والے موجود ہیں۔ پنجابی اور اسلامی صوفی شعراء نے حلاج کا نام ایسے لوگوں کے لئے استعاراً استعمال کیا ہے جن کا پیمانہ وار فتگی چھلک جاتا ہے اور وہ اس محیط کل کے ساتھ اپنے وصال کو چھپا نہیں پاتے۔ اسی باعث انہیں ظاہری قواعد و ضوابط کے پابند ملاؤں کے ہاتھوں دار و رسن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

منصور حلاج کو پھانسی دیئے جانے کی وجہ الہیاتی اختلاف سے زیادہ سیاسی تھی۔ شبہ تھا کہ اس نے اپنے سفر ہند میں قرامطیوں سے سازباز کی ہے جو بحرین کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے اور ملتان اور سندھ کے بالائی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ سندھ کا علاقہ 902ء میں یعقوب سفارید کے زیر حکومت تھا۔ قرامطی' اسماعیلیوں نے اپنے زیر تسلط علاقہ کو جنوب میں منصورہ تک وسعت دی جہاں محمود غزنوی کا سامنا ایک اسماعیلی شہزادے سے ہوا تھا۔ ایک خیال اور بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے چودھویں صدی کے وسط تک سندھ میں قائم رہنے والی سومرو سلطنت دراصل قرامطیوں کی بادشاہت ہو۔ کیونکہ ان کے رسوم و رواج بھی عام مسلمانوں کے سے نہ تھے۔ لیکن ابھی اس سوال کا حتمی جواب نہیں دیا جا سکا۔ دسویں صدی کے آخر تک ملتان سے فاطمی خلیفہ کے نام کا سکہ جاری ہوتا تھا یعنی اسے ہی اصل حکمران مانا جاتا تھا۔ قرامطیوں نے ایک اور حرکت کی جوان کی بعد کی حکمت عملی سے متضاد تھی۔ انہوں نے ملتان میں وہ سوریا مندر گرادیا جسے محمد بن قاسم نے نہیں چھیڑا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے برصغیر کے ان دو بڑے مذاہب کے درمیان مفاہمت کی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد بھی بند کروادی کہ بقول البیرونی انہیں ہر اس چیز سے نفرت تھی جس کا اموی خلفاء سے تھوڑا سا تعلق بھی تھا۔

سنی اسلام کا علمبردار محمود غزنوی 1005ء میں ملتان پہنچا۔ اس کا درباری شاعر انصری لکھتا ہے۔

> "ملتان کی راہ میں اس نے دو سو قلعے فتح کئے جن میں سے ہر ایک خیبر سے سوگنا مضبوط تھا" (دیوان استادی انصری بلخی' شعر نمبر 1342)

اپنے پہلے حملے میں محمود غزنوی نے محض خراج وصول کرنے پر اکتفا کیا لیکن چھ سال بعد وہ دوبارہ لوٹا اور ملتان پر ٹوٹ پڑا اور بہت سے مرتدوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

لیکن اس ساری دارو گیر کے باوجود اگلی دو صدیوں تک قرامطیوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔بعد ازاں وہ پھر سے کامیاب مبلغین کے طور پر رونما ہونے کو روپوش ہو گئے۔

"عباسی خلفاء کے مددگار" محمود غزنوی کے وقت سے شمال مغربی ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں میں اسلام کا اثرو نفوذ شروع ہوا۔برصغیر پر اس نے 1000ء میں حملے شروع کئے۔ 1030ء میں اپنی وفات تک وہ یہاں سترہ حملے کر چکا تھا۔اس کی سب سے بڑی کامیابی کاٹھیاوار سندھ میں سومنات کے مندر کی فتح تھی۔ جسے 1026ء میں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اپنے اس عمل سے محمود مسلمانوں کا ہیرو بن گیا لیکن ہندو روایت میں اسے شدید ترین دشمن کے حوالہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

محمود کی ہندوستانی مہمات کے آثار میں سے ایک البیرونی کی "کتاب الہند" ہے۔ البیرونی 973ء میں خوارزم میں پیدا ہوا تھا۔یہ 1017ء میں محمود کے دربار سے وابستہ ہوا۔ اپنے قیام ہندوستان کے دوران اس نے یونانی فلسفہ' ریاضی' سائنس اور ذہن رسا کو استعمال کرتے ہوئے ہندوؤں کے طرزِ حیات و فکر کا مطالعہ کیا۔ لیکن مختلف ہندو مکاتب فکر کے فلسفیانہ مضمرات سے کماحقہ واقفیت اور معروضی ذہنیت کے باوجود البیرونی "ہندو کردار کی ساختی کجی' "کا ذکر کرنے کے لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ مسلمان ہونے والے ہندو اپنے رسوم و رواج سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔البیرونی ہندوؤں کی سب سے بڑی برائی ذات پات کو قرار دیتا ہے۔اسی وجہ سے مسلمانوں کے ہندوؤں سے اچھے مراسم قائم نہیں ہو سکتے تھے۔

> "ہم مسلمانوں کا رویہ اس کے بالکل برعکس سب انسانوں کو برابر سمجھنے کا ہے 'افضلیت فقط تقویٰ کو ہے۔یہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان عدم مفاہمت اور مغائرت کی سب سے بڑی وجہ ہے"

البیرونی کو شکایت ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ملیچھ کہتے ہیں۔وہ بیسویں صدی کی فرقہ وارانہ کشیدگی کی پیش گوئی کرتا معلوم ہوتا ہے' جس کے نمائندے وسطی عہد کے اس عالم کے حوالے بکثرت دیتے ہیں۔ پھیلتی ہوئی غزنوی سلطنت کا دارالحکومت کا لاہور تھا۔ آخری ہندو بغاوت کے کچلے جانے (1092) کے بعد لاہور اسلامی تعلیمات کا مرکز بن گیا۔ غزنویوں کے لاہور فتح کرنے سے پہلے شیخ محمد اسماعیل بخاری لاہوری' (متوفی 1056)

یہاں آئے۔ انہوں نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی اور شمال مغربی ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت کی۔ غزنوی' شافعی فقہ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے بعد آنے والے غوری حنفی المسلک تھے اور انہی کا مذہب 'سوائے جنوبی ہند' کے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کا مذہب رہا۔

گیارہویں صدی کے ایران میں بنیادی صوفی افکار اور اخلاقیات پر تصنیف و تالیف کا کام شروع ہوا۔ ان میں سے ایک علی ابن عثمان الجلبی الہجویری غزنی کے علاقے سے لاہور آئے۔ یہاں تبلیغ کی اور یہیں 1071ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی کشف المحجوب اولین دور کے صوفی افکار کا اہم مآخذ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فارسی زبان میں نظری تصوف پر یہ اولین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ہجویری نے اپنے پیشتر و زہداء کی پیروی کرتے ہوئے تجرد کو ترجیح دی اور جلد ہی داتا گنج بخش کے نام سے بطور ولی مشہور ہو گئے۔ انہیں لاہور کا پہلا سرپرست ولی' خیال کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ انہیں ہندوستانی اولیاء پر تقدیم حاصل ہے اور ان کی روحانی اجازت کے بغیر کوئی نیا ولی ملک میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ ان کے مزار کی کئی بار تعمیر اور مرمت ہوئی۔ شاہ ایران نے ایک طلائی دروازہ مزار کے لیے پیش کیا تھا۔ پاکستانی یہاں بکثرت حاضری دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسی درگاہ پر مراقبہ کی حالت میں اقبال کے ذہن میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا تصور آیا۔ اقبال کے کئی اشعار سنگِ مرمر میں کندہ درگاہ میں آویزاں ہیں۔

لگتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک دوسرے سے کٹی ہوئی بستیاں گنگا کی وادی میں بنارس' شمالی اودھ' حتیٰ کہ' بہار میں بھی موجود تھیں۔ اگرچہ کتبوں سے شہادت نہیں ملتی لیکن مقامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ غوری سے بھی پہلے یہاں مسلمانوں کی درگاہیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک لاہور میں بی بی پاک دامناں کے نام سے موجود ہے۔ اسے سات نیک بی بیوں سے منسوب کیا جاتا ہے جو ساتویں صدی میں ہندوستان پہنچیں۔

لاہور' جہاں گیارہویں اور بارہویں صدی میں ابو الفراج رونی اور مسعود ابنِ سعد جیسے فارسی نگار موجود تھے' 1181ء میں افغانستان سے آنے والے معزیوں کے ہاتھوں مغلوب ہوا۔ ناقابلِ یقین بیان دیا ہے کہ "ہر سو مسلمانوں میں سے نوے عالم اور ہر دس میں سے نو شارحین کر آن تھے۔ معیز الدین غزنوی جنوب میں ملتان اور اچ تک چلا گیا اور انہیں

1175ء میں قرامطیوں سے چھین لیا۔ جنہوں نے 'سوائے محمود کے زمانے میں آنے والے مختصر وقفے کے' تین صدیوں تک حکومت کی۔ بالآخر انہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

جنوب مغرب کی طرف فتوحات کا دروازہ غوری اور اس کے فوجی غلاموں کے ہاتھوں کھلنا تھا۔ معیز الدین نے 1192ء میں دلی اور اجمیر فتح کر لی اور قنوج اور گوالیار کو مسلم قبضہ میں لے آیا۔ وہ 1206ء میں دریائے سندھ کے کنارے قتل ہوا۔ 1202ء میں بختیار محمد خلجی بہار کو روند کر بنگال میں اپنی حکومت مستحکم کر چکا تھا۔ کے۔ اے۔ نظامی اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "مسلمانوں کی مزاحمت مراعات یافتہ طبقے اور راجپوت اشرافیہ نے کی۔ اگرچہ عام ہندوستانی ترک حکومت کی مزاحمت کرتے تو غوری ہندوستان کے انچ پر بھی قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے" (مذہب اور سیاست صفحہ 80)

ہندوستان کی بیشتر آبادی کا فوجی تربیت سے بیگانہ ہونے اور ہندوستانی فوجوں کی سست نقل و حمل کے باعث اعلیٰ تربیت یافتہ اور تیز ترکی دستوں کی کامیابی آسان ہو گئی۔ چونکہ شریعت نہ تو دیہاتی علاقوں کی طرز زندگی پر اثرانداز ہوئی اور نہ ہی ذات پات کے نظام پر 'اس لیے عوام الناس' جن کی اکثریت دیہات میں رہتی تھی 'کو حکومتوں کے بدلنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ اراضی کا بندوبست کم و بیش پہلے کا سا رہا اور ہندو تاجر اور مہاجن بھی نئے حکمرانوں سے اسی طرح غیر متاثر رہے جیسے ظہورِ اسلام کے بعد عرب ممالک کے یہودیوں پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ مقامی مسائل پر علماء کا رویہ فقہ کی کتابوں سے متعین ہوتا تھا جو بالکل مختلف پسِ منظر یعنی کہ عرب دنیا میں لکھی گئیں تھیں۔ تیرہویں صدی کے کسی ہندوستانی مسلمان عالم نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ملکی حالات کے مطابق ہندوؤں سے ان کے تعلقات کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ فخری مدبر جیسا مورخ بھی عیسائیوں' یہودیوں' صابیوں اور زرتشیوں کی بات کرتا ہے۔ لیکن ہندوستانی آبادی کی ہندو اکثریت کا ذکر تک نہیں کرتا۔ پیٹر ہارڈی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان مورخین کو بذاتِ خود ہندوؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ انہیں صرف متوقع مسلمان' جزیہ گزار یا انبوہ کے طور پر دیکھتے تھے۔ ہندو مصنف مسلمانوں کے ہندوؤں کے خلاف امتیازی سلوک پر تلخ ترش لہجے میں بیان کرنے کے

عادی ہو چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جزیہ صرف ہندوؤں پر لگایا گیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو شرقِ وسطیٰ کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔

زیادہ بڑی تبدیلیاں ان شہروں میں واقع ہوئیں جن کی مسلمانوں کے ہاتھوں بنیاد پڑی یا توسیع ہوئی۔ اسی جگہ ہندو مزدوروں اور معماروں کو ذات پات کے نظام سے بلند اسلام سے شناسائی کا موقع ملا۔ اسلام کی طرف متوجہ ہونے کی ایک بڑی وجہ سماجی ایکتا کا تصور بھی تھا کیونکہ ہندو روایات کے برعکس اسلامی شریعت نشوونما اور ترقی کے زیادہ مواقع فراہم کرتی تھی۔ اسی لئے لاہور اور شرقی بنگال میں لکھنوتی اور سنار گاؤں کے درمیان اسلام کے ایسے ننھے منے جزائر بن گئے جہاں مزدور اور معمار یا تعمیم کی جائے تو' نیچ ذات اور بے ذات لوگ نئی صورت حال سے استفادہ کر سکتے تھے۔ اسی لئے ہمیں تاریخ میں پوری پوری برادریوں' مثلاً جولاہوں' کے مسلمان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ شروع کے اسلامی اثرات کو شہری مرکزوں میں آنے والی معاشرتی تبدیلی خیال کیا جاسکتا ہے۔ کہیں بعد میں جا کر دیہی علاقوں میں نئے نظام کے اثرات محسوس کئے جانے لگے۔ ایم مجیب درست طور پر لکھتے ہیں "مسلم تہذیب بنیادی طور پر شہری تھی" چنانچہ ہندوستانی زندگی میں شہری عنصر کا اضافہ مسلمانوں کی دین ہے۔

خاندانِ غلاماں کے پہلے بادشاہ قطب الدین ایبک نے 1206ء میں اپنی حکومت لاہور میں قائم کی پھر وہ دلی کی طرف بڑھا۔ ستائیس مندروں کے ملبے سے دلی لال کوٹ میں مسجد قوت الاسلام بنائی گئی جس کا منارہ قطب مینار مسلمانوں کی پرشکوہ اولین موجودگی کی لازوال شہادت ہے۔ ایک صدی بعد امیر خسرو مسجدوں میں تبدیل کئے جانے کے لیے مندروں کی تباہی کو شاعرانہ استعارات میں بیان کرتا ہے۔

"جہاں بھی کوئی مندر بت پرستی کا نشان تھا' کیفتی کے پر قوت وار سے بدعقیدگی اس کے قلب سے اکھاڑ دی گئی اور یوں مندر بجائے خود اظہار تشکر میں سر بسجدہ ہو گیا" (خزائن الفتوح صفحہ 14)

ایبک نے اجمیر کے معیز الدین غوری کی تعمیر کردہ عظیم الشان اور پُر وقار سات محرابی مسجد "آدھے دن کا جھونپڑا" کی توسیع کروائی۔ یہ مسجد مسلم ہندوستان کی ان چند عمارات میں شامل ہے جن میں لمبی عبارت کی کندہ کاری کے لیے لڑی دار خط کوفی استعمال کیا

گیا ہے۔

قطب الدین نے اپنی ابتدائی تربیت بطور غلام کے نیشاپور کے ایک قاضی سے حاصل کی۔ وہ قرآن کا اچھا قاری بھی تھا۔ اس کا سابق غلام اور داماد التتمش شرعی احکامات کا سختی سے پابند اور عبادت گزار آدمی تھا۔ وہ 1210ء میں ایبک کا جانشین بنا۔ اپنی مہمات کے دوران بھی وہ نماز کی ادائیگی کا خصوصی اہتمام کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ نوعمری ہی میں اسے شہاب الدین سہروردی اور احد الدین کرمانی جیسے اولیاء کا فیضانِ صحبت ملا جن میں سے ایک نے اس کے بادشاہ بننے کی پیش گوئی کی تھی۔ اگرچہ ہمیں ایک صوفی کی بیان کردہ کہانی کو ماننے میں تامل ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ التتمش کو اپنے عہد میں مضبوط ہوتی ہوئی صوفیانہ تحریکوں سے کافی دلچسپی تھی۔ انہوں نے چشتی صوفی قطب الدین بختیار کاکی اور سہروردی مبلغ شاہ جلال الدین تبریزی کا پرتپاک استقبال کیا۔ موخر الذکر تبلیغ کے لیے بنگال جاتے ہوئے دلی میں رکے تھے۔

التتمش کی مہمات میں سے ایک اُچ اور ملتان کے خلاف تھی۔ یہ جگہیں ابھی تک غوریوں کے صوبیدار قباچہ کے زیرِ حکومت تھیں۔ بخارا اور یہ دونوں شہر علم کا مرکز تھے۔ بخارا میں مسلمانوں کی فتح سندھ کے انمول وقائع چچ نامہ کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کا تقابل کچھ بعد لکھی جانے والی دلی سلطنت کے مورخین کی تحریروں سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نیا دارالحکومت قائم کرنے سے پہلے ہندوؤں کے ساتھ اس کا رویہ خاصا نرم تھا۔ منگول یلغار کے بعد ایران سے نکلنے والے علماء کے لیے قباچہ کا دربار پناہ گاہ ثابت ہوا۔ عوفی نے اپنی کچھ تصانیف یہیں مکمل کیں لیکن اسے بھی مبلغ اور مورخ منہاج السراج کی طرح التتمش کی فتح کے بعد دہلی لے جایا گیا۔ تاہم یہ واقعات خوارزم شاہ کے وادی سندھ سے نکل جانے کے بعد پیش آئے۔ التتمش نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے 1221ء میں خوارزم شاہ کے تعاقب میں ہندوستان داخل ہونے والے چنگیز خاں سے تعرض نہ کیا۔ خوارزم شاہ نے بھی زیادہ واسطہ قباچہ ہی سے رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملتان کے سہروردی ولی بہاؤالدین زکریا نے التتمش کو اپنی قلم رو میں مدعو کیا تھا کیونکہ کسی وجہ سے اسے قباچہ سے شکایت تھی۔ دلی کی فوجوں سے بچ کر بھاگتا ہوا یہ بدقسمت گورنر دریائے سندھ میں ڈوب مرا۔

فیروزیہ مدرسہ کے باعث اُچ کی شہرت کو دیکھتے ہوئے التتمش نے بھی دلی اور

بدایوں میں مدرسوں کے قیام کا اہتمام کیا۔ جنہیں اس نے اپنے مرحوم آقا معیز الدین غوری کے نام پر معیزیہ کا نام دیا۔ 1229ء میں اس نے عباسی خلیفہ سے سند تقرر حاصل کی۔ دلی جسے بڑے فخر سے حضرتِ دلی کیا جاتا تھا نیا دارالحکومت تھا۔ جلد ہی مرکزی اسلامی دنیا سے علماء یہاں کھنچے چلے آنے لگے۔ اعلیٰ سطح پر فارسی' انتظامیہ کی زبان ٹھہری اور' جیسا کہ اس صدی کے آخر پر امیر خسرو بیان کرتے ہیں "ذریعہ اتحاد و اتفاق بن گئی" عرب' چین اور دوسرے مقامات سے "نامور شخصیات شمع کے گرد پروانوں کی صورت" (اصمعی) دلی میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر علماء تھے۔ لوگ ان میں سے مذہبی زندگی میں دلچسپی لینے والوں اور دنیا سے محترز رہنے والوں کو علمائے آخری یا علمائے ربانی کہتے تھے۔ جبکہ حکومت سے تعاون کرنے اور جاہ و حشمت اور حکمرانوں کے قرب کے طالبوں کو علمائے دنیا یا علمائے سُو کہتے تھے۔ اسی واسطے جب اپنے بڑے بیٹے کی وفات (1231ء) کے بعد التتمش نے اپنی باصلاحیت بیٹی رضیہ کو جانشیں مقرر کیا تو ان سے کسی نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ شہزادہ مذکورہ بالا کا مقبرہ المعروف بہ سلطان گڑھی جنوبی دلی کی قدیم ترین مسلمان یادگاروں میں سے ایک ہے۔ کوئی چار سو سال گزرنے کے بعد دلی کے محدث عبدالحق نے رضیہ کے تقرر کو قانونی غلطی اور خلافِ شرع قرار دیا۔

لیکن' جیسا کہ ایس۔ ایم۔ اکرام لکھتے ہیں' علماء نے اپنی روحانی حیثیت سے قطع نظر ہندوستان میں مذہبی جذبے کو ترقی کی راہ کا روڑا بنانے کی بجائے یہاں مسلمان معاشرے کی تشکیل میں استعمال کیا۔ ہر چند کہ وہ کچھ اتنا کارگر ثابت نہ ہوا' وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمان دیگ میں نمک کی مثال ہیں اور کسی طرح بھی شرعی قانونی تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ مقدم ترین معاملہ مسلم حکومت کا استحکام تھا۔ خیال رہے کہ رضیہ سلطانہ جو اپنے عیاش بھائی کی مختصر بادشاہت ختم کر کے تخت نشین ہوئی تھی اور جسے صاحب طبقاتِ ناصری ایک دانشمند حکمران کہتا ہے صرف چار سال (1236ء۔1240ء) حکومت کر سکی۔ پردے کے الجھن انگیز انتظامات ایک طرف رکھ کر وہ اپنے ہاتھی پر سوار عوام کے سامنے نمودار ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک حبشی امیر یاقوت کی طرفداری پر ترک اشرافیہ اس سے نالاں ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ سلطنتِ دلی کی پہلی صدی میں حکمران کے انتخاب میں امراء امیدوار کے متقی مسلمان ہونے کی بجائے اس کے ترک ہونے پر زیادہ زور دیتے تھے۔

سلاطین دہلی کے پہلے دور میں ترک فوجی غلاموں اور تاجروں نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں کہ بہت سی ہندوستانی زبانوں میں لفظ ترک مسلم کے مترادف بن گیا۔ فارسی شاعری میں عام استعمال ہونے والی صنعت تضاد کی دو اصطلاحیں ترک اور ہندو پہلے پہل کے مسلم ہند میں بڑے حقیقی معنی رکھتی تھیں۔

رضیہ کے مختصر دورِ حکومت کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ 1237ء میں ملک کے مختلف حصوں کے قرامطی، نور ترک کی سربراہی میں دلی کی جامع مسجد پر حملہ آور ہوئے۔ کشت و خون کے بعد بالآخر ملحدوں کو شکست ہوئی۔ نور ترک کی اصلیت ابھی تک متنازعہ ہے۔ یہ ماننا خاصا مشکل ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کے اتقاء کی اولیائے دلی اس قدر تعریف کرتے تھے۔ اس کے بعد کئی سال بدامنی چھائی رہی۔ جب 1246ء میں سلطان مسعود کو نااہلی اور ظلم کے باعث برطرف کیا گیا تو التتمش کے پوتے ناصر الدین نے سولہ برس کی عمر میں حکومت سنبھالی اور بیس برس تک حکومت میں رہا۔ تیرہویں صدی کا یہ مذہب پسند بقول امیر خسرو فرشتہ سیرت بادشاہ تھا۔ اس نے سیاست کے خطرات سے بچنے کی راہ اپنائی اور حکومتی فرائض اپنے باپ کے سابقہ غلام اور اپنے سسر بلبن کے سپرد کر کے خود کو زیادہ تر مذہبی فرائض تک محدود کر لیا جس میں وہ زیادہ تر قرآن کی نقول تیار کرتا۔ یہ نسخے بچے جاتے اور حاصل ہونے والی رقم سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتا۔ اس نے حکومتی خزانے سے اپنی ذاتی ضرورت کے لیے کوئی رقم نہ لی۔ اس نے علماء پر نوازشات کی بارش کر دی۔ اس کے بارے میں کم از کم عمومی رائے یہی ہے۔ تاہم اس کا تقویٰ سیاسی صورت حال میں بہتری نہ لا سکا۔ پنجاب پر منگولوں کے حملے اور امیروں کی شورش مسلسل دردِ سر تھے۔ بالآخر 1259ء میں ہلاکو خان نے ناصر الدین کے نمائندے سے وعدہ کیا کہ وہ برصغیر کی سرحدوں پر یلغار ختم کر دے گا۔

سلطان 1266ء میں انتقال کر گیا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس میں بلبن کا ہاتھ تھا۔ ساٹھ سال سے کچھ کم عمر کے بلبن نے حکومتی باگ ڈور باقاعدہ طور پر سنبھال لی اور دورِ حکومت کے ابتدائی کچھ سالوں میں بے لگام رہنے کے بعد اس نے ایک متقی مسلمان کے طور پر زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ وہ صوم صلوٰۃ کا پابند ہو گیا اور اکثر نفلی عبادات بھی بجا لانے لگا۔ علماء اور اولیاء کی اتنی عزت کرتا تھا کہ ان کے جنازے میں بھی شریک ہوتا۔ اس

نے بھی دلی کے مسلم اداروں میں ایک اضافہ مدرسہ ناصریہ کی صورت میں کیا اور منہاج السراج (متوفی 1270ء) کو اس کا پہلا صدر مدرس مقرر کیا۔ اپنی ترقی پسندی کے باوجود اس نے ایرانی دربار کا سا انداز اپنایا اور وہ اپنا نسب نامہ افسانوی افراسیاب سے جا ملاتا تھا۔ اس نے اپنے پوتوں کے نام شاہ نامہ کے ایرانی ہیروؤں کے نام پر رکھے۔

ایک صدی بعد نہایت قدامت پسند مورخ ضیاء الدین برنی بلبن کے عہد کا مفصل مگر غیر جانبدارانہ حال بیان کرتا ہے وہ ایک مثالی اسلامی ریاست پر بلبن کے نظریات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ برنی کا دعویٰ ہے کہ منصفانہ حکومت کے حوالے سے بلبن دو افراد کو مثالی کردار خیال کرتا تھا۔ خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب (634ء۔644ء اور دوسرے عمر ابن عبدالعزیز (717ء۔720ء) جو امیہ خاندان کے واحد متقی حکمران تھے۔ اس نے بلبن کا ایک بیان بھی نقل کیا کہ وہ اپنے بیٹے بغرا خان کو بتاتا ہے کہ بادشاہ کو اس طریقے سے رہنا چاہئے کہ اس کے اعمال' افعال اور حرکات کو مسلمان اپنا سکیں اور بنظرِ تحسین دیکھیں۔ مزید یہ کہ اسے گزشتہ عہد کے بادشاہ کی پیروی کرنی چاہئے اور نیکی کے کاموں اور مباحات سے رضائے الٰہی حاصل کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے رویے کو برنی نے بیان کیا ہے جس میں اس نے دین پناہی کو بادشاہ کا سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے۔ اس دور کے سیاسی منظر نامے پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مذہبی تصورات اور سیاسی حقیقتوں کے درمیان وسیع خلیج حائل تھی۔

> "خواہ ایک بادشاہ ہر روز ہزار رکعت نماز پڑھے' تمام زندگی روزے رکھے' ممنوعات سے پرہیز کرے اور سارا خزانہ خدا کی راہ میں صرف کر دے لیکن اگر وہ دین پناہی نہیں کرتا' اپنی قوت و جبروت کو دشمن خدا اور سول کی تذلیل' تحقیر اور تباہی میں استعمال نہیں کرتا' قانون الٰہی کا نفاذ نہیں کرتا تو اس کا مقام سوائے دوزخ کے اور کہیں نہیں ہو گا"
>
> (برنی' تاریخ فیروز شاہی)

تاہم دارالحکومت اور قدرے کم درجے پر چھوٹے شہروں میں بھی' مذہبی زندگی پھل پھول رہی تھی۔ مبلغین اور امام خوشحال زندگی گزارتے تھے کیونکہ ان کی عزت کی جاتی تھی اور یہ حکومت کے تنخواہ دار تھے۔ جمعہ کے وعظ کے علاوہ ان کے فرائض میں رمضان اور

محرم میں ہونے والی مجالس ذکر میں شرکت شامل تھی۔ اس قسم کی مجلسیں عام طور پر ہفتے میں تین دن ہوا کرتی تھیں۔ ان کا مقصد لوگوں کے دلوں میں مذہبی جوش و خروش پیدا کرنا تھا۔ ہنگامی صورتِ حال میں بھی اس طرح کے اجتماع منعقد کر لیے جاتے تھے۔ چنانچہ منگولوں کے حملے کے وقت قاضی منہاج السراج نے ایسا ہی ایک اجتماع اکٹھا کیا۔

تیرھویں صدی میں پہلی بار سرکاری مذہبی اداروں کے لیے قواعد و ضوابط بنائے گئے۔ التمش نے شیخ السلام کا ادارہ قائم کیا اور بختیار کاکی کو یہ عہدہ پیش کیا گیا اور چونکہ چشتی صوفی دربار سے گریز کرتے تھے۔ اس لئے بعد ازاں یہ عہدہ شہاب الدین عمر سہروردی کے مرید سید نور الدین مبارک غزنوی (متوفی 1234ء) کے سپرد کیا گیا۔ جنہوں نے غیر مسلموں اور اہلِ فلسفہ دونوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔ راسخ العقیدہ اولیاء کے مکتب فکر میں یہ زویہ عام ملتا ہے۔ سندھ میں یہ عہدہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے پاس تھا۔ شیخ السلام کا فریضہ تھا کہ وہ سلطنت کے دینی معاملات کی دیکھ بھال کرلے۔ تمام اولیاء' صوفی اور فقیر جنہیں سرکاری سرپرستی حاصل تھی' اس محکمے سے اپنے وظیفے پاتے تھے۔ ہر شہر میں ایک قاضی مقرر کیا گیا جو انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ قاضیوں میں سے طبقاتِ ناصری (1256ء) کے مصنف صوفی منش منہاج السراج نے دہلی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے باعث صوفیوں اور خصوصاً چشتیہ میں مقبول محافل سماع کو قانونی قرار دیا گیا۔ حالانکہ بہت سے دوسرے قانون دانوں کو اس پر اعتراض تھا۔

سرگرمیوں کا محور ایک اجنبی ماحول میں اسلامی ورثے کی حفاظت تھا۔ چنانچہ تیرھویں صدی اور اس کے بعد بھی' علماء نے کوئی نیا کام کم ہی کیا۔ زیادہ تر مستند پرانی تصانیف اور تحقیقات کی شرح' تدوین اور تلخیص کی جاتی رہی۔ چنانچہ وہ حدیث رسولؐ میں شدید دلچسپی اور اجنبی اور غیر مسلم روایات کے وسیع تر سمندر میں ان پر عمل کو راہ ہدایت پر رہنے کا ذریعہ اور اپنی پہچان خیال کرتے تھے۔

مشرق وسطی کے بااثر ترین علماء میں سے ایک' جو کچھ عرصہ دہلی دربار سے متعلق رہے' رضی الدین اسلاعینی تھے۔ ان کا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ 1220ء میں انہیں آخری فعال عباسی خلیفہ الناصر نے اپنا سفیر بنا کر التمش کے دربار میں بھیجا تھا۔ بیس برس کے بعد ساغنی بغداد لوٹ گئے۔ ان کی "مشارق الانور" صحیحین یعنی

بخاری اور مسلم کی احادیث کی ترتیب نو اور مفصل تشریح پر مشتمل ہے۔ حدیث کے اس معیاری کام پر کئی ہندوستانی علماء نے شرحیں تحریر کیں۔ اس کتاب میں 2253 احادیث شامل ہیں اور یہ ہندوستان کے کئی مدارس میں شامل نصاب رہی۔

اس کے بعد چودھویں صدی سے "مشارق الانوار" اور اںگاوی (متوفی 1122) کی "مصابیح السنہ" دونوں مل کر تقریباً تمام مدارس کے حدیث کے نصاب کا احاطہ کرتی رہیں۔ کچھ دہائیوں کے بعد تبریزی کی "مشکوٰۃ المصابیح" منظر عام پر آئی۔ اب ہندوستانی مدرسوں میں تدریس حدیث اس کتاب کی بنیاد پر ہونے لگی۔ یہ کتاب فرنگی محل اور دیوبند کے عہد تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہی۔ نسبتاً چھوٹے مدرسوں تک میں اس پر حواشی تحریر کیے گئے۔ اسے مشکوٰۃ شریف بھی کہا جاتا رہا۔

صوفی زیادہ تر توجہ حدیث پر دیتے تھے۔ لیکن مدرسے کے طالب علم جنہیں قاضی بننے کی امید ہوتی تھی' زیادہ توجہ فقہ پر دیتے تھے۔ فقہ پر معیاری درسی کتاب مرغنانی (متوفی 1197) کی "ہدایت المبتدی" تھی۔ جو انگریزوں کی آمد تک شامل نصاب رہی۔ یزدادی کی "اصول الفقہ" اس کتاب کے ساتھ مل کر مدرسوں کی نصابی ضرورت پورا کرتی تھی۔ فقہ حنفی کی اہم حوالہ جاتی کتاب قدوری (متوفی 1037) کی "مختصر" تھی۔

جہاں تک تفاسیر کا تعلق ہے تو طالب علموں کو مخشری (متوفی 1144) کی "کشاف" استعمال کرنا پڑتی تھی۔ اگرچہ بہاؤالدین زکریا کی طرح کچھ صوفیا نے اسے معتزلی قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا تھا اور قرونِ وسطیٰ کے طالب علم کو عربی قواعد سیکھنے کے لیے معرزمی (متوفی 1213) کی "مصباح" اور ابن ملک (متوفی 1273) کی کفایہ پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اعلیٰ مدارج کے طالب علموں کے لیے حریدی کی مقامہ' مناسب خیال کی جاتی تھی۔ عربی کلاسیک پر اس شہ پارے کی نقل ہندوستان میں اٹھارہویں صدی تک کی جاتی رہی۔ ان تمام تصانیف پر وقتاً فوقتاً شرحیں اور حواشی لکھے جاتے رہے ہیں۔ بظاہر کلام سے متعلق ابو شکور السلیمی (اوائل گیارہویں صدی) کی "تمہید" اور ثمرقندی کی "الصحائف الالہیہ" کچھ زیادہ مقبول نہ تھیں۔ بعد ازاں اجی (متوفی 1354) کی "المواقف" میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی گئی۔

چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ تیرہویں صدی میں مسلمانوں کے درس و تدریس کی

بنیادیں رکھی جاچکی تھیں۔ یہ بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ ان سے انحراف تو کجا بھٹری تک کی کوشش نہ کی گئی۔ اگر اسلامی تعلیمات کے منابع کی تفاسیر' شرحوں' حواشی اور لغات و کشافات کی اس کثیر تعداد کو ذہن میں رکھیں تو جدت پسندوں کی مسلمانوں کو صدیوں پرانے اس بوجھ سے نجات دلوانے کی کوششیں ناقابلِ فہم نہیں رہتیں۔ وہ قرآن کی پرانی تفاسیر کی جگہ نئے زمانہ کے مطابق نئی تشریحات لانا چاہتے تھے کیونکہ ان کا متحرک پیغام بھلایا جاچکا تھا۔

بلبن نے اپنے قدرے سخت گیر لیکن کامیاب دورِ حکومت میں سلطنت کی توسیع کی بجائے اس کے استحکام پر زور دیا تھا۔ لیکن اس کے چہیتے بیٹے محمد کے انتقال کے بعد یہ کامیابی دھندلانے لگی۔ ملتان کا یہ صوبیدار محمد امیر خسرو اور حسین سنجری جیسے علماء کا سرپرست اور سہروردی صوفیاء کا ماننے والا تھا۔ وہ منگولوں کے ایک حملے میں لڑتا ہوا مارا گیا جنہوں نے ہلاکو کے وعدے کے باوجود ہندوستانی سرحد پر وقفہ وقفہ سے حملے (1282) جاری رکھے۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد بادشاہ بنا۔ کیقباد اور اس کے باپ بغرا خان کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی سے دہلی سلطنت کے ایک پر انتشار دور کا آغاز ہوا۔ امیر خسرو نے کیقاد باد اور بہار اور اودھ میں مقیم اس کے باپ بغرا خان کی مفاہمت کا حال شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے قرآن السعدین۔ کیقباد نوجوان تھا اور ہر قسم کی عیاشی اور لہو لعب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور کچھ علمائے دنیا ایسے مل گئے تھے جنہوں نے اسے ترک صوم رمضان اور ترک صلوٰۃ کے جواز فراہم کر دیئے تھے۔ اس کا دورِ حکومت مختصر تھا۔ 1290ء میں اسے قتل کر دیا گیا اور یوں افغان نسل خلجیوں کو اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔

جلال الدین خلجی کا دورِ حکومت مختصر لیکن عمومی طور پر خاصا فیض رساں تھا لیکن اس کا سدی موالی سے چھٹکارا حاصل کرنے طریقہ اس دور کے حکومت پر بد نما داغ ہے۔ جامع کمالات و فضائل یہ شخص بے شرع صوفیاء کے "موالی" گروہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود فرید گنج شکر کا قریبی دوست تھا۔ اسے عوام میں خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کی درگاہ میں بادشاہ کے راندہ دربار کئی امراء جمع ہوا کرتے تھے۔ جتنی فیاضی اور دریادلی سے وہ صدقہ خیرات کرتا اور خانقاہ چلانے میں خرچ کرتا اس کا اچھا خاصا ذریعہ آمدن ہونا چاہئے تھا جو نظر نہیں آتا تھا۔ بادشاہ کو کسی بغاوت کی بو آئی۔ لیکن اس الزام کو کبھی ثابت نہ کیا جا سکا۔

بادشاہ نے اسے آگ پر چلا کر بے گناہی ثابت کرنے کی بابت علماء سے رائے پوچھی جنہوں نے اس عمل کو غیر مذہبی قرار دیا۔ بالآخر سلطان نے اسے ایک دوسرے گروہ کے قلندروں کے ہاتھوں بڑی سفاکی سے قتل کروادیا۔ اس کے قتل کے بعد گرد کا طوفان اور اگلے سال پڑنے والے خوفناک قحط کو لوگوں نے موالی کی معصومیت کی گواہی جانا۔ یہ واقعہ ہند مسلم تاریخ میں ضرب المثل بن گیا۔

جلال الدین فیروز شاہ نے کامیابی سے منگولوں کو لاہور سے بھگا دیا اور اسی کے عہد میں پہلی بار کوئی فوج اس کے بھتیجے علاؤ الدین کی سرکردگی میں دکن میں داخل ہوئی۔ اس سرگرم لیکن سنگ دل شخص نے اپنے چچا کو قتل کر دیا اور ملک پر اگلے بیس برس تک ایک سخت گیر حکومت مسلط کر دی۔ اس کے محتسب ضیاء الدین سنائی نے اسے ہر طرح کی برائی کی سرکوبی میں مدد دی۔ لیکن سلطان نے نشے کی حالت میں اپنے ایک دوست کو سزائے موت دے دی جس کے بعد اس کی نفاذ حدود کی کوششوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ذمیوں پر اسلامی احکامات کا نفاذ کیا گیا اور یوں' ہندوؤں کے لئے قیمتی لباس پہننا اور گھوڑے پر سوار ہونا ممنوع قرار پایا۔ مصر سے نور حدیث پھیلانے کی امید پر ہندوستان وارد ہونے والے مولانا شمس الدین ترک ملتانی علاؤ الدین کے پابند نماز نہ ہونے کے باوجود اسے قابل تعریف قرار دیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ذمیوں سے مذکورہ بالا رویہ بھی ہو سکتا ہے۔

> "میں نے سنا کہ ہندوؤں کے بیوی بچے مسلمانوں کے دروازے پر بھیک مانگتے ہیں۔ آفرین ہے تجھ پر اے بادشاہ اسلام کہ تم محافظ دین محمدیؐ ہو" (برنی' تاریخ فیروز شاہی)

اگرچہ سلطان کی پہلی اور سب سے بڑی ترجیح مذہبی تعلیمات کی بجائے اپنے اقتدار کا استحکام تھی اور اس کے طرز سیاست کی بنیاد شریعت کی بجائے عملی تقاضوں پر تھی اس کے باوجود اسے "پیغمبرؐ کے بدترین دشمنوں" کو سزا دینے سے کافی دلچسپی تھی۔ اس نے زیادہ تر اس طریقہ پر عمل کیا کہ "اسلام یا موت میں سے ایک قبول کرو" اسماعیلیوں کے خلاف مہمات ایسی جدوجہد کا حصہ تھیں۔ برنی اور امیر خسرو نے اسماعیلیوں کو "اباحتین" قرار دیا تھا۔ یعنی وہ لوگ جو جنسی تعلقات میں محرمات سے گریز نہ کرتے تھے۔ 1311 سے کچھ عرصہ پہلے سلطان نے ان لوگوں کی تفتیش کروائی وہ مجرم پائے گئے انہیں سزا ہوئی جس کا حال امیر خسرو

نے درج کیا ہے۔

"سلطان نے بطور سزا انہیں آروں سے چِروادیا" (امیر خسرو "خزائن الفتوح")

یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ محرمات سے جنسی مراسم کے مرتکب ہو رہے تھے' کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ علاؤالدین عمارتیں تعمیر کرنے اور ان کی دیکھ بھال کا شائق تھا۔ اس نے ایک ایسے مینار کی بنیاد رکھی جسے قطب مینار سے ہر طور بڑھ کر ہونا تھا لیکن یہ مینار مکمل نہ ہو سکا۔ اس نے مسجد قوت الاسلام کی توسیع بھی کروائی۔

دلی کے پشتے مرمت کئے گئے اور کہیں کہیں سے ان کی تعمیر نو کی گئی جس کے متعلق امیر خسرو بڑے فاتحانہ انداز میں لکھتا ہے۔

"اور چونکہ ایک نئی عمارت کو خون دینا ضروری ہوتا ہے' اس پر کئی ہزار بکروں جیسی داڑھیوں والے منگول ذبح کئے گئے" (امیر خسرو "خزائن الفتوح")

علاؤالدین فوجی مہمات لے کر گجرات' مالوا اور ایک بار پھر دکن گیا۔ جہاں کامبے سے دستیاب ہونے والے ایک خواجہ سرا ملک کافور نے شاہی فوج کی رہنمائی کی۔ جنوبی ہند کے ہندو حکمران دلی کے باجگزار بن گئے۔ مالی حکمت عملی اور قیمتوں پر کنٹرول کی طرح علاؤ الدین کا جاسوسی نظام بھی متاثر کن تھا۔ ریاست کی انتظامیہ علماء کی دیکھ بھال کرتی اور صدور کے ذریعے انہیں قابو میں بھی رکھتی۔ صدر الصدور ریاست کا سب سے طاقتور افسر بن گیا۔ اکبر کے عہد میں پوری سلطنت میں اس کا چوتھا درجہ تھا۔ وہ سب سے بڑا افسر قانون بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خانقاہوں' مسجدوں اور علماء کے لیے وقف زمینوں کی نگرانی کا انتاہی اہم کام بھی اس کے ذمے تھا۔ وہ ایک طرح سے وقف کا مرکزی منتظم تھا اور اسے مذہبی حلقوں میں جاگیروں کی عطا کرنے کا لامحدود اختیار حاصل تھا۔ چونکہ وہ شرعی قانون کے نفاذ کے مقتدر ترین عہدے پر فائز تھا' وہ مبینہ ملحدوں اور زندیقوں پر مقدمے چلا کر انہیں سزائے موت بھی دے سکتا تھا۔ کچھ لوگ علاؤالدین کی سیاسی کامیابیوں کو ولی کے دلی نظام الدین اولیاء سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ نظام الدین اولیاء کے دوست اور مرید حسن دہلوی نے بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور اس کا "شکر گزار ہوا جس کی بدولت دین و دنیا کی عمارت

مضبوط اور مستحکم ہے"۔

نہال ملک او زانست تازہ
کہ آں پروردہ پروردگار راست

نظام الدین کے دوسرے چہیتے امیر خسرو نے بھی بادشاہ کی تعریف کی ہے۔ نظام الدین کے جانشین چراغِ دہلی کی خانقاہ میں بھی اس کے اقتصادی انتظام اور خصوصاً اناج کی کم قیمتوں کی تعریف کی گئی۔

1316ء میں علاؤالدین کی جگہ اس کا بیٹا مبارک تخت پر بیٹھا۔ اسے بھی حسبِ معمول انتشار کا ایک دور دیکھنا پڑا۔ اس سلطان نے خلیفہ اللہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ سلطنت دلی میں بالکل نیا سیاسی حربہ تھا۔ لیکن یہ مقدس لقب بھی اسے لہو ولہب کی زندگی سے نہ بچا سکا جس میں اس کے نچلی ذات کے ہندو سے مسلم ہونے والے ایک چہیتے خسرو خاں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ خسرو نے 1320ء میں اپنے اس عاشق کو قتل کر دیا اور ایک نیا عہد متعارف کروایا۔ برنی لکھتا ہے کہ اس کے عہد میں مسجدیں مسمار کروا دی گئیں اور اسلام کی مقدس کتابوں کو بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس بیان کی حقیقت ثابت نہیں ہو سکتی لیکن لوگ بہر حال پانچ ماہ بعد غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں اس جابر حکمران کا تختہ الٹنے پر خوش ہوئے۔ غیاث الدین تغلق نے ایک نئی ترک سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اسے ہندوستان میں اسلام کا نجات دہندہ کہا جاتا ہے۔ یہ شخص ایک راسخ العقیدہ سخت مزاج مسلمان تھا۔ سماع اور کچھ دوسرے مسائل پر اختلاف کی وجہ سے نظام الدین اولیاء کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ تھا۔ بدایونی اس کی موت کے متعلق عوام الناس میں روایات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "اہلِ ہند میں مشہور ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے سلطان المشائخ سے اپنے بغض کی بناء پر لکھنوتی جاتے ہوئے پیغام بھجوایا تھا کہ "میرے دہلی پہنچنے پر دہلی میں شیخ رہیں گے یا پھر میں" شیخ نے جواباً فرمایا "دلی ہنوز دور است"

دراصل عمر رسیدہ بادشاہ لکھنوتی سے دلی واپس آتے ہوئے ایک چوبی چھت گرنے سے مر گیا۔ غالباً یہ چھت اس کے بیٹے اور جانشین محمد نے سازش کے تحت تیار کروائی

تھی۔ ؟

آنے والی ایک چوتھائی صدی میں سلطان کا کردار مجموعہ تضادات رہا۔ کبھی وہ بے تحاشا سخاوت پر مائل ہوتا اور کبھی ظلم و ستم میں حد سے گزر جاتا۔ شمالی افریقہ کا سیاح ابن بطوطہ جو 1333ء میں ہندوستان پہنچا اور محمد تغلق کی بادشاہی میں دلی کا قاضی رہا اس کے کردار کے ان پہلوؤں کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا دروازہ مرادیں پانے والے گداگروں اور قتل کئے جانے والوں کی لاشوں سے کبھی خالی نہ ہوا۔ اس نے سرکاری ملازمتیں نو مسلم ہندوؤں اور غیر ملکیوں کو دیں اور پرانی اشرافیہ کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ اس کی دلچسپی زیادہ فقہ اور معقولات میں تھی تاہم اس نے بہاری صوفی شرف الدین مانیری سے تصوف پر ایک ایسی کتاب لکھوائی اور عظیم عالم دین علاؤالدین اجی کو شیراز سے بلوا بھیجا۔ اگرچہ اجی نے دعوت قبول نہ کی لیکن اس کی کتاب ہندوستانی مدارس میں ایک معیاری درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جانے لگی۔ تغلق عبادات کا پابند تھا اور دوسروں کو بھی باجماعت نماز کا حکم دیتا تھا۔ اس نے ایک دن میں نو افراد کو نماز نظر انداز کرنے پر قتل کیا۔ اس کے ساتھ وہ اپنے سیاسی ہتھکنڈوں میں مذہبی قوانین کو نظر انداز کرتا ہے۔ برنی کا بیان ہے کہ وہ رسالت کو بادشاہت میں مدغم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک سلطنت اور مذہب توام تھے جنہیں اکٹھا کام کرنا تھا وہ رکن الدین ملتانی کا احترام کرتا اور معین الدین چشتی اور سالار مسعود جیسے اولیاء کے مزاروں پر حاضری دیتا لیکن چشتیوں کی طرح الگ تھلگ زندگی گزارنے والے بارسوخ صوفیاء اسے مضطرب کر دیتے۔ 1327ء میں اسے نے اپنے افسروں اور کچھ دیر کے بعد دلی کے دانشوروں کو بھی دیوگر یعنی دولت آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا جو اس کی بادشاہت کا جغرافیائی مرکز تھا۔ کچھ سالوں کے بعد انہیں دہلی واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن مسلمانوں کی قابل ذکر تعداد نے دولت آباد ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے نہ صرف جنوبی حصے میں ایک موثر انتظامیہ کی تشکیل میں مدد دی بلکہ وہاں مذہبی تصورات کی ترویج میں بھی معاون ثابت ہوئے۔ اس عمل نے جنوبی مسلمان تمدن کی تشکیل میں قابل ذکر حصہ ڈالا۔

محمد تغلق کے طویل عہدِ حکومت (1325ء۔1335) میں سرحدی صوبوں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ اگرچہ زیادہ تر حصوں میں بغاوت پر قابو پالیا گیا لیکن سالوں تک پڑنے والے قحط نے وسیع علاقے ویران کر دیئے۔ تاہم ایک امر جس پر وہ متفکر تھا۔ سدِ تقرر کا تھا جو

اسے 1343ء میں قاہرہ میں موجود خلیفہ سے ملی۔ اس کے بعد ہی اس کو اپنا اقتدار جائز اور قانونی طور پر مسلمہ محسوس ہوا۔ اس کے باوجود ملک تقسیم ہو گیا۔ ماوراء میں ایک آزاد سلطنت 1335ء میں وجود میں آئی۔ اس کے بعد دکن اور بنگال نے بھی یہی رستہ اختیار کیا۔ گجراتی باغیوں کی سرکوبی کے دوران دریائے سندھ کے کنارے تغلق کا انتقال ہوا اور "سلطان اپنے عوام اور عوام اپنے سلطان سے چھٹکارا پا گئے۔" (بدایونی "منتخبات التواریخ")

اس کی جگہ اس کا چچازاد فیروز شاہ 1351ء میں بادشاہ بنا۔ اس وقت ملک سیاسی اور اقتصادی طور پر نازک حالات سے گزر رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ لمبا قحط تھا اور دوسری تغلق کی اپنی ملکی سرحدوں کو تبت تک پھیلانے کی کوشش تھی۔ لیکن پنتالیس سالہ نیا حکمران ملک میں لمبے عرصے تک امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اشیاء صرف ارزاں تھیں اور قحط کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔

فیروز شاہ کے عہد میں برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری جیسے اہم تذکرے ملتے ہیں۔ ان تصنیفات میں ازمنہ وسطیٰ کا ہندوستان خاصی صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عام آدمی بلکہ ہندوؤں تک کی طرز زندگی کو بیان کیا گیا ہے جو اب سلطنت کے کاموں میں اہم کردار ادا کرنے لگے تھے اور انہوں نے نئے مندر بھی تعمیر کر لیے تھے۔ برنی کے مطابق حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مسلمان بادشاہ اور ہندو راجہ میں کوئی حقیقی فرق باقی نہ بچا تھا۔

> "دارالحکومت سمیت مسلم شہروں میں کافرانہ رسوم کھلے عام ادا کی جاتی ہیں 'بت پرستی سر عام ہوتی ہے' کافرانہ روایات ماضی کے کسی بھی دور کی نسبت زیادہ راسخ ہیں۔ کافر اپنے تہوار کھلے عام اور بلا خوف مناتے ہیں ڈھول پیٹے جاتے ہیں اور ناچ گانا ہوتا ہے۔ چند ٹکے جزیہ دے کر انہیں اپنے باطل عقائد پر عمل کی کھلی اجازت ملی ہوئی ہے"
> (برنی "فتاویٰ جہانداری")

برنی کی نفرت کا نشانہ صرف ہندو نہیں تھے سچے اسلامی اصولوں کے برعکس وہ طبقاتی امتیاز کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک مسلمان ہونا ہی کافی نہ تھا بلکہ خالص حسب نسب کا ترک ہونا بھی ضروری تھا اور نو مسلموں کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ درحقیقت

التتمش اور بلبن ہر دو کے عہد میں غیر ترکوں کی اعلیٰ عہدوں تک رسائی نہ تھی۔ وہ کم ذات لوگوں کو، جن سے اس کی مراد نو مسلم تھے، لکھانے پڑھانے کے حق میں نہیں تھا کہ مبادا وہ اہم عہدوں پر قابض نہ ہو جائیں۔

"کسی کم اصل کے ہاتھ میں قلم نہ دو مبادا آسمان کعبہ کے حجر اسود کو طہارت کے پتھر میں نہ بدل دے" (برنی "تاریخ فیروز شاہی" صفحہ 387)

تاہم برنی کے بیان کردہ تمام احوال کو من و عن تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا مقصد ایک طرح سے بادشاہ پر ایک مثالی حکمران کا چہرہ چسپاں کرنا تھا۔ وہ اسے جس طرح ایک مثالی حکمران کے طور پر پیش کرتا ہے ہم اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سلطان نائب خداوندی ہے اور اسے لطف اور قہر ہر دو کا اظہار کرنا ہے۔ اگر زندگی کے دھارے کو برقرار رکھنا ہے تو ایک مکمل خدا کے یہ دو پہلو ایک مثالی حکمران میں موجود ہونے چاہیں۔ لیکن جیسا کہ مصنف بیان کرتا ہے، محمد تغلق میں لطف اور قہر کے مابین کشمکش کچھ زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ ایک بادشاہ پر برنی کے بیان سے اس کے قاری کو ایک صوفی روایت یاد آتی ہے۔ جلال الدین رومی نے خدا کی لطف و قہر اور جمال و جلال جیسی متضاد صفات کے اظہار کے لیے ایک بادشاہ کی مثال کو استعمال کیا ہے جس کے ایک طرف شان و شکوہ اور اعزازی خلعتیں ہیں اور دوسری طرف تعزیری شکنجے اور قید خانے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برنی نے اپنی شدید عدم رواداری کے باوجود صوفیاء سے بہت کچھ سیکھا اور وہ اپنے ممدوح مرشد نظام الدین اولیاء کے قریب دہلی میں دفن ہیں۔ اسے فیروز شاہ نے بڑی خوب صورتی سے سجایا۔

فیروز شاہ، جس کی تخت نشینی میں چراغ دہلی اور دوسرے صوفیاء کے عمل دخل کا امکان ہے، نے بنگال اور سندھ کے خلاف فوج کشی کی لیکن بحیثیت مجموعی اس نے جنگ و جدل سے بچنے کی کوشش کی۔ اس کا رویہ ایک قدامت پسند مسلمان کا سا تھا۔ قرآن سے فال نکالے بغیر کسی کام کا آغاز نہ کرتا۔ 1355ء میں قاہرہ کے بے اختیار عباسی خلیفہ سے سندِ تقرر حاصل کرنے والا وہ دلی کا آخری سلطان تھا۔ اس نے ملک بھر میں کئی عمارتیں بنوائیں۔ مصری منابع کے مطابق اس نے ہزاروں مدرسے اور دارالحکومت میں ستر شفاخانے قائم کئے۔ مدارس میں سے حوضِ خاص کے نزدیک واقع فیروز شاہیہ مشہور ترین تھا۔ بادشاہ کو اس

کے قریب دفن کیا گیا۔

فیروز شاہ کے نزدیک مثالی ریاست سنی اسلامی ریاست تھی۔ 1374ء میں سالار مسعود کے مقبرے واقع بہرائچ پر حاضری دینے کے بعد اس کا قدامت پسندانہ رویہ مزید سخت ہو گیا اس نے حکم دیا کہ مسلمان عورتیں گھروں پر رہیں اور باہر نہ نکلیں۔ اس نے شیعہ اور دوسرے بدعتیوں کو سزائیں سنائیں۔

> "فرقہ شیعہ کے لوگ' جنہیں روافض بھی کہا جاتا ہے' بہت سی مرتدانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے لگے تھے۔ میں نے انہیں پکڑوایا اور کجروی پر سزا دی۔ ان کی کتب سرعام جلوادی گئیں اور بفضل خدا ان کا اثر ختم ہو گیا" (الفتوح فیروز شاہی)

اسی طرح اس نے علماء سے مہدی ہونے کے دعویدار ایک شخص کو قتل کرنے کا فتویٰ حاصل کیا۔ اسے امید تھی کہ "یہ اچھا عمل اسے مستقبل میں جزاء کا حقدار بنادے گا" اس کا ایک اور خاص مقصد ہندوؤں کو مسلمان کرنا تھا۔

> "میں نے اپنی کافر رعیت کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ مذہبِ رسول قبول کریں۔ جس نے بھی کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوا جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ کثیر مقدار میں اہلِ ہنود حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام کئے گئے"

اس کے عہد میں برہموں پر پہلی مرتبہ جزیہ لگایا گیا جس پر انہوں نے سخت احتجاج کیا۔ دوسری طرف اس نے عالموں اور متقیوں کی جاگیریں بحال کر دیں اور کوشش کی اپنے پیش روؤں کے برعکس ان سے نرمی کا سلوک کیا۔ انتظامی کاموں میں اس کی معاونت اس کا وزیر خانِ جہاں کرتا تھا جو تلنگ کا سابق ہندو تھا جس نے نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ بادشاہ کے انتظامی اصولوں کو 1375ء کو اس کے سب سے بڑے افسر تاتار خاں نے فقہ فیروز شاہی اور فتاویٰ تاتار خانیاں کے نام سے مدون کیا۔

فیروز شاہ کا 1388ء میں اسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس کے جانشین فسادی وزیروں کی کٹھ پتلیاں ثابت ہوئے۔ انتشار اتنا بڑھ گیا کہ تیمور کی شمالی ہندوستان میں یلغار (دسمبر 1398ء) شمالی ہندوستان کی مسلم تاریخ کی پہلی اور فیصلہ کن عہد کے خاتمہ پر منتج

ہوئی۔ مرکز ٹوٹ گیا اور صوبوں نے خود مختار ہو کر آزاد ملکوں کی شکل اختیار کر لی۔ فیروز شاہ نے کچھ جاگیریں پشتنی قرار دے دیں تھیں اس وجہ سے بھی نامور مسلمان خاندانوں کو اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ آخری تغلق سلطان محمود ثانی بیس سال تک برائے نام حکومت میں رہنے کے بعد 1413ء میں انتقال کر گیا۔

اب تک یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ ہندوستانی اسلام کے تشکیلی دور میں بیشتر سیاسی تبدیلیاں صوفی رہنماؤں کے کردار کے مطالعہ کے پس منظر میں سمجھی جا سکتیں ہیں۔ انہوں نے اسلام کے پھیلانے میں حکمرانوں اور سرکاری عالموں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہمیں انہی کے تذکروں اور یادداشتوں میں ہندوستانی عوام کے طور طریقوں اور رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ تیرھویں صدی کا سیاسی منظر نامہ سارے ایشاء پر منگولوں کی صورت میں نازل ہونے والی تباہی سے عبارت ہے۔ جو 1258ء میں بغداد کی عباسی خلافت کے خاتمے کا سبب بنا۔ لیکن اسی دوران تاریخ تصوف کی نامور ہستیاں بھی پیدا ہوئیں۔ سپین نژاد ابن عربی متوفی (1240ء دمشق) نے اپنا فلسفہ تصوف وحدت الوجود تشکیل دیا۔ جس نے برصغیر سمیت پوری اسلامی دنیا کو فیصلہ کن طور پر متاثر کیا۔ فارسی زبان کے سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی (متوفی 1273ء قونیہ) نے وجد آور دیوان لکھا اور اپنی مثنوی لکھوائی۔ دنیا بھر کے فارسی شناس اہلِ ایمان کے لیے یہ مثنوی روحانی مسرت اور طرفع کا لازوال ذریعہ ہے۔ مصر کے ابنِ الفرید (متوفی 1237ء) اور اناطولیہ یونس ایمرے (1300ء) نے عشق رسولؐ اور عشق الہٰی کے گیت گائے اور تصوف کے کئی سلسلے وجود میں آئے جنہیں اسلامی نظریات کی ترویج میں فیصلہ کن کردار ادا کرنا تھا۔

بلاشبہ لاہور کے ہجویری کی طرح 1200ء سے پہلے بھی برصغیر میں مسلم صوفی موجود تھے لیکن صوفیانہ سلسلوں کے بننے کے بعد ہی بڑے پیمانے کی تبلیغی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ برصغیر پہنچنے والے پہلے صوفی مبلغ خواجہ حسن معین الدین چشتی تھے۔ ان کی پیدائش 1411ء میں سیستان میں ہوئی۔ نجم الدین کبریٰ اور نجیب الدین سہروردی جیسے نامور مرشدوں کے مرید تھے۔ جن میں سے آخر الذکر کی آداب المریدین جلد ہی ہندوستان میں صوفیانہ تعلیمات کی حوالے کی کتاب بن گئی۔ ان کے بھتیجے ابو حفظ شہاب الدین عمر سہروردی کی کتاب عوارف المعارف اعتدال ہند' ہندوستانی تصوف کی بنیادی تصنیفات میں سے ایک ہے۔

ایک لمبے عرصے تک سفر میں رہنے کے بعد رسولؐ نے خواب میں معین الدین کو ہندوستان جانے کی ہدایت کی۔ لاہور میں ہجویری کے مزار پر حاضری دینے کے بعد وہ 1193ء میں' یعنی معیز الدین غوری کی فتح دلی کے ایک سال بعد' اس شہر میں پہنچے لیکن انہوں نے مستقل رہائش کے لیے راجستھان کے دل اجمیر کو ترجیح دی۔ معین الدین کی ذاتی زندگی پر ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں ان کی دو بیویاں تھیں جن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان کی بیٹی میں بھی متصوفانہ رجحانات پائے جاتے تھے۔ ان کا 1236ء میں انتقال ہوا اور مالوا کے سلطان ہوشانگ نے ان کا مقبرہ بنوایا جس کی توسیع اکبر کے عہد میں ہوئی۔

صوفی روایات میں خواجہ معین الدین کی محبت کل اور غرباء اور ضرورت مندوں پر توجہ کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ مبینہ طور پر ان کا دعویٰ تھا:

"افضل ترین فتویٰ درد مندوں کی دلجوئی' بے کسوں کی حاجت روائی اور بھوکے کو کھانا کھلانا ہے" (بدایونی' منتخبات)

ان کے نظریات وہی ہیں جو بایزید بسطامی (متوفی 874ء) کے تھے۔ یعنی کہ ایک صوفی کو سمندر کا سا فراخ دل' دھوپ کا سا نرم اور زمین کا سا منکر المزاج ہونا چاہئے۔ ہر چند کہ چشتی ابتدائی مراحل پر سخت راہبانہ زندگی پر زور دیتے تھے لیکن انہوں نے موسیقی اور شاعری میں دلچسپی کی بناء پر مریدین کی خاصی بڑی تعداد اپنے گرد جمع کر لی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تمدن کی تشکیل و تہذیب میں ان کی اس روایت کا قابل ذکر حصہ ہے۔ معین الدین چشتی کے طریقے کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ رسمی قبولِ اسلام پر زور نہ دیتے تھے کہتے تھے کہ نووارد کو پہلے حقیقت کا مزا چکھ لینا چاہئے۔ اسی فراخ دلی کے باعث وہ ہندوؤں میں بڑے مقبول ہوئے اور ان کی خانقاہ پورے برصغیر کے زائرین کا مرکزِ عقیدت بنی۔ یوسف حسن خان لکھتے ہیں کہ یہ ولی اللہ حسینی برہموں کے روحانی مربی و سرپرست بن گئے۔ ان کی درگاہ پر حاضر ہونے والے شہنشاہوں کی تفصیل تاریخِ ہند کی ہر کتاب میں ملتی ہے۔

خواجہ معین الدین کے مرید برصغیر کے مختلف حصوں میں گئے۔ اسلام میں مقامی رنگ شامل کرنے کا رجحان شیخ حمید الدین صوفی کے ہاں سب سے نمایاں ہے جنہیں سلطان التارکین کہتے ہیں۔ آپ ناگور میں ایک کچے گھر میں رہتے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کا سختی سے سبزی خور ہونا ہندو اثرات کا نتیجہ ہو۔ لیکن ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو کیونکہ

مغربی اور وسطی اسلامی دنیا کے اور صوفیاء بھی سبزی خوری اختیار کر چکے تھے۔ اسی طرح وہ حبس دم کی مشقیں بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اس پر تشریحی کتابیں بھی تحریر کیں۔ خیال رہے کہ بحیثیت مجموعی صوفیاء یوگا کی مشقوں سے کچھ زیادہ متاثر نہ تھے۔ بلکہ وہ یوگیوں پر تنقید کرتے کہ وہ جسم تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہیں نفس کشی میں اعتدال سے بڑھنا اسلام کی روح کے خلاف نظر آتا تھا۔

سلسلہ قائم کرنے کے حوالے سے بختیار کاکی (عُش، فرخانہ) حمید الدین صوفی سے زیادہ اہم ہیں۔ معین الدین سے ان کی ملاقات بغداد میں ہو چکی تھی۔ دونوں بغداد میں صوفیانہ تربیت اور روحانی بالیدگی حاصل کر رہے تھے لیکن بختیار کاکی معین الدین کے بعد ہندوستان آئے۔ معین الدین نے انہیں دلی کی روحانی قلمرو عطا کی جہاں التتمش نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ چشتی روایات کے عین مطابق انہوں نے مذہبی سمیت کسی بھی قسم کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بختیار کاکی قطب مینار سے کچھ فاصلے پر مہرولی میں رہتے تھے۔ ان کا انتقال دورانِ سماع حالتِ وجد میں ہوا۔ قوال احمدِ جام کا شعر دہرا رہے تھے

یہ واقعہ معین الدین چشتی کی وفات سے کچھ ماہ پہلے نومبر 1235ء میں پیش آیا۔ لودھی دورِ حکومت میں بختیار کاکی مقبول ترین افغان ولی تھے۔ ان کے عرس پر عوام الناس کا ایک انبوہِ غفیر سلسلے کی روایات کے عین مطابق سماع سے روحانی ارتفاع حاصل کرتا ہے۔ ان کے جاری و ساری اثر و رسوخ کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ گاندھی نے جنوری 1948ء میں اپنا مرن برت ختم کرنے کے لیے جو پانچ شرائط پیش کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہندو اور سکھ فرقہ ورانہ فسادات میں درگاہ کی ہونے والی توڑ پھوڑ کی مرمت کروائیں۔
در حقیقت چشتی سلسلہ کی بڑی شاخ کا آغاز ہی بختیار کاکی سے ہوتا ہے۔ دلی میں ان کے پہلے خلیفہ نے حکومت سے عدم تعاون کی روایت پر عمل نہ کیا لیکن ان کے زیادہ معروف خلیفہ فرید الدین المعروف بہ گنج شکر نے سیاسی وجوہات کی بناء پر دلی چھوڑی وہ ملتان کے قریب پیدا ہوئے اور ابتدائی تربیت اپنی متقی ماں کے زیرِ اثر حاصل کی۔ اسی وجہ سے ابتدائی عمر میں ہی مذہبی زندگی کا ذوق پیدا ہوا۔ انہوں نے اُچ شریف میں چلہ معکوس کیا یعنی کہ چالیس دن تک ایک تاریک کمرے میں الٹے لٹکنے کا مجاہدہ کیا۔ یہ راہبانہ مشق دو صدیاں پہلے خراسان میں بھی کی جا چکی تھی اس لیے اسے ہندو رسم قرار نہیں دیا جا سکا۔ فرید نے مسلسل روزے

رکھے جن میں سے اکثر صوم دواؤدی تھے۔ اس کا صلہ بالآخر انہیں ملا اور کنکریاں ان کے منہ میں شکر بن گئیں اور یوں ان کے نام کا پہلا حصہ وجود میں آیا۔ انہوں نے اگلے بیس سال ہانسی میں گزارے جہاں سے انہیں دلی بلا لیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد سیاسی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ گئے اور دلی سے نکل کر ستلج کے کنارے اجودھن میں آباد ہوئے جسے بعد ازاں پاکپتن کا نام دیا گیا۔

فرید الدین کا زہد و تقویٰ ہندوستان میں ضرب المثل بن گیا اور بلا شبہ وہ نہایت فقر والے تھے۔ حکومتی امداد کا ذکر ہی کیا وہ زراعت کو بھی مسترد کر چکے تھے۔ چنانچہ خانقاہ کا نظام فتوح پر چلتا تھا جس کی وجہ سے اکثر مشکل حالات کا سامنا رہتا تھا۔ ان کا کنبہ خاصا بڑا تھا لیکن اس نے کبھی آپ کو آزمائش میں نہ ڈالا۔ ان کا زیادہ تر وقت مراقبہ میں اور خانقاہ پر جوق در جوق حاضر ہونے والوں کو رشد و ہدایت میں گزرتا۔ 1265ء میں مرشد کا انتقال ہوا۔ ان کی کوششوں سے پنجاب کے کئی ہندو قبائل مسلمان ہوئے۔ فاتح تیمور اور اکبر اعظم نے ان کے مزار پر حاضری دی۔ بدنامِ زمانہ ٹھگ بھی انہیں اپنا مرلی مانتے تھے۔

چشتی صوفی سونے کام کرنے اور دوسری ضروریات زندگی کے لیے ایک بڑا سا کمرہ استعمال کرتے تھے جسے جماعت خانہ کہا جاتا تھا بعد میں اس کا نام خانقاہ پڑ گیا۔ خانقاہی زندگی بھر کے گرد گھومتی تھی۔ بروس لارنس از منہ اوسطی کے پیر کو درست طور پر قوت محرکہ مانتا ہے کہ وہ تقدیس قرآن اور احترام حدیث کو حیاتِ نو دیتا ہے۔ درست اندازِ نظر اور صحیح طرز عمل کی عکاس کہانیاں اور شاعری اپنے مریدین تک منتقل کرتا ہے' عبادت کرتا اور تعلیم دیتا ہے۔ بس یہی اس کی زندگی کا محور ہے۔ مریدین پیر کی خدمت کرتے اور باہمی تعاون سے خانقاہ کے معاملات چلاتے تھے فرید کے ایک مرید کی دو بیویاں تھیں جنہیں وہ باری باری آپ کی خدمت کے لئے بھیجتا تاکہ عدل کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ صوفی عام طور پر خانقاہ کے کاموں میں اپنے مریدین کا ہاتھ بٹاتا۔ بصورت دیگر وہ احوال الاولیاء اور صوفیانہ کتابیں پڑھتا رہتا۔ خانقاہ میں نو وارد کو اپنا سر منڈوانا اور پیر کے ہاتھوں بیعت کرنا ہوتی سب سے باصلاحیت مرید کو خصوصی تربیت دی جاتی تاکہ وہ خلیفہ کے مقام کا اہل ہو سکے۔ اس مرید کو زکوٰۃ حقیقت ادا کرنا پڑتی یعنی کہ اپنے تمام مال سے دستبردار ہونا پڑتا۔ خانقاہ کے بڑے مرید تعویز بھی لکھ دیا کرتے تھے جو زائرین کو دیئے جاتے جن کے بدلے میں وہ نقد یا جنس کا نذرانہ

خانقاہ پر چڑھاتے۔ آج بھی خانقاہ پر قیام کرنے والا زائر رخصت ہوتے ہوئے روحانی ارتفاع کے شکرانے میں نذر پیش کرتا ہے۔

جانشینی کے اصول نہایت واضح اور متعین تھے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ خلافت نامہ میں مذکور ہے۔

"اپنی خلافت اسے عطا کرو جو سنت نبویؐ سے ایک شمہ انحراف نہ کرے، جو اپنا وقت عبادات میں گزارے تمام علائق دنیا سے دامن کش ہو جائے"

جو نشانات خلیفہ کو عطا کئے جاتے ان میں خرقہ، سجادہ، چوبی کھڑاؤ، تسبیح اور عصا شامل ہوتا تھا۔ پھر خلیفہ کو کسی ایک علاقہ میں بھیج دیا جاتا جو اس کی ولائت ہوتا۔ شہروں اور قصبوں میں نائب کا تقرر کیا جاتا جو سلسلے کے نئے مرکز کھولتا۔ ہر صوفی مرشد کی ولائت کی حدود متعین ہوتی تھی۔ اس طریقے سے روحانی مرکزوں کا ایک پورا جال ملک بھر میں پھیلا دیا جاتا تھا۔ چونکہ چشتیہ عائلی زندگی کی کچھ زیادہ پروانہ کرتے بلکہ بیشتر اوقات مجرد رہتے اس لیے ان میں خلیفہ منتخب کیا جاتا جبکہ سہروردیہ میں جانشینی خاندان میں چلتی تھی۔

جماعت خانہ سماجی زندگی کا مرکز تھا۔ اپنی ظاہری غربت کے باوجود ہندوستانی معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ یہاں ہمدردی یا ہدایت کی تلاش میں آتے یہاں پر عالم، افسر، تاجر اور درویش سب برابر ہوتے تھے۔ ایک مثالی مسلمان کی دو سب سے بڑی خوبیوں یعنی تواضع اور میزبانی کا اظہار لنگر سے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ہندوؤں کی معاشرتِ زندگی کے تضاد کی علامت بھی تھا جہاں مختلف ذاتوں کے افراد کا اکٹھے بیٹھ کر کھانا ناممکن تھا۔

فریدالدین شکر گنج کے سات خلفاء تھے۔ ان میں سے جمال الدین ہانسوی محبوب ترین تھے۔ جو اپنے مرشد کی تعریف میں یوں نغمہ سرا ہیں :

هر کرا پیر رهبر است اورا — یافتن وصل دوست آسان است
هست پیرم فرید ملت و دین — کوگل گلبن سلیمان است

خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کا مالک جمال صوفیاء کی سادہ زندگی کو یوں بیان کرتا ہے :

وین طایفه گلیم پوشان
لی زحمت تاج و تخت شاهند

ان کے اقوال ملاحات ہندوستان میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔
جمال الدین ہانسوی اولین چشتیہ کے دلکش اور شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔
جبکہ ان کے برعکس ان کا پیر بھائی علی صابر متوفی (1291ء) ایک سخت گیر اور طالبِ متقت مرشد تھا بعد ازاں علی صابر کی چشتیہ شاخ نے کافی زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

فرید الدین کے بڑے خلیفہ بدایوں کے نظام الدین اولیاء تھے جن کے ترک آباؤ اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ 1257ء میں مرشد سے ملاقات کے وقت وہ فقہ کے ذہین طالب علم تھے۔ اس وقت ان کی عمر اکیس برس تھی۔ ابتداء میں فرید نے ان سے درشت رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے ان سے سہروردی کی عوارف المعارف کے کچھ حصے پڑھے نتیجہ یہ نکالا کہ نظام الدین جنہوں نے اپنے ابتدائی سالوں میں مقامات مریدی زبانی یاد کر لی تھی اس کے کفارے کے لیے ساغانی کا مجموعہ احادیث مشارق الانوار زبانی یاد کرتے ہیں ان کی اپنے مرشد سے صرف تین بار ملاقات ہوئی تھی کہ دلی میں خلیفہ مقرر کئے گئے جہاں اگلے ساٹھ سال تک غیر متنازعہ روحانی رہنما کے طور پر کام کرتے رہے۔ برنی کا یہ بیان مکمل طور پر درست نہیں کہ ان کی وجہ سے دارالحکومت کے بیشتر مسلمان تصوف اور نماز کی طرف مائل ہوئے اور شراب نوشی اور گناہوں سے تائب ہو گئے۔ سیاسی حقیقت اس بیان سے متصادم ہے تاہم نظام الدین کی وجہ سے تصوف پہلے سے زیادہ عوامی تحریک بن گیا۔ برنی کی بیان کردہ فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ کثرت سے تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے جن میں مسلم تصوف کی تقریباً سب مشہور کتابیں شامل تھیں۔ شاید تیرہویں صدی کی تلخ روزمرہ زندگی کے ذہنی فرار کے لیے وہ ان میں پناہ لیتے تھے۔

فصیح البیان مبلغ نظام الدین، جنہیں پیار سے محبوب الٰہیؒ کہا جاتا تھا، نے معاشرے کے تمام طبقوں کے لوگ اپنے گرد اکٹھے کر لئے۔ سلطان علاؤالدین کا بد قسمت بیٹا خضر خان بھی ان کی محبت اور شفقت کا اسیر تھا لیکن خود نظام الدین اولیاء کا چہیتا امیر خسرو (1253ء۔1325ء) تھا۔ یہ شاعر، درباری، موسیقار، طوطی ہند، سبک نغمہ نگار اور حالاتِ حاضرہ پر مثنوی لکھنے والا پہلا شخص تھا۔ روایات کے مطابق مرشد کے لعابِ دہن کی وجہ سے وہ شاعر شیریں مقام بنا۔ اس نے اپنے مرشد کی تعریف میں ایک سے زیادہ فصیح و بلیغ نظمیں لکھیں۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چودیس

کہاجاتا ہے کہ مرشد کی وفات پر امیر خسرو نے ایک ہندی شعر پڑھا۔
مرشد کے جلد ہی بعد وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے عدم آباد کو روانہ ہو گیا۔ اسے مرشد کے قریب دفن کیا گیا۔ اٹھارویں صدی میں دہلی پر آنے والی تباہی کا سبب لوگ یہ بتاتے تھے کہ محمد شاہ کو ان دونوں کے درمیان دفن کر کے دو محبت کرنے والوں کو جدا کیا گیا ہے جس کا نتیجہ ان مصائب کی صورت میں نکلا۔

لیکن ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کے حوالے سے درباری شاعر امیر خسرو کی نسبت ان کے قریبی دوست حسن سجزی کی اہمیت زیادہ ہے۔ ان کی نظموں سے دلگداز احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے انہیں امیر خسرو کی فنکارانہ کمال کی آئینہ دار شاعری پر فوقیت حاصل ہے۔ ہندوستانی فارسی شاعری کا مقبولِ عام کنایہ "کج کلاہ" انہیں کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ مبینہ طور پر یہ کنایہ حدیث رسولؐ سے ماخوذ ہے کہ "میں نے اپنے رب کو ایک نوجوان کے روپ میں دیکھا جس کی ٹوپی ٹیڑھی تھی"۔ یہ کنایہ ایران اور پھر ہندوستان میں صوفی شعراء کے کلام میں مدتوں رنگ بھرتا رہا۔ پہلی مرتبہ حسن نے ہی نظام الدین اولیاء کے اقوال کو ایک رسالہ "فوائد الفواد" کی شکل میں پیش کیا۔ تب سے ملفوظات کی صنف صوفیانہ افکار کی اشاعت کا ایک اہم ذریعہ بن گئی۔ وسطی عہد کے ہندوستان کی معاشرتی اور مذہبی حالت جاننے میں ملفوظات مورخ کے سرکاری روزناچوں اور وقائع سے کہیں زیادہ مدد کرتے ہیں۔

دلی میں نظام الدین کے جانشین نصیر الدین تھے جنہیں چراغ دہلی بھی کہا جاتا تھا۔ ان کا تعلق اودھ سے تھا۔ انہوں نے اپنی رسمی تعلیم حدیث میں مکمل کی اور پچیس سال کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر اگلے سات سال سخت زاہدانہ مجاہدوں میں گزارے اور بالآخر نظام الدین کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ان کے ملفوظات "خیر المجالس" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پابندِ شریعت اور باشرع مرید تھے۔ اسی لیے انہوں نے مرشد کے سامنے جبین سائی سے انکار کیا۔ حالانکہ سلسلہ چشتیہ میں یہ ایک معمول تھا۔ محمد تغلق نے ان کا جینا مشکل کر دیا چنانچہ بیشتر روحانیت مند لوگوں کی طرح انہوں نے فیروز شاہ کی تخت نشینی کو خوش آمدید کہا۔ 1356ء

میں ان کا انتقال ہوا اور اسی بادشاہ نے ان کا مقبرہ تعمیر کروایا جو اب کھنڈر بن چکا ہے۔ ان کے مرید نے ان کا قصیدہ لکھا۔

"یہ وہی مرید مطہر ہیں جن کی ایک مثنوی میں اس دور کے آزاد طبع عالم کی مطالعاتی دلچسپیوں کا حال ملتا ہے" ان کا شعر ہے

زعرفان عوارف زواجدان مصوص
زوعظ و نصائح کتاب سری

دلی کے بعد کے چشتیوں میں مسعود باک (متوفی 1387ء) قابلِ ذکر ہیں۔ عبدالحق دہلوی نے اس خدامست کا حال لکھا ہے جس نے صوفی بننے کے لیے درباری کا عہدہ ٹھکرا دیا تھا۔

بر براق وحدت اندر لا مکاں
بر نشستیم و بهر سو تا ختیم

ان کی "مراۃ العارفین" پہلی ہندوستانی تصنیف ہے جس میں ابنِ عربی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں ان کی تمکیت محیط کل وحدت کی واردات کا بیان ہے۔ بعد میں کی جانے والی شاعری پر ان کے اثرات انمٹ ہیں۔

غنچہ دل را بآب ذکر دوست
درمیان باغ جاں پروردہ ام

ان کے ہاں آنے والے صوفیانہ افکار کا ایک پرتو ملتا ہے۔ مثلاً وہ ذکر خفی کی کرامات بیان کرتے ہیں:

تو بے اختیار سلطان باہو (متوفی 1692ء) کے پہلے ابیات یاد آجاتے ہیں
چشتیہ سلسلہ کے ایک اور رکن جنہوں نے محمد تغلق کے دنوں میں اہم ادبی کردار ادا کیا۔ ضیاء الدین نخشبی ہیں۔ بدامنی کے زمانے میں انہوں نے ایک خاموش زندگی گزاری جس کے شکایت وہ شاعری میں یوں کرتے ہیں:

نہ ماندہ است از دہاوئی ہمردم　　میاں مرد مان شد مردمی گم
بر افتد شوم کیواں از میانہ　　شرف از مشتری دارد کرانہ

نخشبی کا کسی بڑے سلسلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ حیدر الدین ناگوری کے

چند روحانی جانشینوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی بدایوں میں گزاری۔ جہاں 'لذات انیسہ'' سمیت کئی اہم صوفیانہ اور اخلاقی تصنیفات سپرد قلم کیں۔ ان کی یہ تصنیف ''کوک شاستر'' کا فارسی روپ ہے۔ لیکن ادبی اعتبار سے ان کی اہم تصنیف ''طوطی نامہ'' ہے۔ جو انہوں نے 1330ء میں مکمل کی۔ یہ سنسکرت کی ایک کہانی پر مبنی ہے یہ کتاب بعد ازاں کئی مرتبہ ہندوستانی اور مغربی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ یہ ہندوستانی روایات اور ایرانی فنکارانہ اصناف کا آمیزہ ہے۔ اس کتاب کو مصور بھی کیا گیا جو دو روایات کے کامیاب ملاپ کی مثال ہے۔

محمد تغلق نے جس طرح دانشوروں اور خصوصاً صوفیاء کو دولت آباد بھجوا کر منتشر کیا صوفیا کی ناراضگی کا سبب بنا۔ اس سے ایک تو چشتیہ کی سرگرمیاں مفلوج ہو گئیں اور دوسرے یہ ان کے نزدیک ان کی ولائت میں مداخلت کے مترادف تھا۔ تاہم اس سے جنوبی ہند میں سلسلوں کی نئی شاخیں بنیں۔ نظام الدین کے مریدوں میں سے ایک میر خورد نے' غالباً اپنے مرشد کی درگاہ چھوڑنے کی تلافی میں' اپنے سلسلے کی پہلی تاریخ لکھی۔ باوجود داستانوی مواد کے ''سیار الاولیاء'' ناگزیر کتاب ہے۔ ایک اور چشتی برہان الدین غارب تھے جن کا 1340ء میں دولت آباد میں انتقال ہوا۔ یہ موسیقی کے شائق تھے اور سماع کی ایک صنف ان سے منسوب ہے۔ شہر برہان الدین ان کے مرنے کے کچھ دہائی بعد بسایا گیا اور اس کا نام آپ کے نام پر رکھا گیا۔ یقیناً برہان الدین کی اس نوجوان سے شناسائی تھی جس کے باپ کو آپ کی طرح جنوب بھیجا گیا اور جو بعد ازاں دوبارہ اپنے شہر دلی پہنچ کر حضرت چراغ دہلوی کا مرید ہوا۔ یہ نوجوان محمد گیسو دراز تھے جنہیں دکن میں ممتاز چشتی صوفی بننا تھا۔

جب چشتیہ ہندوستان میں قوت پکڑ رہے تھے تقریباً اسی وقت برصغیر کا دوسرا بڑا سلسلہ سہروردیہ بھی سرگرم ہو رہا تھا۔ اس سلسلے کے پہلے مرشد بہاؤالدین زکریا ملتانی تھے۔ یہ ملتان کے قریب ایک قریش گھرانے میں پیدا ہوئے پھر تعلیم حدیث کے لیے مرکزی اسلامی علاقوں کو چلے گئے۔ جب ان کی ملاقات بغداد میں ابو حفص سہروردی سے ہوئی تو اس مرشد نے ''سوکھی لکڑی کو جلنے کے لیے تیار پایا''۔ ملتان واپسی پر بہت سے لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ لیکن ان کا حلقہ اپنے چشتیہ ہمسایوں سے' جن کے ہاں توکل اور جذبابیت کی فراوانی تھی' بالکل مختلف تھا۔ ان کی خانقاہ کا انتظام بہت اچھا تھا۔ آنے والا صرف مقررہ اوقات میں

مل سکتا تھا۔ ان کی ترجیح مسلسل مجاہدوں کی بجائے خانقاہ کی خوشحالی تھی۔ وہ غالباً زمانہ وسطی کے ہندوستان کے امیر ترین ولی تھے۔ ایک بار ان کا بیٹا اغوا کر لیا گیا جسے بھاری تاوان دے کر چھڑوایا گیا۔ کچھ چشتی رہنما ان پر دنیاداری کا الزام لگاتے تھے لیکن وہ بڑا کاٹ دار جواب دیتے "تمہاری سلطنت درویشی بے کشش ہے۔ ہماری درویشی میں بے پناہ جمال ہے۔ ہماری دولت ہماری درویشی کو نظر نہیں لگنے دیتی یہ نظر بٹو کی طرح ہے" چشتیہ کے برعکس بہاؤالدین زکریا حکومتی امداد قبول کر لیتے اور قابلِ قبول حکمرانوں سے مفاہمت کا رویہ اپناتے۔ انہوں نے نجیب الدین سہروردی کی طرح قرآنی آیت "اتباع کرو خدا کی اس کی رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں سے میں سے اولی الامر ہوں" (سورہ 4/59) چنانچہ انہوں نے التمش کے ساتھ تعاون کیا اور ان کے مرید نے فیرز تغلق سے۔

بہاؤالدین زکریا نفسِ گرہ سے نوازا گیا تھا یعنی انہیں اپنے مریدں کے ذہنوں پر اختیار حاصل تھا اور وہ ان کے قلوب کی جلاء کر سکتے تھے۔ فخر الدین عراقی (متوفی 1289ء) کی کہانی ان کی مقناطیسی شخصیت کی اچھی مثال ہے۔ وہ ان کی خدمت میں پچیس برس رہے۔ انہیں سماع سے بہت دلچسپی تھی۔ اگرچہ سہروردیہ سماع کے خلاف ہیں لیکن بہاؤالدین زکریا نے ان کے اس شغل سے تعرض نہ کیا۔ آج بھی بہاؤالدین زکریا کے مزار پر عراقی کی یہ مشہور غزل گائی جاتی ہے۔

اولین چشتی صوفیاء اپنی متاہلانہ زندگی پر کچھ زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ بیٹے عدم توجہ کا شکار ہو کر راہِ تصوف سے منحرف ہو جاتے لیکن بہاؤالدین زکریا نے اپنے کنبے کی اچھی طرح دیکھ بھائی کی۔ ان کے سات بیٹوں میں ایک ان کا جانشین تھا لیکن جانشینوں میں سے ممتاز ترین ان کے پوتے رکن الدین (متوفی 1335ء) ہوئے۔ انہوں نے سندھ کے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ حتیٰ کہ علماء بھی ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں لکھا ہے کہ ایک اچھے مرشد کو تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لیے رقم' علماء کے مسائل حال کرنے کے لیے علم اور رہنمائی کے لیے روحانی اہلیت۔ ایک بلند ٹیلے پر ملتان میں رکن الدین کا مزار ابتدائی مسلم طرزِ تعمیر کی شاندار مثال ہے۔ تغلق انداز میں بنائی گئی یہ عمارت ہشت پہلو ہے اس کا ہر ضلع 9.30 میٹر لمبا ہے اس کا گنبد برصغیر کا دوسرا بڑا گنبد ہے جس کا محیط 45.40 میٹر ہے۔

سہروردیہ کے دوسرے صوفی جنوب اور مشرق میں سرگرم تھے۔ بنگال میں یہ سلسلہ جلال الدین تبریزی (متوفی 1244ء) نے متعارف کروایا لیکن ان کے جانشینوں کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ سلہٹ میں ان کا مقبرہ مچھلیوں سے بھرے ایک تالاب سے ملحق ہے اور آج بھی مرکز عقیدت ہے۔ ایک اور سہروردی مبلغ قاضی حمیدالدین ناگوری (متوفی 1244ء) کئی ممتاز چشتیوں کے دوست تھے اور ان کی طرح سماع پسند بھی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان کے مرید صرف تین تھے لیکن ان کی تصنیفات "موایہ عشقیہ" اور "تولی الشمس" اس دور کے صوفیاء میں بہت مقبول تھیں۔

سہروردیہ کا سلسلہ زیادہ تر ملتان اور اُچ سے چلتا رہا۔ ملتان میں ان کے سجادہ نشین معاشرتی اور سیاسی سطح پر اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ بہاؤالدین کے مریدین میں ایک بخارا کے سید جلال الدین سرخ تھے۔ ان کے بیٹے آگے چل کر رکن الدین کے مرید ہوئے اور اُچ شریف میں سکونت اختیار کی۔ یہیں 1308ء ان کا بیٹا جلال الدین حسین پیدا ہوا۔ تحصیل علم کی خاطر ملک ملک پھرے اور جہاں گشت کا لقب پایا۔ مشہور رہے کہ انہوں نے چھتیس حج کیے۔ اکثر دلی کا سفر کرتے اور فیروز شاہ سے بھی ملاقات ہوتی۔ اس کے باوجود انہیں چراغ دہلی نے خرقہ دیا اور یوں ان کے چشتیہ سے تعلقات بنے۔ آپ ان تھک انسان تھا۔ احادیث کی کئی کتابیں مرتب کیں اسی سرگرمی اور روحانی اثرورسوخ کی وجہ سے انہیں سندھ اور ملتان میں مخدوم جہانیاں کا نام دیا گیا۔ فیروز شاہ کی ٹھٹھہ کی مہم کے دوران انہوں نے فیروز شاہ اور سندھ کے جام کے درمیان افہام و تفہیم کروائی مجموعی طور پر مخدوم جہانیاں ہندوپاک کے سب سے راسخ العقیدہ صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ زیادہ تر صوفیاء کے برعکس، جو اپنی شاعری میں اللہ تعالیٰ کو ہندوستانی ناموں سے مخاطب کرتے، آپ کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کو غیر قرآنی ناموں سے مخاطب نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عالم مخدوم ماہیتِ قلب سے ایسے صوفی بن گئے جو مرجہ خلائق تھے اور جن کا نام چند دوسرے کلمات کے ساتھ پڑھ کر پانی پر پھونکا جاتا جسے پینے سے بواسیر کے مریض شفا پاتے۔

اسے سلسلے کی اُچ بخاری شاخ سے آگے ایک اور ذیلی شاخ پھوٹی جو جلالیہ درویش کہلاتے ہیں ان کے بے شرع ہونے پر تقریباً تمام سلسلے متفق ہیں۔ جلالیہ اور ان کے ایرانی ہم رتبہ خاکسار شیعہ ہیں یہی حال اچ کے بخاریوں کی آل اولاد کا بھی ہے۔

بہار میں ایک اور چھوٹا سا سلسلہ جو تغلق عہد میں خاصا موثر رہا فردوسیہ ہے۔ یہ خبر یہ سلسلے کی ایک شاخ ہے اس سلسلے کے سب سے بڑے نمائندہ شرف الدین یحیٰی مانیری (متوفی 1380ء) ہیں۔ اپنے سسر سنار گاؤں کے ابو توام کی طرح وہ بھی حدیث کے بلند پایہ عالم تھے۔ شرف الدین مخدوم الملک نے طالبین کی رہنمائی کے لیے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے زیادہ شہرت آداب المریدین اور مکتوبات سعدی کو ملی۔ موخر الذکر سو خطوط کا ایک مجموعہ مغل دور میں مدارس میں پڑھایا جاتا رہا۔ اکبر اور اورنگ زیب دونوں اس کے شائق تھے۔ یہ کتاب تصوف پر ایسی تصنیف ہے جسے آج کا قاری بھی پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں علمی اصلاحات کی بھول بھلیوں کی بجائے خدا سے محبت اور انسانیت کی خدمت کا درس دیا گیا ہے۔

"نماز' روزہ اور نفلی عبادات اپنی جگہ خوب ہیں مگر ان کی تفصیل وہ نہیں جو دل جوئی کی ہے"

اولین چشتیہ کی طرح شرف الدین بھی سرکاری ملازمت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ آج بھی بہار میں نہایت مقبول ہیں۔ ان کی ملفوظات نو حصوں میں ملتی ہے جس سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بڑے بڑے اور مستحکم سلسلوں کے علاوہ سلاطین کے دور میں کئی عجیب سلسلے وجود میں آئے جو لوہے کی زنجیریں اور کڑے پہنتے تھے۔ اپنے عجیب و غریب رویے اور تیور سے ماورا تقاضوں سے نا صرف عوام الناس بلکہ حقیقی صوفیوں کو بھی پریشان کرتے۔ کچھ مورخین کے خیال میں یہ لوگ صوفی شیوخ کے مقام و مرتبہ کے شعوری نقاد تھے۔ قلندر کا نام استعمال کرنے والے دو اشخاص نے خصوصی شہرت پائی۔ ان میں سے ایک نے چشتی ماحول سے جنم لیا اور نفس کشی کے لیے مشہور ہوئے۔ ان کا نام بو علی قلندر پانی پتی ہے۔ اپنے طویل سفروں میں قونیا بھی پہنچے اور غالباً رومی کے بیٹے سلطان ولاد سے بھی ملاقات کی۔ ان کی صوفیانہ مثنویوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بادشاہوں' شاعروں' صوفیوں اور ملاؤں کو یکساں طور پر متاثر کرنے والی مثنوی رومی سے بخوبی آگاہ تھے۔ عشق زدہ بو علی صوفیوں کے تین اصولوں کم خوراکی' کم خوابی اور کم گوئی کے ساتھ ساتھ ایک چوتھے اصول یعنی عوام الناس کا جبر برداشت کرنے کے اصول پر بھی عمل پیرا تھے۔ جب انہوں نے رومی کے ہاں دیکھا کہ ایک سچا صوفی خدا سے رحمت مانگتا ہے جبکہ ایک سچا عاشق زحمت مانگتا ہے تو وہ کہہ اٹھے:

"مقام عشق دہان نہنگ سے متماثل ہے"

پانی پت میں ان کا مزار قلندروں کے مراکز میں سے ایک تھا۔

اس محبّ اور محبوب شاعر سے زیادہ شہرت لال شہباز قلندر کو ملی۔ آپ کا تعلق سیستان سے تھا۔ وسط تیرہویں صدی میں زیریں وادی سندھ میں سہون کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ اس جگہ پہلے شیواجی کا آستھان ہوا کرتا تھا۔ برنی نے ملتان میں بلبن کے بیٹے کے دربار میں ان کے جانے کا حال لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بہاؤالدین زکریا نے انہیں خلافت عطا کی۔ جیسا کہ ان کے نام سے پتہ چلتا ہے یہ ملامتی تھے۔ قلندر سے ان کے طرز زندگی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ سرخ کپڑے پہنتے اور منشیات استعمال کرتے تھے ان سے ایک فارسی نظم منسوب ہے جس میں وہ آگ میں مشغولِ رقص نظر آتے ہیں۔ ان خطوط پر دیکھا جائے تو وہ شہیدِ محبت حلاج کے روحانی جانشین ہیں۔ تاریخ وفات معلوم نہیں۔ فیروز شاہ نے ان کا مقبرہ 1357ء میں تعمیر کروایا۔

ان کے گرد جمع ہونے والے درویشوں کو بے شرع کہا جاتا ہے کیونکہ یہ خود کو مذہبی قوانین کے پابند نہیں مانتے تھے۔ انؒ کے سیاہ پوش درویش سر منڈواتے ہیں اور جمعرات کی شام عارفانہ کلام گاتے ہیں۔ انہیں ملنگ کہا جاتا ہے ان کے عرس کو ابھی حال ہی میں غیر اخلاقی سرگرمیوں سے پاک کرنے کی کوششیں کی گئیں ہیں۔ ان کی تعریف میں لکھے گئے۔ شہباز قلندر گیت پاکستان میں نئے سرے سے مقبول ہو رہے ہیں۔

دوسرا باب

خود مختار ریاستوں کا عہد

جب تیمور نے سندھ عبور کیا تو وہ ایک لاکھ ہندوؤں کو جہادی تلوار کے گھاٹ اتار چکا تھا اور بڑے ملاؤں میں سے ایک ٗ مولانا نصیر الدین نے بھی ٗ جس نے زندگی میں بھیڑ تک ذبح نہ کی تھی پندرہ ہندوؤں کی گردنیں تن سے جدا کر دی تھیں۔

اس بیان کا درست یا غلط ہونا اپنی جگہ لیکن اس سے اور جگہوں کی طرح ٗ ہندوستان پر تیمور کی قہرمانی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ اس غارتگری کا ہدف صرف کافر نہیں تھے اس کے ہم مذہبوں پر بھی اتنا ہی ظلم و ستم ہوا۔ یلغار کے بعد بر صغیر کا شمال مغربی حصہ ویران ہو گیا اور دہلی اگلی ایک صدی تک "قبرستان سے تھوڑی ہی زیادہ" آباد رہی کیونکہ 1638ء کے بعد یہ ایسے بادشاہوں کا دار الحکومت رہی جن میں سلطنت کی توسیع تو کیا اسے بر قرار رکھنے کی سکت بھی نہ تھی۔ آخری تغلق حکمران بیس برس تک دربار کے مختلف گروہوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔

1414ء میں حکومت کی باگ ڈور سید خضر خاں نے سنبھالی جس کی سیادت مشکوک تھی۔ خضر خاں تیموری بادشاہ رخ شاہ کے نام کا خطبہ پڑھواتا۔ یوں اس نے شمال مغربی ہندوستان پر تیموری حکومت بر قرار رکھی۔ اس نے اپنے سکوں پر اپنا لقب "نائب امیر المومنین" نقش کروایا۔ اس کے جانشیں مبارک شاہ نے پنجاب پر قبضہ بحال کرنے کی کوشش کی اور دہلی کے نواح میں بسنے والے سرکش میواتیوں کے خلاف جدوجہد دوبارہ شروع

کی۔ صرف 37 سال کے بعد سید دور حکومت ختم کر دیا گیا۔ "ملتان کی فرمانروائی سے شروع ہو کر یہ بدایوں کی فرمانروائی پر ختم ہو گئی" تقریباً ڈیڑھ صدی کے بعد مورخ بدایونی لکھتا ہے کہ سیدوں کے ایک جانشین کا دعویٰ تھا کہ اسے حضرت عبدالقادر جیلانی (متوفی 1166ء) نے ہندوستان میں جہاد کا حکم دیا تھا۔

سید خاندان کا دورِ حکومت مختصر ہونے کے باوجود ہندی مسلم تاریخ میں بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد برصغیر کے مختلف حصوں میں اسلامی تمدن کے مراکز ابھرنے لگے۔ نہ صرف 'اب تک غالب' سنی اسلام مروج رہا بلکہ شیعہ اسلام کے مختلف روپ بھی پنپنے لگے۔

سید خاندان کے بعد لودھی آئے۔ یہ ملتان کے گرد مدت سے آباد غزنوی پٹھانوں کا ایک قبیلہ تھا جو فیروز تغلق کے دور میں کافی ممتاز رہا۔ جہاں ملتان میں لنگاہ شیخوں نے حکومت سنبھالی۔ وہاں لودھیوں نے دہلی سلطنت کی باقیات کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

افغانوں کی روایت کے مطابق لودھیوں کی حکومت 1524ء۔1443ء امراء شاہی تھی جس میں باہمی صلاح مشورے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ پہلا لودھی سلطان بہلول (1489ء۔1415ء) طویل چپقلشوں کے بعد طاقتور ہمسایہ ریاست جونپور کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار جب جونپور کے حسین شرقی نے دہلی کی طرف پیش قدمی کی تو سلطان بختیار کاکیؒ کے روضے پر گیا "اور ساری رات کھڑا دعا مانگتا رہا" کیونکہ وہ بہت متقی تھا اور "اپنا زیادہ تر وقت دانشوروں کی مجالس اور صلحاء کی صحبت میں گزارتا تھا"۔ وہ خود نماز روزے کا بہت پابند تھا۔ اس کا زہد و اتقاء لولاد کو بھی منتقل ہوا۔ اس کا بیٹا عبادت میں باپ سے سبقت لے جاتا۔ وہ تخت کی جدوجہد کے دوران اور تاجپوشی سے پہلے دلکشی کے باعث شیخ کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اپنے باپ کی طرح عبادات کا پابند اور غرباء کی دستگیری میں سخی تھا جس کا اظہار دورانِ رمضان اور پیغمبر کے روز ولادت بارہ ربیع الاول کو خصوصیت سے ہوتا تھا۔ اسے غیر مذہبی علوم سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے عہد میں عرب' ایران اور ملتان سے علماء نئے دارالحکومت آگرہ میں آکر منطق' فلسفہ اور تاریخ پڑھتے رہے' جن کے شاگردوں میں سے چالیس معروف عالم ثابت ہوئے۔ بعض اوقات سکندر بھی ان کے درس میں شریک ہو کر درس پارے سنتا۔ درباری شعراء میں سے حامد جمالی کمبوہ زیادہ

معروف تھے جو سہروردی صوفی تھے۔ انہیں سلطان کو شاعری میں اصلاح بھی دینا پڑتی تھی۔ انہوں نے وسیع جہاں گردی کی تھی جیسا کہ لکھتے ہیں۔

گہی در روم و گاہی جانب شام ندادہ خویش رایک لحظہ آرام
بہروادی رواں منہاد و بیکیں! کہ از مصر و گہ از بیت المقدس
سرشک آسارواں از سوزسینہ گہی در مکہ گاہی در مدینہ

اس طرح جمالی نے ہندوستانی صوفیاء وشعراء اور غیر ملکی صوفیاء اور شعراء کے مابین ایک رشتہ استوار کر دیا۔ اس نے کچھ شاعری ہندی میں بھی لکھی اور اسے گوایا۔ اس کی ایک نعت کا شمار بہترین فارسی نعتیہ شاعری میں ہوتا ہے۔

موسیٰ ہوش رفت یک جلوہ صفات
تو عین ذات مینگری در تبسمی

جمالی کی "سیدالعارفین" اگرچہ نقائص اور خطاؤں سے کاملتاً "بری نہیں" لیکن اس کا شمار کلاسیک ہندوستانی تذکرہ اولیاء میں ہوتا ہے۔

اپنے باپ کی نسبت سکندر لودہی کا مذہبی رویہ راسخ العقیدگی کا تھا۔ اس نے سالار مسعود کے جلوس جیسی مذہبی رسومات پر پابندی لگا دی کیونکہ اس شہید کی یاد میں ہونے والے ان تقریبات میں کافی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے عورتوں کی اولیاء کے مزار پر حاضری اور محرم میں تعزیہ میں شرکت پر پابندی لگا دی۔ اس راسخ العقیدگی کے اثرات ہندوؤں کے ساتھ معاملات پر بھی پڑے۔ اس کے ملک العلماء کو اسے مذہبی تقریبات کے لیے کرخات میں جمع ہونے والے ہندوؤں کے قتل سے باز رکھنا پڑا۔ تاہم اس نے کرشن کی جائے پیدائش متھرا کے کچھ مندر گرا دیئے جسے محمود غزنوی کے دنوں سے "کفر کی کان" سمجھا جاتا تھا۔ اس کانگر کوٹ کے مندروں کے پتھر گائے کے قصابوں کو گوشت کی سل کے طور پر دے دینے کا حکم خصوصاً سنگدلانہ تھا۔ لیکن اس کے عہد میں ہندوؤں کی نسبتاً زیادہ مقدار نے انتظامی اور ادبی زبان فارسی پڑھنا شروع کی۔

"سکندر کی وفات 1520ء میں ہوئی۔ اس کی وفات کے متعلق بیان کی جانے والی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا مست لوگوں کے کس درجہ قریب تھا۔ کہانی کے مطابق اس کی وجہ علالت ایک حاجی سے

بے التفاتی کا سلوک تھا۔ بحیثیت مجموعی سکندر کامیاب حکمران تھا لیکن اس کا بیٹا ابراہیم بالآخر 1526ء میں پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھوں شکست کھا گیا جس نے تیموری گھرانے کی اس بادشاہت کی بنیاد رکھی جسے مغل کہا جاتا ہے،،۔

پندرہویں صدی کے شمالی ہندوستان کا ایک رجحان خصوصاً مذہب کی تاریخ میں بہت اہم ثابت ہوا۔ مسلم ہند کے کونے کونے میں تصوف نفوذ کر رہا تھا جس کے ردِ عمل میں ہندومت میں بھی ایسی تحریکیں اٹھنے لگیں جن کا امتیازی رنگ جذباتیت کا تھا۔ یہ یقینی امر ہے کہ بھگتی تحریک، جس کا سرمایہ ادب مقامی زبانوں میں تھا، صوفیا کی تبلیغ سے انتہائی متاثر تھی۔ یہ تحریک خدا کی محبت کو زندگی کا مرکز ماننے پر زور دیتی تھی۔ جبکہ دوسری طرف صوفیا کے مجاہدوں اور ریاضتوں پر ناتھ سندھا کے اثرات پڑنے لگے۔ اس بنیاد پر اسلام اور ہندومت کا باہمی قرب ممکن نظر آنے لگا تھا۔ جس کی سب سے مضبوط بنیاد صوفیاء مثلاً رومی کا اپنی تصانیف میں انہیں خیالات اور تشکیلات کو بیان کرنا ہے جن سے کرشن کے ماننے والے بھی بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ پنجاب میں گورونانک اور کبیر نے ایسے مذہب کے گیت گائے جو ظاہری رسوم سے ماورا اور صرف محبت اور ایثار پر استوار ہو۔ کیا رام اور رحیم ایک ہی نہیں؟ کبیر نے اسلام کی ظاہری عبادات و رسوم سے بیزاری کا اظہار کیا ہے جو اس کے کئی دوسرے گیتوں کی طرح آدی گرنتھ میں شامل ہے۔

کبیر کی شاعری اس کے ماننے والوں کے لیے مرجع عقیدت بن گئی۔ وحدت ادیان میں خاصی کامیابی حاصل کرنے باوجود کبیر پنتھی کہلانے والے یہ لوگ بجائے خود ایک فرقہ بن گئے۔ شارلٹ واڈویل کے ترجمے کی روشنی میں جو کبیر سامنے آتا ہے، اور جس سے اہل مغرب واقف ہیں، مترنم اور مدہم لہجے کا صوفی ہے بجائے آتش عشق کے ایک مفکرانہ اور صوفیانہ خصائص کی حامل تحریک کے طور پر سامنے آیا۔ لیکن مغل دور میں یہی تحریک عسکری اور سیاسی قوت کی شکل اختیار کر گئی۔

مالوہ

تیمور کی یلغار کے بعد خود مختار ہو جانے والی ریاستوں میں دہلی کے جنوب کی ایک

ریاست مالوہ بھی شامل ہے۔ معیز الدین غوری کی اولاد میں سے ایک شخص دلاور خاں 1392ء میں مالوہ کا صوبیدار بنا۔ تیمور کی دہلی میں قتل وغارت کے دوران اس نے محمود تغلق کو پناہ دی۔ اس کے لیے ہوشانگ نے 1406ء میں اعلان خود مختاری کر دیا۔ اس نے اپنے دارالحکومت کو مضبوط بنایا اور یہاں ایک مسجد بنوائی جو پٹھان طرز تعمیر کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ اپنے ملک کی تجارت کو فروغ دینے کے خواہش مند ہوشنگ نے جیبوں کی حوصلہ افزائی جو پرانے وقتوں سے ماہر تاجر چلے آرہے تھے۔ محمود خلجی (1469ء۔1436ء) کے عہد میں مالوہ سلطنت اپنی وسعت کی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نے کوشش کی کہ مالوہ کی سرحدیں جونپور' گجرات اور دکن تک پھیل جائیں۔ محمود وسطی ہندوستان کے ان آخری حکمرانوں میں شامل ہے جنہوں نے عباسی خلافت سے واسطہ رکھا اور وہاں سے سند حاصل کی۔

اس دور کے اسلام کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو چمپانیر کے ہندو راجہ کا گجرات کے محمد شاہ کے حملے کے خلاف محمود سے مدد کی درخواست کرنا عام سا واقعہ ہے۔ مذہبی چہ میگوئیوں سے بچتے ہوئے اس درخواست کی پذیرائی کے لیے محمود نے علماء سے فتویٰ طلب کیا جنہوں نے ایک مسلمان کے خلاف کافر کی مدد کے حق میں جواز فراہم کر دیا۔ سیاست اور ذاتی حفاظت کو 'یقیناً' مذہبی تقاضوں پر برتری حاصل تھی یہی اصول محمود کے ہندوستان میں مندر تباہ کرنے' لیکن اپنے ملک میں انہیں باقی رہنے دینے میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

مالوہ کی طرف کھنچی چلی آنے والے مذہبی شخصیات میں نجم الدین غوث ازہر 1432ء میں فوت ہوئے تو ان کی عمر دو سو سال تھی تاہم بااثر ترین شخصیات اعلیٰ حضرت کے نام سے معروف شاہ عبداللہ شتاری اور ان کی مریدین کی تھیں۔ شتاری بایزید بسطامی کے روحانی متوسلین میں سے ہے۔ ان کا دعویٰ اناواحد لاشریک لی ہے۔ اسے یہ خدا سے وصال کی حالت بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بایزید کے سبحانی سے ماخوذ ہو۔ عبداللہ شتاری اپنے مریدین کے ساتھ ڈھول بجاتے اور علم لہراتے نکلتے۔ یہی ان کا لوگوں کو راہِ حق پر بلانے کا طریقہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یوگا کا مطالعہ کیا اور کچھ ہندی گیت بھی مرتب کئے۔ یہ روایت شتاریہ سلسلے میں آگے چلی۔ ان کی جہاں نوردی انہیں ایران اور بنگال تک لے گئی۔ ان کی وفات 1485ء میں ہوئی جس سے قبل ان کا سلطان غیاث الدین خلجی کو چتوڑ کے محاصرے کے دوران روحانی مدد دینا بھی مذکور ہے۔ جہانگیر نے مانڈو میں ان کے

مرقد پر مقبرہ تعمیر کردایا۔ مالوہ کی آزادی پہلی بار 1531ء میں سلب ہوئی جب اسے گجرات میں شامل کیا گیا۔ لیکن 1537ء میں اس نے اپنی آزادی' اگرچہ مختصر عرصے کے لیے' دوبارہ حاصل کرلی۔

جون پور

ہندوستانی اسلام کی تاریخ میں مالوے سے زیادہ اہمیت جونپور کو حاصل ہے۔ یہ شہر زیریں گپتی دریا پر 1359ء میں تعمیر کیا گیا۔ فیروز شاہ کے میر خواجہ سرا جونپور کے مدار المہام تھے۔ انہیں ملک اشرق کا لقب عطا ہوا اور تیمور کے حملے کے وقت خود مختار ہو گئے۔ اس کے بعد اس کا متبنی بیٹا کرنا فل مبارک کے نام سے 1400ء میں اس کا جانشین بنا۔ شرقی بادشاہوں میں سے اہم ترین ابراہیم شاہ تھا۔ جس کے مٹے ہوئے آثار آج بھی اٹالہ مسجد کی صورت ملتے ہیں۔ ابراہیم شرقی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں جونپور دہلی سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا اور یہاں جمع ہونے والے شمار علماء و فضلاء کے باعث شیراز ہند کہلانے لگا۔ اس عہد کے عظیم ترین علماء میں سے ایک ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی (متوفی 1445ء) تھے جنہوں نے صدر قاضی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ ان کی کتب میں سے' جو ہندوستان کے مدرسوں کے نصاب میں شامل ہوئیں' ایک "الارشاد" عربی نحو پر اور دوسری "شرح ہندی" ابن مسالک کی 'کافیہ" کی شرح ہے جسے عربی زبان کے قواعد کی معیاری کتاب مانا جاتا رہا ہے۔ دولت آبادی نے پزواری کی "اصول الفقہ" کی شرح اور قرآن کی ایک تفسیر "مواج" کے نام سے لکھی۔ بطور قاضی اس نے ابراہیم شاہ کے عہد میں ہونے والے فیصلوں کو "فتاویٰ ابراہیم شاہی" میں مرتب کیا۔ لیکن ابراہیم شرقی کی سب سے گہری وابستگی ایک ایسے عالم سے تھی جو درسی ماہر الٰہیات یا ماہر قواعد زبان سے کہیں بلند تر شخصیت تھی۔ تعلیم کے ابتدائی سال دہلی میں چشتی ولی چراغ دہلی کے دو خلفاء کے تحت گزارے اور تیمور کے حملے تک وہیں رہے۔ مسلم ہندوستان کے ہر تعلیم یافتہ شخص کی طرح قاضی نے فارسی میں کچھ شاعری بھی کی۔

شرقی نے کچھ صوفیاء کو بھی پناہ دی۔ سب سے پہلے تو چشتی ولی اشرف جہانگیر سمنانی تھے جنہوں نے ایران کی طویل سیاحت کی تھی۔ پہلے وہ کبروی ولی علاؤالدین سمنانی

کے شاگرد تھے۔ لیکن بعد ازاں ابن عربی کے متعلق ان کے منفی رویے سے بد ظن ہو گئے۔ وہ غالباً اپنے ہم مکتب سید علی ہمدانی کے ہمراہ ہندوستان وارد ہوئے۔ دونوں ایران سے تیمور کی آمد پر نکل آئے۔ بنگال میں حاکم پنڈوہ کے مرشد علاؤ الدین لاہوری بنگالی نے اشرف جہانگیر کو چشتیہ سلسلے میں بیعت کیا۔ پھر وہ ریاست جونپور میں ایسی جگہ آباد ہو گئے جہاں یوگی رہتے تھے اور جسے جنوں کا مسکن خیال کیا جاتا تھا۔ کچھوچھہ حصہ میں واقع ان کی خانقاہ پر آج بھی آسیب زدہ مخبوط الحواس لوگ صحت یاب ہونے کی امید میں حاضری دیتے ہیں۔ اشرف جہانگیر نے اپنے دلچسپ احوال "لطائف اشرفی" کی صورت میں چھوڑے۔ انہوں نے حضرت گیسو دراز جیسے صوفی معاصرین سے بلواسطہ خط و کتابت وحدت الوجود اور ایسے ہی دوسرے بلند موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ لیکن ان کی سیاسی حوالے سے بھی ایک اہمیت تھی۔ پنڈوہ کے قطب عالم نے اپنے پیر بھائی اشرف جہانگیر کو خط لکھا کہ وہ شرقی سلطان کو بنگال میں مداخلت پر قائل کریں کیونکہ بنگال کا راجہ گنیش مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ طاقتور شرقی حکمران کی مداخلت کی دھمکی ہی راجہ کو اپنے ارادوں پر عمل درآمد سے روکنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔

ابراہیم شرقی کے عہد میں کچھ چھ سے کچھ ہی فاصلے پر مغرب کی طرف رودلی میں چشتیہ سلسلے کے ایک صاحب مقیم تھے۔ احمد عبدالحق نامی یہ صاحب فرید الدین گنج شکر کے ایک شاگرد علی صابر سے روحانی وسیلہ رکھتے تھے۔ علی صابر کے نام کا آخری حصہ مشکلات میں ان کی بے پناہ برداشت اور شکر کے باعث ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ صابریہ سلسلہ کے متوسلین، جن کی عبا کا رنگ عنابی سے گلابی تک کی جھلک دیتا تھا، کا رویہ جلالی جبکہ نظام الدین اولیاء کے سلسلے نظامیہ کے وابستگان جمالی رویے کے حائل تھے۔ رودالی کے عبدالحق کا انتقال 1434ء میں ہوا۔ ان کے مریدین میں سے مشہور ترین عبدالقدوس گنگوہی ہوئے۔ انہوں نے اپنا پیر خانہ 1491ء میں چھوڑا اور دہلی کی قلمرو میں واقع گنگوہ میں آباد ہوئے۔ انہوں نے دہلی کے حکمرانوں، پہلے لودہیوں اور بعد ازاں مغلوں کو زوردار خطوط لکھے وہیں 1538ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندوستانی صوفیاء میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے زیر بحث وحدت الوجودی نقطہ نظر ان کی تصنیفات میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ ابنِ عربی کے دوسرے پیروکاروں کی طرح ظاہری رسوم و رواج کی پابندی کا التزام کرتے تھے۔ ابتدائی صابریوں کی

طرح ان کی "رشد نامہ" میں بھی ہندی اشعار اور ہتھیا یوگ کے خیالات ملتے ہیں۔ حالیہ برسوں کی تحقیقات میں حقیقت پر ان کے انداز فکر کو متصوفانہ اور مجذوبانہ قرار دیا گیا جو "فرزانگی" اور رویے کے برعکس ہے۔ اقبال اپنے لیکچروں کے پانچویں باب ان کے قول سے کرتا ہے۔

"محمدؐ عربی عرش معلٰی تک گئے اور لوٹ آئے' خدا ان کی جگہ میں ہوتا تو کبھی نہ لوٹتا"

صابریہ چشتیہ انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی خاصے طاقتور تھے۔ اس دور میں دو اہم افراد اس سلسلے میں داخل ہوئے۔ دیوا کے وارث شاہ (وصال 1903ء) اور دیوبند کے بانی۔ موخر الذکر کا زور اس سلسلے کی پابندی شرع پر تھا نہ کہ اس کے مفاہمانہ رویے پر۔

لیکن جب بھی پندرہویں صدی کے جونپور کا ذکر آتا ہے وسطی ہندی اسلام کی ایک مسحور کن شخصیت یعنی مہدی جونپوری کا نام ذہن میں ضرور آتا ہے۔ 1443ء میں پیدا ہونے والے سید محمد کاظمی چالیس برس کی عمر میں حج پر روانہ ہوئے۔ 1495ء میں مکہ میں دوران طواف انہوں نے اپنے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ مکہ کے علماء نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لیکن ہندوستان واپسی پر 1497ء میں احمد آباد میں سکونت اختیار کی تو اسے علماء کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لگتا تھا کہ گجراتی سلطان محمود بیگڑا نے اس کا دعویٰ کسی حد تک تسلیم کر لیا تھا لیکن علماء نے اس کی جلاوطنی بلکہ قتل تک کا مطالبہ کر دیا۔ ابو الفضل کے بقول "دنیا پرست تنگ ذہن علماء نے ہندوستان کی زمین ان پر تنگ کر دی" اور اسے ایک معذور کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا حتیٰ کہ 1505ء میں اس کا انتقال خراسان میں ہوا۔ اس نے بہت سے خلفاء چھوڑے جنہوں نے اس کا کام جاری رکھا۔

اس کے ماننے والے مردے زندہ کرنے اور نابیناؤں کو بینائی دینے جیسے بہت سے معجزے ان سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ صرف راسخ العقیدہ اور سنجیدہ صوفی تھے۔ بدایونی جیسا نقاد بھی سید محمد اور ان کے مریدین کے تقویٰ' علم اور اخلاص کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس کے بنیادی اصول بہر حال صوفیانہ ہی ہیں یعنی ترک دنیا (مالک نے اسے تلوار استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی)' توکل علی اللہ اور ذکر۔ اس نے صوفیانہ زندگی کے محور ذکر کو عقیدے کا مقام دے دیا۔ دوسرے صوفیاء کی طرح اس نے

بھی مادی سامان کی دائرے کے ارکان میں مساوی تقسیم پر زور دیا ہے جس کا مفصل حال بدایونی نے شیخ علائی کے بیان میں درج کیا ہے۔ ان کے ماننے والے عامۃ المسلمین سے الگ تھلگ پرامن طور زندگی بسر کرتے تھے۔

جب سید محمد کے مہدی ہونے کے دعویٰ کی بابت بدایونی سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غالباً یہ دعویٰ مذہبی معاملات پر اظہار خیال کو مستند اور معتبر بنانے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ ایم مجیب جیسے جدید محققین اس مسئلہ پر بدایونی سے متفق ہیں۔ سید محمد اپنے گرد کچھ وفادار مریدین اور سرگرم پیروکار جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے دعویٰ مہدویت کے باعث تخلیص اسلام کی کوشش اور اسلامی اصولوں پر گہری نظر کے باوجود راسخ العقیدہ لوگوں سے داد نہ وصول کر سکا۔ ان کے استغراق کلی سے متاثر ہو کر مہدی ہو جانے والوں میں سولہویں صدی کی کئی ممتاز شخصیات شامل تھیں۔ ان ہی میں سے ایک کالپی کے برہان الدین تھے جو سبزی خور تھے اور جن کا سو برس کی عمر میں 1562ء میں انتقال ہوا تھا۔ وہ ان ولی صفت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ہندی شاعری کی۔ مشہور شاعر محمد جائسی ان کے مرید تھے۔ اکبر کے معتمد دوستوں فیضی اور ابوالفضل کا باپ شیخ مبارک مہدیوں کے قریب بہر حال ضرور تھا لیکن اس کے سرگرم مہدی ہونے کا معاملہ یقینی نہیں۔ سوریوں' خصوصاً اسلام شاہ' نے مہدیوں کو سختی سے کچلا۔ مہدیوں نے سندھ اور گجرات میں دائرے قائم کئے۔ 1524ء میں مہدیوں اور گجراتی فوج کے درمیان ایک جنگ کا ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے اگرچہ بعد کے دو گجراتی بادشاہ احمد ثانی (1561ء۔1554ء) اور اس کے جانشین مظفر (1573ء۔1561ء) مہدوی رجحانات رکھتے تھے۔ یہی حال احمد نگر اور گولکنڈہ کے امراء کا بھی تھا۔ اس کا نتیجہ شیعہ نوواردان کے ساتھ ان کی بے شمار جھڑپوں کی صورت میں نکلا۔ مہدوی تحریک کے کچھ ذیلی گروہ اکبر کے عہد میں بھی جاری تھے۔ اس کے عہد میں روایت پسند محمد طاہر پٹنی سنی مہدی جدوجہد کی نذر ہو گیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں اس تحریک کو کچل دیا گیا اور اس کے وابستگان نے تقیہ اختیار کیا۔ دکن' میسور' گجرات' جے پور اور سندھ میں کچھ چھوٹے گروہ بچ گئے۔ کبھی کبھار مذہبی جنونیت کا شعلہ بہر حال بھڑک اٹھتا ہے۔ مہدویوں کا رویہ کچھ بھی رہا ہو بیشتر علماء کی رائے ہے کہ سید محمد جونپوری آخری وسطی دور کی حقیقی اسلامی زندگی کا بہترین اور مخلص ترین داعی اور محافظ تھا۔

کشمیر

اولین فارسی گو شاعروں نے کشمیر کے حسن سے مسحور ہو کر شاعری کی حالانکہ یہ علاقہ تادیر مسلم غلبہ سے باہر رہا۔ کشمیر میں شامل میدانی علاقوں اور دکن کی تاریخ کافی مختلف ہے۔ محمود غزنوی نے اس میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مقامی حکمرانوں کی حکومت 1320ء میں منگولوں کی یلغار تک جاری رہی جنہوں نے یہاں کی معاشرت تباہ کر کے رکھ دی۔ منگولوں کی یلغار سے کچھ پہلے یہاں بعض غیر ملکی بھی آباد ہو گئے تھے۔ سوات کے شاہ میر ان میں سے ایک تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کا تعلق ایک صوفی' غالباً قادری خاندان' سے تھا۔ اس نے سرکردہ خاندانوں سے بواسطہ مناکحت تعلقات بنائے۔ منگولوں کے جانے کے بعد جب بلتستان کے رنچان نے بادشاہت کا دعویٰ کیا تو شاہ میر اس کا وزیر ہو گیا۔ رنچان چونکہ برہمن نہ تھا' ہندوؤں نے اس کی بادشاہت قبول نہ کی۔ اسی باعث اس کا رجحان اسلام کی طرف ہو گیا جس کے اصولوں سے اس کا تعارف صوفی شرف الدین بلبل شاہ نے کروایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سہروردی ولی اللہ وادی میں اپنے ایک ہزار مریدین کے ساتھ وارد ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اپنے نئے نام صدرالدین سے حکومت جاری رکھی اور یہاں پہلی مسجد اور وسیع لنگر خانہ سری نگر میں بنوایا۔ بالآخر' کچھ گڑبڑ کے بعد' خود شمس الدین شاہ میر خود 1339ء میں تخت پر براجمان ہوا اس کے پوتے شہاب الدین (1374ء۔1345ء) کے عہد میں مضبوط اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔

شہاب الدین کے عہد میں خبریہ دعویہ سلسلے کے ایک اہم رکن سید علی ہمدانی 1371ء میں کشمیر وارد ہوئے۔ اس سے پہلے وہ اسلامی دنیا کی سیاحت کر چکے تھے کہا جاتا ہے کشمیر سے 700 سید ان کے ہمراہ چلے تھے۔ تاہم یہ تیمور کے خوف سے بھاگ کر پرسکون کشمیر میں آباد ہونے والے سیدوں کی آمد کی وضاحت میں گھڑی گئی کہانی بھی ہو سکتی ہے۔

علی ہمدانی کثیر التصانیف مصنف تھا۔ اس نے کئی علوم پر تحریریں چھوڑی جن میں ابن فرید کی روایات کے مرقعوں اور اس کے خمریہ کی شرح سے لے کر ابن عربی کی "فصوص الحکم" کی شرح اور بادشاہوں کے لیے ہدایت نامہ تک شامل ہیں۔ وہ خردمند لیکن نفسی اعتبار سے انتہائی مسحور کن خبریہ روایت کے نمائندہ تھے۔ وہ شہاب الدین کے جانشین

قطب الدین (1389ء۔1374ء) سمیت کئی کشمیریوں کے زیادہ باشعور مسلمان بننے کا وسیلہ بنے۔ سید علی کے مرید اور سوانح نگار بدخشی، جنہیں سلطان سکندر نے اپنا ایلچی بنا کر تیمور کی طرف بھیجا تھا، نے بیان کیا ہے کہ کچھ علماء ان کے مرشد کو زہر دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ کشمیری روایات میں ملنے والی ایک کہانی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے کہ ان کے مرشد کے برہمن یوگن اور کشمیری شاعرہ للا سے تعلقات تھے کہا جاتا ہے کہ وہ عریاں گھوما کرتی تھی مگر "جب اس نے علی ہمدانی کو دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ مرد ہے اور کپڑے پہن لئے" مطلب یہ کہ اس نے روحانیت کی آنکھ سے "مرد خدا" کو شناخت کر لیا۔ اسی لئے اقبال جن کے آباؤ اجداد کشمیری تھے، "جاوید نامہ" میں علی ہمدانی کو جنت میں دکھاتے ہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایک روز علی ہمدانی نے للا سے ملاقات کی تو وہ اس کے سامنے ایک تندور میں جا کودی اور دوبارہ اس کے سامنے جنت کے سبز لباس میں نمودار ہوئی۔

1385ء میں علی ہمدانی امیر کبیر کا انتقال سوات میں ہوا۔ لیکن اس کے مریدین سلطنت میں، جس کا بادشاہ اب شہاب الدین کا پوتا سکندر المعروف بہ بت شکن تھا، سرگرم رہے۔ سید علی کے بیٹے سید محمد نے اسکندر کے لیے تصوف پر ایک رسالہ تصنیف کیا جس پر اس نے انہیں ایک خانقاہ تعمیر کروادی۔ سکندر خالص مسلمان تھا اسے شراب اور دوسری خرافات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے برہموں کو دائرہ اسلام میں لانے کی کوشش بھی کی جس پر بقول فرشتہ، انہیں مختلف حیلے بہانے اختیار کرنا پڑے تاکہ تبدیلی مذہب سے بچ سکیں۔ دہلی اور دوسری جگہوں کی طرح اس نے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا اور فیصلہ کیا کہ روایتی قانون کی جگہ شریعت کا نفاذ کیا جائے۔ لیکن، بہت سی دوسرے جگہوں کی طرح، اس کا اطلاق بھی صرف شخصی قانونی معاملات تک محدود تھا۔

سکندر کا چھوٹا بیٹا زین العابدین (1470ء۔1420ء) بھی اپنے باپ کی طرح پڑھا لکھا اور متقی شخص لیکن، اس کے برعکس، اپنے نظریات میں خاصا روشن خیال تھا۔ اس نے قطب تخلص اختیار کیا اور فارسی میں شعر کہے۔ لیکن سنسکرت تصانیف کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کی سب سے بڑی دلچسپی اپنی رعایا کی فلاح تھی۔ اس کے پچاس سالہ دورِ حکومت کا تقابل تقریباً اتنی ہی مدت حکومت کرنے والے مغل اعظم اکبر سے کیا جا سکتا ہے بلکہ شائد اول الذکر کو کئی اعتبار سے فوقیت حاصل تھی۔ زین العابدین جو عموماً بادشاہ کہلواتا تھا، نے

عالمگیر رواداری کی حکمت عملی اپنائی۔ ایک مورخ واضح مایوس لہجے میں رقم طراز ہے:

"اس نے کفر و گمراہی کے قوانین کو رواج دیا اور بت پرستوں اور جہلا کو نوازا۔ اس نے سلطان سکندر کے عہد میں زمیں بوس کئے جانے والے مندروں اور غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر نو کروائی اور انہیں بحال کیا"۔

ہندوستانی رسوم ورواج اس حد تک رائج تھے کہ

"مسلم علماء، سید اور قاضی بھی بلا جھجک اِن پر عمل پیرا تھے"

زین العابدین نے جزیہ اور لاشوں کے جلانے پر عائد محصول ختم کر دیا اس نے ستی کی اجازت دے دی۔

اس کے خارجہ تعلقات کا مقصد مادی فوائد کی بجائے اقتصادی اور تمدنی ترقی تھا بڑے بڑے مسلمان حکمرانوں سے استدعا کر کے نایاب اسلامی کتب لائی گئیں اور سری نگر میں ان کی نقول تیار کی جا گئیں۔ اپنی رعایا کے لیے روزگار مہیا کرنے کی غرض سے اس نے کچھ لوگ سمرقند بھیجے کہ جلد بندی اور کاغذ سازی کا فن سیکھیں۔ اس نے دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کی جو بعد میں کشمیر کی شناخت بن گئیں۔ ایک روایت کے علی ہمدانی نے روایتی دستکاریوں میں سے ایک یعنی شال بافی متعارف کروائی۔ ادبی اور علمی اعتبار سے بھی اس دور میں خاصی ترقی ہوئی مہابھارت سمیت کئی سنسکرت تصانیف کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ دوسری طرف کئی اسلامی کتب کے سنسکرت ترجمے بھی ہوئے۔ شاعروں نے، جن میں سے کئی صوفی تھے، کشمیر کی فارسی شاعری کا آغاز کیا۔ ان میں خدامست شاعر سید محمد عظیم اویسی (متوفی 1484ء) بھی شامل ہیں۔ ایک اور مجذوب نورالدین تھے جنہیں للا کا روحانی فرزند بھی کہا جاتا ہے اس نے رشی سلسلہ بھی قائم کیا۔ انہوں نے تادیر ایک غار میں گزاری جہاں مجاہدے میں معروف رہے۔

بعد میں آنے والے سینکڑوں زاہدوں اور مرتاضوں نے اس کا طرز زندگی اپنایا۔ 1438ء میں ان کا انتقال ہوا تو بادشاہ زین العابدین نے بھی جنازے میں شرکت کی۔

زید العابدین کی وفات کے بعد شاہ میر دورِ حکومت عملاً ختم ہو گیا اگرچہ نام کو 1561ء تک جاری رہا۔ کشمیر میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کی ایک وجہ وادی میں ایک نئے فرقے

کی آمد تھی۔ شمس الدین عراقی کا قائم کردہ سلسلہ نور بخشیہ یہاں 1484ء میں پہنچا نور اللہ شستری کی "مجالس المومنین" کے مطابق سید نور بخش (1464ء-1392) سید علی ہمدانی کے مریدین کی دوسری نسل سے تھے جس نے اپنی زندگی کے آخری دور میں خلیفۃ المسلمین ہونے کا دعویٰ کیا اور دعویٰ بردار سکے بھی جاری کئے جس پر اسے شاہرخ نے قید کر دیا۔ اچھے شیعہ کی طرح نور بخش کا عقیدہ تھا کہ امام کو علی اور فاطمہ کی اولاد سے ہونا چاہئے لیکن حکومت کے لیے اسے ولی بھی ہونا چاہئے۔ لگتا ہے کہ یہ تحریک زیادہ تر شیعہ صوفی تحریک تھی نور بخشیوں کو چاک برادری میں خاصی پذیرائی ملی۔ اس کے بعد نور بخشیوں اور حنفی سیدوں کے درمیان ہونے والی جدوجہد کے نتیجے میں بادشاہ روز روز بدلنے لگے۔ جو فرقہ غالب آتا اپنے ہم مسلک کا بادشاہ بنا دیتا۔

"بہارستان شاہی" کا مصنف دعویٰ کرتا ہے کہ وادی کے باشندے جو اسلام اور ہندومت کے درمیان معلق تھے بالآخر نور بخشیوں کے باعث سچے مسلمان بن گئے۔ دوسری طرف تیموری شہزادہ مرزا حیدر دغلت، جس نے 1541ء میں کشمیر پر چڑھائی کی، کشمیریوں کی مذمت کرتے ہوئے انہیں کٹر بدعتی قرار دیتا ہے اس کے نزدیک ان کی مقدس کتاب "فقہ الاحوات (جو شیعہ فقہ کی کتاب ہے) بدعت والحاد کا مجموعہ ہے" کٹر سنی شہزادہ اپنا بیان یوں جاری رکھتا ہے

> "بہت سے کشمیری جو اس کفر سے وابستہ ہو چکے تھے راہ راست پر لائے گئے۔ کچھ برضا و رغبت مائل ہوئے کچھ پر جبر کرنا پڑا۔ بہت سوں کو میں نے ذبح کر دیا، بہت سوں نے تصوف میں پناہ لی اور صوفی ہو گئے" (تاریخ رشیدی، مرزا حیدر دغلت)

چاک نے 1561ء میں اقتدار سنبھالا لیکن 1568ء کی شیعہ سنی منافرت کو نہ روک سکے۔ کشمیر کے تخت نشینوں میں سے پرکشش ترین شخصیت یوسف بادشاہ (1586ء-1599ء) کی تھی۔ جس کی وجہ شہرت خداداد صلاحیتوں کی حامل کشمیری شاعرہ حبہ خاتون سے شادی کی تھی جب اکبر نے اس کے خاوند کو قید کیا تو یہ خاتون جوگن بن گئی اس نے خاوند کی جدائی میں دل کی گہرائی میں اتر جانے والے گیت لکھے۔

یوسف اور اس کے جانشین یعقوب کے مخالفین کی قیادت سیدوں خصوصاً دو

دانشوروں کے ہاتھ میں تھی ان میں سے ایک بابا داؤد خاکی (متوفی 1586ء) رشی مخدوم حمزہ کے مرید تھے جن کی مثنوی ہندوستانؒ کی بیشتر روحانی مثنویوں کی طرح مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی۔ اکبر کو بھجوائی جانے والی درخواست میں بابا داؤد کے شریک کار سری نگر کے یعقوب صرفی تھے۔ یعقوب صرفی نہ صرف علم الحدیث میں باقاعدہ ابن حجر کا تربیت یافتہ تھا بلکہ تصوف کے پانچ بڑے سلسلوں میں بھی بیعت تھا اور اوسط درجے کی شاعری کرتا تھا۔ اکبر نے 'بالآخر 1589ء میں کشمیر کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور یہ ملک مغلوں کی پسندیدہ آرام گاہ بن گیا۔

بنگال

2-1201ء ہی میں محمد بختیار خلجی برصغیر کے مشرقی حصے بنگالہ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اولیاء اور جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ 1230ء میں التمش بنگال میں لکھنوتی تک آ گیا جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک بنگال کا دارالحکومت رہا۔ شہر اور اس کے گردونواح میں اولین ہند مسلم طرز پر تعمیر کی نمایاں اور عمدہ مثالیں ملتی ہیں جو اس بے سنگ سرزمین پر اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں۔ کاشتکاروں کے لیے جو زیادہ تر بدھ تھے 'مسلمانوں کی آمد برہمنی استبداد سے مژدہ آزادی کے مترادف تھی (یہ ایک طرح سے سندھ کی آٹھویں صدی کی صورتحال سے مماثلت رکھتی تھی)۔ اسی باعث بڑے پیمانے پر تبدیلی مذہب ہوئی۔ کچھ علاقوں میں تو ایسا ہوا کہ معاشرت تقریباً مظاہر پرست تھی لیکن اسلام کو انتہائی سطحی طور پر قبول کر لیا گیا۔ منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام طویل عرصے تک صرف نچلی ذاتوں تک محدود رہا اور اکثر و بیشتر اجتماع الضدین کی شکل اختیار کر گیا۔ دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی اسلام صوفیاء نے پھیلایا۔ سہروردی صوفی جلال تبریزی (متوفی 1244ء) نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان کے زیر اثر ایک تذکرہ الاولیا سنسکرت میں سہک تجودھیہ کے نام سے لکھا گیا۔ سہلٹ میں ان سے وابستہ حجرہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔

تدریس حدیث کو بھی بنگال میں نسبتاً جلد فروغ ملا۔ نو مسلموں کے اس ملک میں پیغمبرؐ کی مثالی زندگی کے اتباع کے لیے اس علم کی ضرورت بھی تھی۔ اس شعبہ اسلام میں سونار گاؤں کے ابو توام معروف عالم تھے جن کی شہرت کو چار چاند ان کے داماد بہار کے عظیم

صوفی شریف الدین یحیٰ منیری نے لگائے۔ در حقیقت بنگال اور بہار کی قسمت باہم منسلک تھی بر صغیر کے ان حصوں کے اولیاء اور علماء کے باہم گہرے مراسم تھے۔ 1340ء میں بنگال پہنچنے والے ابنِ بطوطہ لکھتے ہیں کہ بنگال کے سلطان فخر الدین غریب الدیار لوگوں' خصوصاً فقراء اور صوفیاء' پر مہربان تھے۔ یہ واقعہ بنگال پر ڈیڑھ سو سالہ ترک حکومت کے ختم ہونے سے پہلے کا ہے۔ جب فیروز شاہ تغلق کے دور کے آغاز میں' بنگال آزاد ہوا تو نیا دارالحکومت پندوہ بنا۔ حکمرانوں نے اپنے اس پایہ تخت کو بڑی بڑی اور مزین مساجد سے سجایا جن میں سے آدینہ مسجد کی محرابیں "ختم نہ ہونے والی قطاروں" کی صورت تھیں۔ پہلے آزاد حکمران الیاس شاہ نے 1352ء میں لکھنوتی' جنوبی مغربی ست گاؤں اور جنوب مغربی سونار گاؤں کو اکٹھا کر کے ایک ریاست بنائی۔ اس کے بارے میں ستارہ فیروز شاہی میں ایک عجیب کہانی بیان کی گئی ہے۔ مصنف دعویٰ کرتا ہے کہ حاجی الیاس شاہ کو جزام لاحق تھا۔ جب فیروز شاہ تخت پر بیٹھا تو

> "الیاس نے شفایابی کے لئے دعا کی غرض سے سالار مسعود کے مزار پر حاضری کا بہانہ بنایا اور براستہ بنارس بہرائچ پہنچے۔ خوف تھا کہ وہ زیادہ مقدس درگاہ نظام الدین اولیاء پر دعا کے بہانے دلی کا رخ بھی کر سکتا ہے"

اگرچہ کہانی کی حقیقت پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن یہ سیاسی عزائم کو مذہبی بھیس دینے کی عمدہ مثال ہے۔

مسلم بنگال کی تاریخ کے پہلے یعنی ترک دور میں ایرانی نمایاں رہے۔ لیکن آزاد حکمرانوں نے مقامی زبانوں کی حوصلہ افزائی کی اور سنسکرت تصنیفات کے بنگالی تراجم بھی کروائے۔ آزاد دور کے سب سے ممتاز ولی چشتی نور قطب عالم (متوفی 1416ء) پندوہ ہی ہیں۔ یہ بنگلہ اور فارسی دونوں کے اچھے شاعر تھے اور انہوں نے بنگالی ریختہ کا آغاز کیا جس میں ایک مصرعہ بنگالی اور ایک فارسی میں ہوتا تھا۔ سلطان غیاث الدین شاہ (1398ء۔1409ء) ان کے بہت قریب تھا۔ سلطان کی وفات کے بعد جب ہندو ہمسایہ راجہ گنیش نے پندوہ پر قبضے کی کوشش کی تو قطب عالم نے اپنے پیر بھائی اشرف جہانگیر سمنانی کی وساطت سے ابراہیم شرقی حاکم جونپور کو گنیش کے خلاف پیش قدمی پر آمادہ کر لیا۔ کم از کم بیان شدہ موقف یہی ہے۔ بصورتِ دیگر قطب عالم نے حکومتی معاملات سے علیحدگی کی چشتیہ روایات کے مطابق

کنارہ کشی کو ترجیح دی ہوتی اور اپنی تصنیفات میں مذہب درد کا تلذ ذبیان کیا ہوتا تاہم لگتا ہے کہ راجہ اس صورت حال سے دب گیا اور صوفی سے امن کا طالبگار ہوا۔ معاملہ راجہ کے چھوٹے بیٹے کے حلقہ بگوش اسلام ہونے پر طے پا گیا۔ یہ لڑکا فی الواقعہ مسلمان ہوا اور 1418ء میں جلال الدین کے نام سے پندوہہ کے تخت پر بیٹھا جلد ہی اس نے اپنا دارالحکومت پندوہہ سے گور منتقل کر لیا۔ کچھ سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ جلال الدین نے اپنے لیے لقب خلیفۃ اللہ منتخب کیا۔ اس سے نہ صرف اس کے اسلامی اوصاف پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اپنے حریف ابراہیم شرقی کے خلاف اپنے عوام کو اسلام کے نام پر متحد کرنے کی خواہش کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ کئی ایک عمدہ عمارات سے جڑا گور ایک تمدنی مرکز بن گیا۔ جہاں محمد ساغر کی یوسف زلیخا کی طرز پر مسلم بنگالی رومان لکھے گئے۔ کسی زین الدین (متوفی 1480ء) نے معراجِ رسولؐ پر "رسول ویاج" لکھی۔ اس کی طرز پر بعد ازاں کئی رزمیے لکھے گئے۔ سہروردی مبلغ پیر بدر کی سرگرمیاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اسے شریف الدین مانیری نے بہار بلایا لیکن بدر کے پہنچنے سے پہلے چل بسا۔ پیر بدر بنگال کو نکل گئے اور چٹاگانگ میں بے شمار ملاحوں کو مسلمان کیا۔ اس کی وفات بہار میں 1440ء میں ہوئی۔

حکومتی تسلسل منقطع ہونے کے بعد سید علاؤالدین حسین 1493ء میں وزیر سے بادشاہ بن گیا وہ ایک عظیم معمار تھا اور بنگال کی سب سے بڑی مسجد ست گنبد اسی کے عہد میں ضلع کھلنا میں تعمیر کروائی گئی تھی۔ اس نے دارالحکومت میں ایک مسجد قدم رسولؐ بھی بنوائی اس میں رسول اللہؐ کا نقشِ پا محفوظ کیا گیا تھا جو روایت کے مطابق مخدوم جہانیاں عرب سے لائے تھے۔ اس طرح کے نقشِ پائے رسولؐ بعد ازاں ڈھاکہ اور نبی گنج میں بھی رکھے گئے۔ علاؤالدین حسین کے پرامن دورِ حکومت اور موثر انتظامیہ میں مسلم بنگالی ادب مسلسل پھلتا پھولتا رہا۔ خطاطی کے اسلامی فن میں ہمہ جہت ترقی ہوئی جس کا ثبوت حسین شاہی دور کی باوقار اور خوش نظر کنندہ کاری سے ملتا ہے۔ تصوف اور ویشنو کی روایات کا ملاپ اس دور کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ذہن میں رہے کہ یہی دور بنگال کے عظیم وشنو صوفی چیتانیہ (متوفی 1575ء) کا بھی تھا۔ شیخ فیض اللہ کی اجتماع الضدین کتاب ساتیہ پیر (1575ء) قدرے بعد کے دور کے ایسے ہی رجحانات کی گواہی ہے جیسا کہ ایک بنگالی مورخ لکھتا ہے۔

"خالص اسلام لوگوں میں مروج نظر نہیں آتا...... عامۃ الناس کا

مذہب اسلام اور دوسری روایات کا ملغوبہ ہے"

سید سلطان اور شیخ زاہد جیسے صوفی مصنفین کے کام سے پتہ چلتا ہے کہ صوفیاء میں عرصے سے سانس کی مشقوں جیسی یوگ اور تانترہ ریاضتیں روج تھیں۔ خصوصاً کنڈالنی یعنی ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں چھپی طاقت پر مفصل نظری بحثیں خاصی دلچسپ اور اہم ہیں۔ اس دور کے ہندو مصنفین اس امر کو افسوسناک انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پندرھویں صدی کے خاتمے پر "مقدس برہمن بھی مسلمانوں کی طرح رومی کی مثنوی پڑھتے نظر آتے ہیں" بال نامی اس گروہ کی خوش کن شاعری کے تصورات اور خیالات مولانا روم سے ماخوذ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جب انسان کے دل میں رہنے والے محبوب اعلیٰ، عاشقِ خاکی اور حقیقت اصل میں عشقِ حقیقی، جسم کے کائنات صغیر اور پھر راہ ہدایت میں مرشد کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے رومی کی شاعری یاد آجاتی ہے۔

سلطان علاؤالدین حسین نے جونپور کے آخری سلطان کو پناہ دے کر سکندر لودھی کے غیظ و غضب کو ہوا دی اور اس نے بنگال پر چڑھائی کر دی۔ علاؤالدین کے سولہ بیٹوں میں سے ایک 'محمد سوئم غیاث الدین کو شیر شاہ سے مقابلہ کرنا پڑا جس نے بہار میں واقع اپنے مستقر سے نکل کر **1538**ء میں بنگال پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے بنگال کی صورت حال متزلزل ہو گئی حتیٰ کہ **1595**ء میں اسے مغل سلطنت میں ضم کر لیا گیا۔ اس کی حیثیت صوبہ بنگال کی ہو گئی تاہم اس کے بنگالی اور فارسی ادب میں اضافہ ہوتا رہا۔ سولھویں اور سترہویں صدی میں خصوصاً بندرگاہ پر بسنے والے ایرانی تاجروں کی وجہ سے شیعہ رجحانات میں مضبوطی آئی۔ مختلف حصوں میں بننے والی پرتگیزی بستیوں سے بھی بنگالی تمدن میں نئی جہات کا اضافہ ہوا۔

ملک کے مشرق میں واقع بعید ترین علاقے آسام میں پہلے مسلمان **1203**ء میں پہنچے۔ **1257**ء کے بعد سے ان کا تعلق مسلم دنیا سے قائم رہا۔ سیدوں نے اہم معاشرتی کردار ادا کیا۔ لیکن یہاں اسلام کے واضح آثار سترہویں صدی کے بعد نظر آنا شروع ہوئے۔ آسام میں اسلام کی ترویج میں اہم کردار ایک بار پھر صوفیاء نے ادا کیا۔ یہاں فیصلہ کن کردار ایک صوفی شاہ میلان المعروف بہ اذان فقیر کا نظر آتا ہے۔

دکن

بہمنی سلطنت

دلی کے بے سکت ہونے کے بعد دکن کی ریاستیں فیصلہ کن سیاسی قوتیں بن گئیں کیونکہ تیمور کی یلغار ان تک نہیں پہنچی تھی۔ دیوگر پہلی ریاست تھی جسے سلاطینِ دہلی کو خراج دینا پڑا۔ اسے 1294ء میں علاؤالدین خلجی نے مغلوب کیا تھا۔ چوبیس سال کے بعد اسے باقاعدہ طور پر سلطنتِ دلی میں ضم کر لیا گیا۔ دیوگر کو 1327ء میں دولت آباد کا نام دیا گیا اور محمد ابنِ تغلق نے دانشورانِ دلی کے ایک بڑے حصے کو یہاں لا کر آباد کیا۔ یوں اس نے نہ صرف اسلامی تمدن کے فروغ بلکہ سیاسی مرکز کے طور پر جنوبی ہند کے اہم مراکز میں سے ایک کی بنیاد رکھی۔ محمد تغلق کے عہد میں دکن کے امراء نے 1347ء میں اسماعیل مُکھ کی زیرِ قیادت بغاوت کر دی۔ کچھ ہی عرصے بعد حسن گنگو کو علاؤالدین حسن بہمن شاہ کے نام سے بادشاہ بنایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملے میں اسے پشاور کے ایک ولی سراج الدین جنیدی کی روحانی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ جنیدی ان لوگوں میں سے تھے جنہیں دلی سے لا کر یہاں آباد کیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ ....

> ”نظام الدین اولیاء نے بھی بہمن شاہ کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کی تھی۔ تخت نشینی کے بعد اس نے نظام الدین کے نام پر چار سو طلائی اور ایک ہزار نقرئی سکے خیرات کیے“

ایک اور موقع پر اس نے ”صالحین کو تحائف سے لاد دیا“ مورخ اِصمی، جو دلی سے لائے گئے اکابرین میں شامل تھا، نے اپنی ”فتوح السلاطین“ کا انتساب بادشاہ کے نام کیا۔ ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان پر وقائع کی اس اہم کتاب میں وہ سلطان کے لیے دعاگو ہے:

> ”میں اللہ تعالیٰ سے، جو خالق کائنات ہے، دعاگو ہوں کہ آنے والے زمانوں میں تیرا نام دور و نزدیک مشہور ہو“

اس کی دعا بظاہر قبول ہوئی۔ زیادہ تر دکن کی سطح مرتفع پر مشتمل اس نئی سلطنت کا مرکز گلبرگہ، احسن آباد تھا۔ جسے 1376ء میں دوسرے بادشاہ محمد شاہ اول نے ایک عظیم

الشان مسجد سے مزین کیا جس کا طول و عرض بالترتیب 211 اور 176 فٹ تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر قازوین سے آیا۔ جس کی شہادت اس کے گنبدوں کی ساخت سے ملتی ہے۔ محمد شاہ نے اپنے پیش روؤں کے روحانی پیشواؤں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے۔ جب بھی کسی مہم پر جاتا ان کی دعاؤں کا طالب ہوتا اور ایسی مہموں کی کمی نہ تھی۔ خصوصاً جنوب کی ہندو ریاست وجے نگر کے ساتھ ان کی چپقلش تھی، تمدنی زندگی پھلی پھولی، اسلامی علوم کو ترقی ملی۔ اس کے جانشین نے حافظ شیرازی کو دعوت بھیجی کہ وہ ہندوستان آ کر اس دربار سے وابستہ ہوں۔ فرید الدین راؤ (1369ء۔1302ء) اتنے بارسوخ اور سرگرم صوفی تھے کہ سلطان محمد کو ترک شراب کا سرعام کہہ سکتے تھے۔ اور پھر ایک اور صوفی عین الدین گنج عالم (1392ء۔1306ء) تھے جو گجرات سے گلبرگہ آئے اور "ہندوی" میں صوفیانہ خیالات پر پہلی کتاب تصنیف کی۔ ایک صدی بعد محمد گوان نے اس ولی اللہ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔

بہمنی سلطنت کا ممتاز ترین حکمران تاج الدین فیروز شاہ (1422ء۔1397ء) تھا۔ یہ اتنا ہوشیار تھا کہ اپنا ایک ایلچی تیمور کی خدمت میں بھیجا کہ اپنے شاہی لقب کی توثیق کروا سکے۔ چنانچہ دکن تیموری یلغار سے بچا رہا اور امن کی برکات سے مستفید ہوا۔ عالم ترین ہندوستانی بادشاہوں میں سے ایک فیروز شاہ جنوبی ہند کی زبانوں کا اتنا ماہر تھا کہ اپنی حرم سرا کی خواتین سے اس کی مادری زبان میں گفتگو کرتا۔ اسے عربی پر بھی عبور حاصل تھا۔ نامور علماء کو دربار میں لانے کے لیے جہاز بھجوایا کرتا۔ عربی زبان میں دلچسپی جنوب ہندی مسلمانوں کے تمدن کا اہم جزو ہے اور عین فطری بھی ہے۔ جزیرہ نمائے عرب اور ہندوستان کے مغربی سواحل، جو اب جزواً بہمنی سلطنت میں شامل تھے کے روابط قبل اسلام سے چلے آ رہے تھے۔ دوسری طرف سلطنت دہلی کے مراسم ایرانی، وسطی ایشاء سے زیادہ مضبوط تھے جہاں سے ان کے فاتحین اور زیادہ تر اولیاء و صوفیاء آئے تھے۔ فیروز شاہ کے عہد میں عربی قواعد، لغات اور ادب عالیہ کے ایک ماہر بدر الدین الدمیمی گجرات سے گلبرگہ آئے۔ ان کا انتقال 1424ء میں ہوا۔

کچھ دیر پہلے ہی محمد گیسو دراز گلبرگہ میں آباد ہو چکے تھے۔ یہ چشتی صوفی، جن کا بچپن دولت آباد میں گزرا تھا دہلی آئے اور چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ بن گئے۔ بعد ازاں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح تیمور کے حملے کے باعث دہلی چھوڑی اور پہلے گجرات پھر

بھمنی چلے گئے۔ کچھ وجوہات کی بناء پر فیروز شاہ ان کی موجودگی پر مطمئن نہیں تھا لیکن اس کے چھوٹے بھائی نے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس عمر رسیدہ صوفی کی خدمت سے فیض پایا۔ شہاب الدین احمد کی 1422ء میں تخت نشینی کے فوراً بعد آپ کا انتقال ہوا۔ بادشاہ کو شدید صدمہ ہوا اور اس نے قبر پر خوب صورت مقبرہ تعمیر کروایا۔ شہاب الدین احمد نے جلد ہی اپنا دار الحکومت آگے شمال کی طرف بدار میں منتقل کر لیا۔ جس کی نہایت مضبوط قلعہ بندی کی گئی خود احمد کو دکن میں ولی خیال کیا جاتا ہے اسے مسلمان حضرت احمد شاہ ولی اور ہندو الن پر بھو کہتے ہیں۔

سید محمد گیسو دراز بندہ نواز نہایت قادر الکلام مصنف اور متشرع صوفی تھے۔ شارحین حدیث میں ان کا مقام نمایاں ہے۔ انہوں نے "مشارق الانوار" اور "فقہ اکبر" کی تشریح لکھی۔ انہوں نے سلسلہ چشتیہ کی صوفیانہ کتب پر حواشی بھی تحریر کئے۔ پھر ابن عربی کی طرف متوجہ ہوئے جس کے اثرات ہندوستانی معنوف اور خصوصاً چشتیہ پر بڑھتے جا رہے تھے۔ تاہم حضرت گیسو دراز نے اپنے پیر بھائی دہلی کے مسعود بک اور اشرف جہانگیر کچھوچھوی سے خط و کتابت میں وجودی وحدت پر تبادلہ خیال میں اپنے خدشات کا ظہار کیا۔ ان میں سے اول الذکر وحدت الوجود کے سرگرم حامی تھے۔ حقیقت اور شریعت کے درمیان تعلقات پر ان کی رائے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس درجہ پابند شرع تھے۔ یہ سلسلہ ہندوستانی اسلام میں موضوع بحث بنا ہوا تھا کیونکہ اس کا تعلق یوگیوں کے معجزات اور ریاضتوں پر مسلم رد عمل سے تھا۔

کٹڑ سنی اسلامی اور ہر دوسرے مذہب و مسلک کے درمیان خط امتیاز ایک صوفی نے کھینچا جس نے صوفیانہ محبت کا اظہار خوب صورت فارسی شاعری میں کیا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے ملفوظات "جوامع الکلیم" میں ہندی کی تعریف کرتے ہوئے اسے شاعری کی زبان قرار دیا جو "انسان کو انکسار اور خود سپردگی پر مائل کرتی ہے" تاہم انہوں نے گیتوں کے لیے فارسی زبان کا انتخاب کیا۔ اپنے ایک گیت میں وہ سنائی کی "حدیقۃ الحقیقۃ" کے ایک مصرع کو یوں استعمال کرتے ہیں۔ محبت ان کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔

احمد غزالی اور عراقی کے اتباع میں وہ بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ عشق الٰہی کے حصول کا ایک راستہ حسن انسانی بھی ہے۔

انانکہ بجام عشق ستند بے ہوش زبادہ الستند
برلوح و جود ہرچہ دیدند جز نقش نگار پاک شستند
از کرسی عرش درگز ششند در غرفہ لامکاں نششد

ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ صوفیانہ شاعری سے الہیاتی نظام کے استخراج سے بچنا چاہئے کیونکہ طے شدہ تشبیہہ و استعارہ کے باعث باشرع صوفی بھی اپنے سکر میں بادہ و ساغر کا ذکر کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس سے قطع نظر کہ گیسو دراز کی اپنی رائے کیا تھی' اس کی طاقتور اور پر تاثیر شخصیت کے باعث دکن کے لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ گلبرگہ کا سفر بھی حج مکہ کے سے روحانی فوائد کا حاصل تھا۔

حضرت گیسو دراز کے علاوہ بھی بہمنی سلطنت میں کئی اولیاء مشہور ہوئے۔ وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ایک اور مذہبی میر نور اللہ بدار میں وارد ہوئے جن کے دادا نعمت اللہ کرمانی ایرانی ولی تھے۔ ہندوستان 1800 کے بعد تک اس سلسلے کا مرکز تھا۔ جس کے بعد وہ دوبارہ اسے ایران لے گئے اور وہاں ایک نئے سلسلے کی بنیاد رکھی۔ احمد شاہ نے انہیں خود داخل دربار ہونے کی دعوت دی تھی۔ لیکن انہوں نے بجائے خود آنے کے شیعہ درویشوں کی علامت بارہ نوکوں کا ایک سر تاج بھجوادیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے خلیل اللہ (متوفی 1460ء) نے احمد شاہ کی دعوت قبول کرلی۔ انہیں بہت تعظیم دی گئی اور نہ صرف ایک مسجد ان کے لیے تعمیر کی بلکہ اپنی ایک بیٹی بھی ان کے نکاح میں دی۔ انہیں دربار میں سب سے بڑا عہدہ دیا گیا۔ اس کے بعد سلطنت میں شیعہ اثرات پھیلنے لگے۔

یہ شیعہ اثرات ریاست کے لیے مہلک ثابت ہوئے کیونکہ فوج اور امراء دو فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک فرقہ جنوبی ہند کے سنیوں کا تھا جنہیں حبشہ کے تنخواہ دار فوج کی حمایت بھی حاصل تھی اور دوسرا فرقہ غیر ملکیوں پر مشتمل تھا جن میں ایرانی' ترک اور وسطی ایشیاء کے دوسرے علاقوں کے لوگ شامل تھے ان میں غالب تعداد شیعوں کی تھی۔ بدار میں جنم لینے والی یہ کشیدگی بعد میں بننے والی ریاستوں میں بھی قائم رہی۔ علاؤالدین احمد ثانی (جس نے دولت آباد میں چاند مینار بنوا کر اسلامی فن میں حصہ ڈالا) غیر ملکی سیدوں کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا یہی غیر معمولی تکریم مقامی امراء کے ہاتھوں 1450ء میں ان کے قتل عام کا سبب بنی۔ یہ قتل عام بالآخر خود ان کے زوال پر منتج ہوا۔ ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے بعد

بدایونی دکنیوں کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ایسے سرکش اور جارح قرار دیتا ہے جو غیر ملکیوں کو قتل کرنے کے عادی ہیں۔

تاہم بہمنی سلطنت اپنے بام عروج پر بھی ایک غیر ملکی کے عہد میں پہنچی۔ عماد الدین محمود گوان کا تعلق رشت سے تھا اور شاہ نعمت اللہ کے پوتے کے مرید تھے۔ سیدوں کے قتل عام کے جلد بعد 1453ء میں دکن پہنچے۔ کچھ مدت کے بعد وزیر بنے اور ملک التجار کا خطاب پایا۔ جب محمد شاہ سوئم تخت نشین ہوا تو کم سن تھا۔ اسی باعث اگلے اٹھائیس برس تک اصل حکمرانی عماد الدین کے ہاتھ میں رہی۔ اس کی بدولت بہت سے علماء بدار پہنچے جہاں اس نے ایرانی ماہرین تعمیرات اور کاریگروں سے ایک چار ایوان مدرسہ بنوایا تھا۔ 1472ء میں مکمل ہونے والے اس مدرسے کو محمود گوان نے لاتعداد کتب فراہم کیں۔ بذاتِ خود اس نے مکتوب نگاری پر عربی میں "ریاض الانشاء" تصنیف کی۔ 1481ء میں اس کامیاب وزیر کو ایک غدارانہ سازش میں قتل کر دیا گیا۔ مورخین متفق نہیں آیا کہ وہ سنی تھا یا شیعہ جس نے بہت کامیابی سے تقیہ کیا ہوا تھا۔

محمود گواں نے ایک نوعمر غلام یوسف کو اپنا متبنٰی بنایا تھا۔ مورخین کے مطابق وہ عثمانی سلطان مراد ثانی (متوفی 1451ء) کی اولاد ہونے کا دعویدار تھا جسے اس کے بھائی کی تخت نشینی کے وقت باہر ایران میں ملک بدر کر دیا تھا اس نے ایران ہی میں تعلیم پائی تھی۔ اس کے دعویٰ کی تاریخی پرکھ کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاہم اس نوجوان کو بالآخر دکن کا کامیاب حکمران بننا تھا۔ اپنے آقا کی وفات کے بعد اس نے بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔ محمود گوان کی وفات کے بعد نوجوان بہمن شاہی سلطان اپنی سلطنت میں توسیع تو کیا کرتا' اسے بچا بھی نہ سکا۔ جلد ہی یوسف عادل شاہ اول' بدار کی عماد شاہی سلطنت کا بانی' عماد الملک خود مختار ہو گیا۔ 1500 کے اوائل ہی میں دکن پانچ بادشاہتوں میں بٹ گیا جن میں سے دو یعنی عماد شاہی اور بدار کی بادشاہی کو جلد ہی احمد نگر کی نظام شاہی نے ضم کر لیا۔

احمد شاہی کا بانی بھی محمود گوان کا چہیتا تھا۔ ملک حسن بحری وجے نگر کے برہمن کا بیٹا تھا جس نے اسلام قبول کیا اور بعد ازاں' 1490ء میں' احمد نظام شاہ کے نام سے احمد نگر کا خود مختار حکمران بن گیا۔ اس سلطنت کے دوسرے حکمران برہان الدین (1553ء۔1509ء) نے ایران سے آنے والے ایک شیعہ کے زیر اثر مسلک تبدیل کر

لیا۔ ایران کے شاہ طہماسپ کے اس سے مراسم دوستانہ تھے۔ بدایونی نظام شاہ کی ایک شیعہ مبلغ کے ہاتھوں معجزانہ صحت یابی کو استدراج (یعنی کفار سے ظاہر ہونے والے کمالات) قرار دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ برہان الدین کے شیعہ رجحانات کا اندازہ یہیں سے ہو جاتا ہے کہ اس نے ایک بہت بڑے لنگر خانہ کو بارہ آئمہ سے منسوب کیا ہوا تھا۔ ان شیعہ رجحانات کے باعث دکنی سنیوں اور غیر ملکی شیعوں کے درمیان ایک بار پھر کشیدگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ مہدوی بھی شیعہ مخالف صف میں شامل تھے۔ یہ کشیدگی 1559ء میں عروج پر پہنچی اور بہت سے شیعوں کو یہ ملک چھوڑنا پڑا۔ آگے دو برس تخت پر ایک مہدوی براجمان رہا۔ جب اس کی حکومت ختم ہوئی شیعہ رسوم بحال ہو گئیں۔ بطور آزاد سلطنت احمد نگر کا خاتمہ ایک بہادر اور شریف النفس خاتون چاند بی بی سے منسوب ہے۔ اس کی شادی بیجاپور کے علی عادل شاہ سے ہوئی تھی جہاں سے وہ اکبر کی فوجوں کے خلاف دفاع کرنے کے لیے واپس اپنی جنم بھومی آ گئی۔ یہ ملکہ جو ہندو مسلم تاریخ کی سب سے متاثر کن شخصیات میں سے ایک ہے' اپنے ہی عوام کے ایک فرقے کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ اسی سال 1600ء میں احمد نگر سرنگوں ہوا اور ہمیشہ کے لیے مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

بیجاپور

یوسف عادل شاہ نے 1489ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ عادل شاہ اور اس کے جانشینوں کی کوششوں کے باعث بیجاپور ہندوستان کے شاندار ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ غالب امکان ہے کہ اس کی پرورش بطور شیعہ کے ہوئی لیکن اس نے اثنا عشری عقیدے کا اعلان کھل کر 1502ء میں کیا۔ لیکن اتنا عقلمند وہ بہر حال تھا کہ پہلے تین خلفاء کے خلاف تبرا متعارف نہ کروایا۔ اس کا بیٹا اسماعیل جو 1510ء میں اس کا جانشین بنا' سنی تھا۔ اسی طرح ابراہیم اول (1557ء۔1535ء) بھی سنی تھا جس کی شہادت اس کے عہد میں جاری ہونے والے فتاویٰ کے مجموعہ "فتاویٰ ابراہیم شاہیہ" سے ملتی ہے۔ اس میں شامل فتاویٰ میں فقہ حنفی کا اتباع کیا گیا ... علی اول (1559ء۔1557ء) کی صورت میں ریاست کو ایک بار پھر شیعہ حکمران ملا جس پر عوام الناس کو ایک گونہ مایوسی ہوئی لیکن یہ بیان فرشتہ کا ہے جو 1559ء کے بعد بیجاپور میں مقیم ہو گیا تھا۔ علی شاہ کے طویل دورِ حکومت میں

چاروں دکنی چاروں ریاستوں کے حکمران باہم دست و گریبان رہے۔ تاہم ایک بار وہ اپنے مشترکہ دشمن وجے نگر کی ہندو بادشاہت کے خلاف متحد ہوئے اور 1565ء میں تلی کوٹہ کی لڑائی میں فاتح رہے۔ اس دوران اکبر نے شمال میں اپنی سلطنت کی توسیع و تعمیر کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن بیجاپور اور گولکنڈہ کی جنوبی ریاستوں نے مزید ایک صدی تک مغل دباؤ کا کامیابی سے سامنا کیا۔ دکنیوں کے درمیان لڑائی جھگڑا جاری رہا جن میں مذہبی اختلاف کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔

بیجاپور کی قوت و عظمت ابراہیم ثانی کے طویل دورِ حکومت میں اپنے عروج کو پہنچی۔ ابراہیم ثانی علی کا بھتیجا تھا اور 1580 میں نو برس کی عمر میں حکمران بنا۔ ابتدائی سالوں میں اس کی چچی چاند بی بی اس کی نیابت میں عملی طور پر حکمران رہی۔ ابراہیم ثانی کو اپنے شہر کی تزئین کے لیے تقریباً پچاس برس کی مہلت ملی۔ چنانچہ اس نے شہر میں خوب صورت عمارات اتنی کثرت سے بنوائیں کہ بیجاپور دیکھنے والوں کے بیان کے مطابق سترہویں صدی میں اس شہر کی آبادی تقریباً ایک ملین اور مساجد کی آبادی سولہ سو تھی۔ مبالغہ آرائی کے امکانات اپنی جگہ لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان نے تمدنی زندگی کی حوصلہ افزائی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ اس کے محلات کی آرائش میں 'اطالین' اور زیادہ امکان ہے کہ پرتگیزی' مصوروں کا بھی حصہ ہے۔ اس وقت تک پرتگیزی جنوبی ہندوستان کی سیاست اور تمدن کا اہم جزو بن چکے تھے۔ انہوں نے بمقام گوا ہندوستان کا پہلا چھاپہ خانہ لگایا تھا جہاں سے کونکنی اور تامل کتب چھپ کر نکل رہی تھیں۔ عیسائی مبلغین دارالحکومت میں آزادانہ تبلیغ کرتے تھے۔ منی ایچر مصوری اپنے کمال کو پہنچی۔ ان میں جنوب کے شوخ اور روشن رنگوں اور ایرانی نفاست کا حسین امتزاج نظر آتا ہے خود ابراہیم شاعری اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس نے خود شاعری کی جس کا طرہ امتیاز عربی' فارسی اور جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا ملاپ ہے۔ ہندوستان علمی اور موسیقی کی روایات سے متاثر ہو کر اس نے ایک کتاب "نورس" ترتیب دی۔ اس کتاب سے علم کی دیوی سرسوتی سے ابراہیم کی گہری' اور غیر اسلامی' عقیدت کا پتہ چلتا ہے' فارسی شاعر محمد ظہوری (متوفی 1615ء) جس کا برہان ثانی نظام شاہ سے منسوب "ساقی نامہ" رنگارنگ دکنی تمدن کا عکاس ہے' نے نورس کا تعارف لکھا۔ یہ تعارف پیچیدہ تخیلات اور موسیقی کے رموز و کنایہ سے بھرپور ہے۔ اس کا اختتام ابراہیم ثانی کی مدح میں

لکھی گئی ایک مثنوی پر ہوتا ہے۔

بہت سی دوسری علمی تصانیف کے علاوہ ہندوستانی موسیقی کے خصوصی مطالعہ پر مبنی ایک کتاب کسی شیخ عبدالکریم نے ابراہیم ثانی کے لیے لکھی جو کئی منی ایچروں سے آراستہ ہے۔

متضاد تمدنوں کے امتزاج کے حوالے سے ابراہیم کا عہد اپنے معاصر اکبر سے بھی سوا ہے' چنانچہ کچھ عجب نہیں کہ بیجاپور کے بعض راسخ العقیدہ صوفیاء نے اسے حدود اسلام میں لانے کی سعی کی۔

بیجاپور پر ہماری بیشتر معلومات کا مآخذ محمد قاسم ہندوشہ المعروف بہ فرشتہ (متوفی 1623ء) کی وقائع نگاری ہے۔ جو استر آباد سے ہوتا ہوا دکن پہنچا۔ 1589ء میں جب غیر ملکیوں کے خلاف منافرت پھیلی تو وہ احمد نگر سے بیجاپور آ گیا۔ اس نے ابراہیم ثانی کی وفاداری سے خدمت کی۔ ابراہیم کی بیٹی کی شادی شہزادہ سلیم (بعدازاں جہانگیر) کے بیٹے دانیال سے ہونا تھی اس سلسلے میں فرشتہ ابراہیم کا ایلچی بن کر 1604ء میں مغل دربار بھی گیا۔ تاہم' بدقسمتی سے' اپنی منسوبہ کی آمد کے کچھ دیر بعد ہی دولہا کثرت شراب نوشی کے باعث ہزیان خمری کا شکار ہو گیا۔ فرشتہ کی تاریخ پر تصنیف کے نام گلشنِ ابراہیمی سے ممدوح بادشاہ کا پتہ مل جاتا ہے۔ ماقبل کے ادوار پر یہ اتنی مستند اور قابل بھروسہ کتاب نہیں جتنی اسے پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ تب یہ ہندوستانی تاریخ کے چند ماخذ میں سے ایک تھی جن کا انگریزی ترجمہ دستیاب تھا۔ فرشتہ کا ایک ہم عصر عبدالقادر محی الدین ابن ایدارس تھا اس کا باپ ترک وطن کر کے حضر موت سے گجرات آیا تھا۔ یہ معاصر شخصیات کی سوانح پر مبنی ایک اہم عربی کتاب "النور السافر" کا مصنف ہے۔ بیجاپور میں موجود ایدارس خاندان کے دوسرے افراد نے بھی ہند فارسی تصنیفات کے عربی ترجمے کی خدمات سرانجام دیں۔

ابراہیم ثانی کی شادی محمد علی قطب شاہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اس کے چھوٹے بیٹے محمد کو تیس برس تک جنوب میں شیواجی کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہونے والے مرہٹوں اور شمال میں مغلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بالآخر مغلوں کا باجگزار بن گیا۔ بالآخر 1680ء میں نوجوان سلطان سکندر کے عہد میں بیجاپور اورنگ زیب کی فوجوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

ادب اور موسیقی کے مداح ہونے کے ساتھ ساتھ' بلکہ اس سے بھی زیادہ' بیجاپور

کے حکمران تعمیرات کے شائق تھے۔سب سے زیادہ مرعوب کن جامع مسجد ہے۔اس کی بلند وبالا محراب پر نقاشی اور میناکاری کا کام بہت عمدہ ہے۔اس کی تزئین میں کندہ کاری بھی استعمال کی گئی ہے جو زیادہ تر احادیث پر مشتمل ہے۔اولیاء اور بادشاہوں کے بے شمار مقابر دکنی طرز تعمیر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔اپنے ہم عصر بادشاہوں میں ابراہیم کو فنون سے محبت میں ایک انفرادیت حاصل تھی۔اس لیے ابراہیم کا روضہ (تکمیل 1626ء) اتنا شاندار بنا ہوا ہے کہ ایچ کنزا سے جنوب میں تاج محل کا ہم مرتبہ قرار دیتا ہے۔عادل شاہ کی بنوائی گئی سبک اور نفیس عمارات کے برعکس اس کے مقبرے کا گول گنبد دنیا کے چند سب سے بڑے گنبدوں میں شمار ہوتا ہے۔اس کا رقبہ قطر 43.9 میٹر ہے۔اس کا فرش دنیا کے کسی بھی زیر گنبد فرش سے رقبے میں بڑا ہے۔زیر گنبد فرش کے نیچے جہاں بادشاہ کا جسد خاکی رکھا گیا تھا کربلا کی مقدس مٹی سے بھری ہوئی ہے۔ابراہیم ثانی کے عہد میں بیجاپور ایک اہم تبرک لایا گیا۔

پیغمبر کا یہ موئے مبارک اطہر محل (تعمیر 1591ء) میں محفوظ کیا گیا

بیجاپوری شیعہ تمدن یہاں کندہ کاری کے نمونوں' خصوصاً شہر پناہ پر کندہ یا علی' سے جھلکتا ہے۔لیکن ہندی اسلام کے دوسرے مراکز کی طرح یہاں بھی صوفیاء کا مضبوط اثر و رسوخ تھا۔دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی اولین دور کے جہادی اولیاء اور صوفیاء نے اپنا کام کیا۔انہیں شہداء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔بادشاہت کے قیام سے پہلے بھی قادری' شتاریہ اور چشتی صوفیا کے شواہد موجود ہیں۔قادری سید جو' عرب سے یہاں 1422ء میں آئے یعنی وہ یہاں اچ میں عربوں کی آمد سے بھی پہلے پہنچ گئے تھے جہاں انہوں نے پندرہویں صدی میں اپنا مضبوط مرکز بنایا۔لگتا ہے کہ قادریوں نے زیادہ تر الگ تھلگ زندگی گزاری۔جبکہ چشتیہ نے شاہ پور کے ٹیلوں میں اور ان کے اردگرد اپنے حلقے قائم کیے۔نامور چشتی صوفیاء اور شاعر اس علاقے میں مدفون ہیں۔نقشبندیہ مغل ہندوستان کی طرح' جہاں نقشبندیہ نے اکبر کی امتزاج مذاہب کی حکمت عملی پر تنقید کی تھی' یہاں بھی قادریہ اور شتاریہ سلسلہ کے اولیاء نے ابراہیم ثانی کی ہندوستانیت کو قبول نہ کیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ بادشاہ راسخ العقیدگی پر لوٹ آئے۔رچرڈ ایم ایٹن نے اپنی تازہ کتاب میں بیجاپوری تصوف کو بڑے واضح اور غیر مبہم انداز میں بیان کیا ہے۔چشتیہ کی وسیع المشربی سے لے کر دوسرے سلسلوں

کے صوفیوں کی سرگرمیوں تک اس نے ان کی طاقت اور مسلم تمدن میں مختلف کرداروں کا جو ذکر کیا ہے، ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لیے بھی حقیقت ہے۔

بیجاپور میں ہونے والی اولین دور کی دکھنی اردو شاعری خاصی اہم ہے۔ نثر کے زیادہ تر مخاطب پڑھے لکھے تھے۔ اس لیے یہ زیادہ تر فارسی میں لکھی جاتی اور اس میں اصطلاحات اور دوسری تراکیب کی بھرمار اور تکرار ہوتی۔ جبکہ صوفیانہ شاعری زیادہ تر دکھنی اردو میں کی گئی۔ کیونکہ اس کا روئے سخن عوام الناس کی طرف تھا۔ اس سلسلے کے پہلے معروف مصنف شمس العشاق میراں جی (متوفی 1499ء) ایک چشتی بزرگ تھے جو مکہ سے ہندوستان وارد ہوئے وہ اپنی چھوٹی سی تصنیف مثنوی "شہادت الحقیۃ" میں مقامی زبان کے استعمال پر معذرت خواہ ہیں لیکن اپنے اس نظریے کا اظہار کرتے ہیں کہ قاری کو اس کتاب کی ادنیٰ زبان کی بجائے بیان کئے گئے مطالب پر توجہ دینی چاہئے۔ ان کی کتب "خوش نامہ" اور "خوش نگاہ" کی ہیروئن ایک خوب صورت متقی لڑکی ہے جو دنیا کو بہ نظر حقارت دیکھتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے روح کو عورت کے روپ میں پیش کرنے کی ہندوستانی روایت کو اپنایا ہے۔ مقامی زبانوں میں شاعری کرنے والے تقریباً تمام صوفی شعراء میں یہی رجحان ملتا ہے۔ میراں جی کے بیٹے برہان الدین جانم (متوفی 1597ء) نے دکھنی روایت کو برقرار رکھا اور "کلمۃ الحق" اور دوسری متاثر کن نظمیں لکھیں۔ ان کے جانشین محمود خوش دہن (متوفی 1617ء) کا کام اس اعتبار سے خاصا اہم ہے کہ اس میں راہِ تصوف کے مختلف مناظر کا بیان معارف "السلوک" نامی کتاب میں بڑی فصاحت سے کیا گیا ہے۔ برہان الدین کے بیٹے امین الدین اللہ (متوفی 1675ء) نے جو ایک خوش نظر مقبرے میں مدفون ہیں، اپنے دکھنی قصیدے "محبت نامہ" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس اعلیٰ صوفیانہ شاعری میں کچھ اور اندازِ بیان اور مضامین بھی مشہور ہوئے جن کی علامتیں روزمرہ زندگی سے لی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں بیجاپور میں کچھ ایسا دکھنی ادب بھی لکھا گیا جو زیادہ اسلامی نہیں تھا۔

گولکنڈہ

بہمنی ریاست کے کھنڈرات سے جنم لینے والی جنوبی ہندوستان کی ایک دوسری بڑی بادشاہت گولکنڈہ کئی طرح سے ہمسایہ ریاست بیجاپور سے متماثل ہے۔ ہمدان کا ایک

شخص سلطان قلی محمد شاہ سوئم کے عہد میں بدار میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کا تعلق کراہنلو کے ترکمان قبیلے سے تھا۔ اس نے دکنیوں اور غیر ملکیوں کی اندرونی کشمکش (1485ء) میں اپنے بادشاہ کی حفاظت کی۔ دس سال کے بعد اسے قطب الملک کا خطاب دیا گیا اور تلنگانہ میں تعینات کر دیا گیا۔ یہاں 1512ء میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور شیعہ مسلک کا نفاذ کرتے ہوئے بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھوانے لگا۔ سلطان قلی کا 1543ء میں نوے سال سے زیادہ کی عمر میں قتل ہوا۔ اس کے جانشینوں کی سربراہی میں اس ملک نے جنوبی ہندوستان کی جنگوں اور باہمی تنازعوں میں اہم بلکہ اکثر اوقات فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

گولکنڈہ کا شہر ہندوستانی ہیروں کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ اس لیے بہت سے سیاح اور تاجر یہاں کھنچے چلے آتے۔ قطب شاہی سلطنت کے آخری دنوں میں اردستان سے تعلق رکھنے والا ہیروں کا ایک سوداگر میر جملہ سب سے بڑی سیاسی قوت بن گیا۔ تین بڑی بندرگاہیں گوا، سولی پٹم اور سورت تک رسائی کے باعث یہ صوبہ بہت امیر ہو گیا تھا۔ گولکنڈہ کا زریں دور وہی ہے جو بیجاپور کا ہے۔ پہلا شخص جس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا سلطان ابراہیم (1550ء۔1580ء) تھا۔ اس نے ہندو مسلم روایات کو ملا کر ایک دلچسپ شہری زندگی کی بنیاد رکھی۔ اس نے عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ تلگو کو بھی اس کا مقام دیا۔ اس بادشاہ کے ابتدائی سالوں میں یہاں پہلی دکھنی شاعری لکھی گئی۔ 1580ء میں اس کی جگہ محمد قلی قطب شاہ نے لے لی۔ اسی سال بیجاپور میں عادل شاہ ثانی نے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ محمد قطب شاہ کا تیس سالہ دورِ حکومت گولکنڈہ ثقافت اور تمدن کے عروج کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنا دارالحکومت نئے تعمیر شدہ شہر حیدر آباد میں منتقل کر لیا۔ شاندار عمارتوں سے مزین اس شہر کا نام خلیفہ علیؓ حیدر کرار کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس جگہ کے انتخاب کی سیاسی اور فوجی وجوہات بھی تھیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ معروف ولی شاہ چراغ یہاں مقیم رہے تھے اور یہیں ان کا مزار تھا۔ ان کے مزار کے اردگرد میر مومن نے نیا تعویز بنوایا اور اسے کربلا سے لائی گئی مقدس مٹی سے بھر دیا۔ میر مومن نے شہر حیدر آباد کے خدوخال مرتب کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس کا خواب دارالحکومت کو اصفہان ثانی بنانا تھا جو شان و شوکت میں اس ایرانی دارالحکومت کا ہم چشم ہو۔ اس کی سب سے مشہور عمارت چار مینار تھی جسے شہر کے مرکز کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی چھت کا مغربی حصہ ایک مسجد پر مشتمل ہے کہا جاتا ہے

کہ اس کی پانچ دوہری محرابیں پنجتن پاک کی علامت ہیں۔ محمد قلی نے محرم کی تقریبات میں استعمال کرنے کے لیے اس شہر میں ایک بڑا عاشورہ خانہ بھی تعمیر کروایا۔ محرم کی تقاریب بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں۔ محرم کی جلوسوں میں سدھے ہوئے جانور بھی شامل ہوتے اور علم، تعزیے اور نیزے بھی نکالے جاتے تھے۔ اس شہر کے متبرکات میں حضرت علیؓ کے گھوڑے کی نعل شامل تھی جو بیجاپور سے لائی گئی تھی۔ شیعہ رجحانات کی وجہ سے، اپنے پیشرووں کی طرح محمد قلی نے بھی ایران سے دوستانہ تعلقات رکھے۔ شاہ عباس نے گولکنڈہ میں اپنی سفارتیں بھیجیں اور وعدہ کیا کہ وہ قطب شاہیوں کو بڑھتے ہوئے مغل دباؤ سے بچائے گا۔ ایران سے اس طرح کے تعلقات نے بھی دلی کے سنیوں کو دکنی زندیقوں کے اور بھی خلاف کر دیا۔

محمد قلی اہل ہنر کا سرپرست اور بذاتِ خود دکھنی اردو کا کامیاب شاعر تھا۔ وہ شاعری میں تخلص "معانی" کرتا تھا۔ اس کی شاعری میں روزمرہ زندگی کے مناظر کا ذکر غیر معمولی تازگی اور تفصیل سے ملتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں شب برات کی آتش بازی اور چراغاں کی نہایت لطیف منظر کشی کرتا ہے۔ اس میں بادشاہ کے پسندیدہ پھلوں، جانوروں، قدرتی مناظر اور معاملاتِ محبت کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس کی عشقیہ اور خمریانہ شاعری کا اختتام بھی پیغمبرؐ یا علیؓ سے التماس پر ختم ہوتا ہے۔ پکے شیعہ عقائد کے باعث محمد قلی نے شہدائے کربلا کی یاد میں مرثیے بھی لکھے۔ آنے والی دہائیوں میں مرثیے کے فن میں خاصی ترقی ہوئی۔ پھر جب دلی کے شعراء نے ادبی مقاصد کے لیے اردو سے رجوع کیا تو اور چیزوں کے ساتھ دکھنی مرثیہ بھی وہاں پہنچا۔

اس قدر راسخ شیعہ ہونے کے باوجود محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے "ہندو مسلم ثقافت کو نہ صرف دربار میں بلکہ اشرافیہ اور عوام الناس میں بھی باہم متحد کرنے کی کوشش کی" اگرچہ اس نے تلیگو زبان پر مکمل عبور حاصل کیا لیکن اس کی عربی ادب میں دلچسپی کے باعث بہت سے علماء جنوبی ہند پہنچے جن میں سے بعض مکہ اور مدینہ کے حدیث اور فقہ کے بہت بڑے استادوں کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ترکوں کے زیرِ اثر شمال کے برعکس جہاں حنفی مسلک غالب تھا، جنوب میں زیادہ تر شافعی مکتبِ فکر حاوی رہا۔ میر درد کے ایک شاگرد نظام الدین جیلانی (متوفی 1649ء) جیسا عالم بھی گولکنڈہ آ گیا اور یوں قطب

شاہی علاقے میں عربی ادب شاعری پھلنے پھولنے لگی۔ عرب مصنفین میں سے امیر سید احمد ابن معصوم اور ان کے بیٹے صدر الدین سید علی خاں معروف ترین ہیں۔ پہلے باپ سلطان کی دعوت پر گولکنڈہ پہنچا اس نے 1655ء میں بیٹے کو بھی بلوا لیا۔ اس نوجوان نے مکے سے گولکنڈہ تک کے سفر کا حال اپنی نثری تصنیف "صلواہ الغرب و اصوات العرب" میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اس نے اپنے سن رسیدہ معاصر عبدالقدیر الایدرس کی طرح اپنے ہم عصر علماء اور ادباء کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ایک سوانحی کتاب "سلافۃ العصر" لکھی۔ یہ گیارہویں صدی ہجری کی ممتاز دکنی شخصیات کے حالات کا اہم ماخذ ہے۔ قطب شاہی دور کے آخر پر درباری سیاست میں الجھ جانے کے باعث سید علی کو گولکنڈہ چھوڑنا پڑا۔ اورنگ زیب نے اس کا نہایت عزت و احترام سے استقبال کیا اور اسے برہان پور میں تعینات کر دیا جہاں وہ اپنی شیراز روانگی تک مقیم رہا۔ سترہویں صدی میں فن خطاطی بھی نہایت اعلیٰ معیار کو پہنچ گیا۔ نستعلیق میں لکھے گئے کتبوں سے لے کر طغریٰ نویسی تک ہر میدان میں کمال حاصل کیا گیا۔ منی ایچر میں سونے کا بے دریغ استعمال نظر آتا ہے۔

1611ء میں محمد قلی کی وفات کے بعد مغل فوجوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ گولکنڈہ نے بیجاپور سے ایک سال زیادہ طویل مزاحمت کی بعد ازاں مغلوں نے اس ریاست سے بھاری خراج وصول کیا۔ آخری حکمران ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہونے سے پہلے ایک تارک الدنیا شخص تھا اس نے 1687ء میں مسکراتے ہوئے بادشاہت اورنگ زیب کے افسروں کے حوالے کی۔

کرناٹک

ہندوستان کے جنوبی ترین حصے کا عربی اسلامی عنصر شاکروتی بادشاہ کی کہانی میں جھلکتا ہے۔ جسے بعد ازاں ازمنہ وسطیٰ میں عربی زبان میں قلمبند کیا گیا۔ کرانگاپور کے بادشاہ شکروتی نے معجزہ شق القمر (سورۃ 54/1) اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام لے آیا۔ اسی لئے جنوب کے مسلمان اپنی موجودگی کو رسولؐ کے وقت سے ملاتے ہیں۔ مسلمان سوداگر ساحلی علاقوں میں آباد تھے اور انہوں نے اپنی روایات اور رسوم و رواج برقرار رکھے تھے۔ کون کان کے ساحلوں پر آباد مسلمان یہاں مبینہ طور پر حجاج کے زمانے میں پہنچے جبکہ تامل لینڈ کے

مسلمان آباد کاروں کے قدیم ترین تاریخی شواہد نویں صدی ہجری تک کے ہیں۔ ان کے شمال کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات بہت محدود تھے۔ امیر خسرو علاؤالدین خلجی کے مالابار پہنچنے کی کوشش کے متعلق لکھتا ہے۔

"مالابار گیا تھا جو شہر دلی سے اتنا دور ہے کہ تمام تر ممکن تیز رفتاری کے باوجود وہاں پہنچنے میں بارہ ماہ لگتے ہیں" (خزائن الفتوح)

اس کے باوجود محمد ابنِ تغلق کے عہد میں جلال الدین احسن کو جنوب کی طرف بھیجا گیا جس نے کچھ عرصے کے بعد سلطانِ مادورا ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اسے 1339ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین کا نام علاؤالدین شاہ تھا۔ جس کے بعد غیاث الدین آیا۔ ابنِ بطوطہ جو جلال الدین کا داماد تھا' جنوبی ہند کے مسلمانوں کی ثقافت کا دلچسپ حال بیان کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ناور شہر میں لڑکیوں کے تیرہ اور لڑکوں کے تئیس سکول ہیں۔ تاہم مادورا کی خود مختار مسلمان حکومت زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ سکندر شاہ وجے نگر کی فوج کے ہاتھوں 1378ء میں مارا گیا۔ اس کا بدلہ اسے شہید سمجھنے والے مالاباری مسلمانوں نے لیا۔ جنوبی ہندوستان میں اولیاء کے مقابر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ترچناپولی میں سید ناصر شاہ کا مقبرہ ملتا ہے جو مسلمانوں کے ہراول دستے میں شامل تھا۔

ابنِ بطوطہ نے منجرور (منگلور) میں ایک شافعی قاضی اور چند لاکھ مسلمانوں کا ایک شہر دیکھا انہیں لبائی کہتے تھے ان لوگوں کا تعلق عربوں اور مقامی لوگوں کی مخلوط نسل سے تھا۔ یہ لوگ ناگور کے علاقے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ تجور میں ان کے ہاں قادری ولی صاحب بہت مقبول ہیں۔ ان سے عجیب و غریب معجزات منسوب ہیں اور ہندو مسلم انہیں یکساں مانتے ہیں۔ لبائیوں میں صدیوں تک عربی کی تعلیم کا رواج رہا۔ آجکل یہ قرآن کا تامل ترجمہ استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان کے لیے عربی رسم الخط استعمال کیا جس میں مذہبی ادب خاصی بڑی مقدار میں موجود ہے۔ مخلوط والدین کی اولاد ایک اور نسل موپلا کہلاتی ہے۔ جن کی تعداد مبینہ طور پر دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان کی زبان ملیالی ہے اور یہ زیادہ تر امام شافعی کی پیروی کرتے ہیں۔ موپلا اپنے مقالہ مذہبی رہنماؤں کو تانگل کہتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پیغمبر کی نسل سے ہیں اور چونکہ موپلا کے بعض قبائل اپنا مادری نسب نامہ برقرار رکھتے ہیں اس لئے تانگل اپنا عربی یعنی سید نام اور مادر نسبی نام دونوں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے

ان کے نام بعض اوقات سات حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ موپلوں میں انیسویں صدی کے ایک قادری مصلح بہت مقبول ہیں۔ عبدالقدیر تا کیہ ساکل کایل پاشم (متوفی 1855ء) نے موپلوں پر تنقید کی کہ انہوں نے اپنے گورے آقاؤں کی تقلید میں داڑھی منڈوادی ہے اور وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی بجائے اپنے بھانجوں کو وارث ٹھہراتے ہیں جو خلافِ اسلام ہے۔

موپلا عام طور پر نہایت غریب ہیں تاریخ میں ہمیشہ ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ اچانک اور متشددانہ' فرقہ ورانہ کارروائی کر گزرتے ہیں۔ اس طرح کی اولین کارروائیاں یہودیوں اور پھر عیسائیوں کے خلاف ہوئیں۔ لیکن ان کی سب سے خطرناک بغاوت تحریکِ خلافت کے دوران 1921ء میں ہوئی۔ ان کا مرکز پونانی ہے جہاں کے علم و ہنر کی تعریف ابنِ بطوطہ نے بھی کی ہے۔

کالی کٹ میں بھی مسلمانوں کی ایک قابلِ ذکر آبادی موجود ہے۔ پندرہویں صدی میں بھی ان کی اپنی ایک جامع مسجد اور قاضی تھا۔ جب پرتگیزی واسکوڈے گاما کی قیادت میں 1498ء میں کالی کٹ پہنچے تو عرب تجارتی برادری نے جیرہ عرب میں پرتگیزیوں کی موجودگی کے خطرے کو بھانپ کر ہندو راجہ زامورین سے مدد مانگی۔ ایک سادہ سی عربی نظم میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔

یہ عرجزہ پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے اور اسے محمد الکالی کٹی نے لکھا۔ اس کے بھائی زین العابدی نے اس کا نثری تکملہ "تحفۃ المجاہدین" لکھا جس میں پرتگیزیوں کی آمد اور ان کے خلاف جدوجہد کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ کتاب بیجاپور کے علی عادل شاہ سے منسوب کی ہے۔ جس کی بادشاہت میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ تاہم کرناٹک صدیوں تک عربی اور تامل اسلامی ادب کے لیے زرخیز زمین رہا۔ اور اس نے اپنا مقامی عربی ہندی تمدن برقرار رکھا۔

گجرات

اکبر کا درباری شاعر فیضی روایتی بتانِ کشمیر' جنہیں اب تک فارسی عشقیہ شاعری میں باندھا جاتا تھا' کو پسِ منظر پشت ڈال کر اپنی غزلوں میں "نازنینانِ گجرات" کا ذکر کرتا ہے۔ اس وقت گجرات نیا نیا خانِ خاناں عبدالرحیم کے ہاتھوں فتح ہو کر مغل سلطنت میں ضم

ہوا تھا(1584ء)۔ اس ملک کے اسلامی دنیا کے ساتھ عرصے سے روابط تھے۔ اس کے جزیرہ نما حصے کاٹھیاواڑ میں محمود غزنوی نے 1026 میں سومنات کا مشہور مندر تباہ کیا اور دو ملین دینار کے برابر مالِ غنیمت اٹھالے گیا۔ اس وقت یہاں کی اصل آبادی ہندوؤں اور جینوں (جین مت کے ماننے والے) پر مشتمل تھی۔ 700ء میں ایران پر عربوں کے قبضے کے نتیجے میں زرتشتیوں نے ایران سے نکل کر ہندوستان کے اس حصے میں آباد ہونا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کو بعد ازاں بمبئی اور کراچی کی ایک اہم تجارتی برادری بنتا تھا کچھ عرب خاندان گجرات اور کونکن کی بندرگاہوں کے قریب آباد ہو گئے کیونکہ یہ دونوں مقام وسطی مسلم دنیا اور ہندوستان کے درمیان بہترین رابطہ فراہم کرتے تھے۔ مشہور صوفی حلاج براستہ سمندر 905ء میں بصرہ سے گجرات آیا۔ یہاں سے وہ اپنے تبلیغی دورے پر سندھ اور کشمیر چلا گیا۔ عرب جغرافیہ دان اس علاقے سے بخوبی واقف تھے۔ 951ء میں استخری کامبے کے جنوب میں واقع کئی مسلمان آبادیوں کا ذکر کرتا ہے۔

شمال مغربی ہندوستان پر مسلم غلبے کے بعد غوری نے گجرات فتح کرنے کی کوشش بھی کی۔ پہلا کامیاب حملہ قطب الدین ایبک نے 1197ء میں کیا۔ لیکن گجرات کا علاقہ 1298ء سے پہلے سلطنت دلی میں ضم نہ کیا جا سکا۔ کاٹھیاوارڑ کے علاقہ میں کئی مساجد اس سے پہلے یہاں خود مختار مسلم آبادیوں کی شہادت دیتی ہیں۔ ایک عرب جہازراں نے جوناگڑھ میں مسجد تعمیر کی تھی۔ اس سے بھی اہم مسجد سومنات کی ہے جس کا سالِ تعمیر 1264ء ہے۔ اس مسجد میں عربی اور سنسکرت میں کندہ کیا ہوا ایک کتبہ موجود ہے۔ جس پر شبِ برات کے عطیات سے متعلق احکامات ہیں۔ لوگوں کو ہدایت دی گئیں کہ وہ اپنی آمدن کا فاضل حصہ مقدس شہروں کو بھجوا دیں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان مسجدوں کو بنانے والے اور مغربی ساحل کی عرب آبادیاں شافعی مذہب کی پیروکار تھیں۔

گجرات کی اہم ترین بندرگاہوں میں سے ایک کامبے تھی۔ بعض اوقات اس نام کو عربی اور مآخذات میں پورے علاقے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر کے دوران اسے دیکھا اور اس کی تعریف کی۔ بعد ازاں گجراتی بادشاہت نے اپنی سرحدوں کو سورت کے جنوب میں بمبئی تک وسیع کر دیا کیونکہ وہ راجستھان میں گھسنا چاہتے تھے۔

گجرات میں سیاسی بدامنی کے سبب محمد تغلق نے یہاں اپنی آخری فوج کشی کی۔

گجراتی باغی کی سرکوبی کرتے ہوئے وہ ٹھٹھہ سے کچھ دور دریائے سندھ کے کنارے فوت ہو گیا۔ گجرات اور سندھ کے درمیان ہمیشہ قریبی مراسم قائم رہے۔ انگریزوں نے بھی تقریباً نوے سال تک صوبہ سندھ پر بمبئے سے حکومت کی۔ کچھ کا علاقہ دونوں صوبوں کے درمیان ثقافتی اور لسانی اعتبار سے عبوری علاقے کی حیثیت رکھتا ہے۔

چودھویں صدی میں گجرات پر تغلق حکومت کمزور ہو گئی۔ بلآخر مظفر خاں کو 1339ء میں مصر کے عباسی خلیفہ سے سندِ جواز مل گئی۔ اگلی ایک صدی تک نمایاں ترین عرب طاقت مصر سے گجرات کے خوشگوار تعلقات رہے۔ سلطان مظفر اور اس کے پوتے احمد ابن تاتار (متوفی 1442ء) کا زیادہ تر وقت ملحقہ ریاستوں خصوصاً مالوہ اور کاندیش کے ساتھ جنگ و جدل میں گزرا۔ موخرالذکر ریاست میں راجہ ناصر فاروقی نے اپنے چشتی مرشد زین الدین داؤد کی ہدایت پر ایک نیا شہر بنایا۔ جنہوں نے اسے برہان الدین غارب چشتی کے نام پر برہان پور کا نام دیا۔ گجرات کا احمد خان ایک متقی حکمران کے طور پر معروف تھا جو اپنے مذہبی فرائض سختی سے بجالاتا تھا چنانچہ اس نے نہ صرف غیر مسلموں پر جزیہ عائد کر دیا بلکہ اپنے ملک میں کچھ مندر بھی مسمار کروا دیئے وہ اچ کے مخدوم جہانیاں کے پوتے برہان الدین قطب عالم کا مرید تھا۔ جو 1400ء میں اپنے تایا راجو کرتال کی ہدایت پر گجرات آئے۔ راجو کرتال سہروردیہ سلسلے سے تعلق رکھنے والے نہایت پابندِ شرع صوفی تھے۔ برہان الدین کو بھی احمد کٹھو (متوفی 1445ء) سے خرقہ ملا جس سے بہت سے معجزات منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک (جو تاریخی حقائق پر مکمل طور پر پورا نہیں اترتا) بدایونی نے یوں بیان کیا ہے۔

> "احمد کٹھو نے امیر تیمور سے ملاقات کی اور اپنی وضع قطع اور علم کے زور پر اپنا درویش ہونا منوالیا۔ اس نے تیموری سپاہ میں شامل علماء سے علمی مجادلے کیے اور قیدیوں کی جان بخشی کا مطالبہ کرتا رہا۔ احمد کٹھو' تیمور کو اتنا پسند آیا کہ اس نے درخواست قبول کرتے ہوئے تمام قیدی رہا کر دیئے" (بدایونی)

اس واقعہ کے بعد احمد کٹھو مزید چھیالیس برس زندہ رہے اور گجرات میں سا کھے کے قیام پر مدفون ہیں۔

قطب عالم کے وفادار مرید سلطان احمد نے 1411ء میں احمد آباد میں واقع نئی جگہ

پر سکونت اختیار کی جہاں ان کے مرشد بھی رہ چکے تھے۔ یہ شہر جلد ہی اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہو گیا۔ شہر میں جین اور مسلم طرز تعمیر کا امتزاج جھلکنے لگا۔ اس شہر کی بے شمار مساجد' مدارس اور خانقاہیں مقدس عمارات کے ہندوستانی روپ کی مثالیں بن گئیں۔

نئے دارالحکومت میں ادبی زندگی پھلی پھولی۔ احمد شاہ خود فارسی میں شاعری کرتا تھا۔ اس نے برہان الدین قطب عالم کا ایک قصیدہ لکھا اور اس میں ممدوح کے نام اور لقب کی رعائت سے صنعت تجنیس برتی۔

مصری عالم بدر الدین الدیمی (متوفی 1424ء) نے گجرات میں کچھ سال گزارے اور پھر آگے بہمنی سلطنت میں داخل ہو گیا اس نے اپنی بیشتر تصانیف کا انتساب سلطان احمد کے نام کیا جسے وہ "سلطانوں کا عالم اور عالموں کا سلطان" کہتا ہے۔ صوفی شعراء اور علماء گجرات کی طرف کھنچے چلے آتے کیونکہ سرحدوں پہ جاری جنگوں کے باوجود یہاں زندگی دلی کی نسبت پر سکون اور محفوظ تھی۔ یہاں پر علاؤالدین محمد (متوفی 1431ء) کا ذکر ضروری ہے۔ آپ کی "تعبیر الرحمان" سے ابنِ عربی اور وحدت الوجود کے نظریات سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ احمد آباد کے گردونواح میں موجود بے شمار صوفیاء میں سے ایک موسیٰ سہاگی تھے جو زنانہ لباس میں ملبوس رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس بھیس میں اپنے خاوند اور مالک سے ملنے کو بے تاب روح کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی خیال شاہ علی محمد جیو جان (متوفی 1515ء) کی صوفیانہ تصنیفات میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے مقامی زبان میں شاعری کی۔ اس وقت کے گجراتی مسلمانوں میں صوفیانہ محبت کی شاعری کا رواج تھا۔ جسے جکری کہا جاتا ہے جو ذکری کی مقامی لہجے میں ادائیگی ہے۔ احمد آباد میں موجود ایک درخت قطب عالم کے بیٹے شاہ عالم سے منسوب ہے۔ عوام الناس عورتوں کے بانجھ پن کا علاج اس کا پھل کھانا سمجھتے ہیں تاہم ان کا حقیقی کردار بنیادی سیاسی اہمیت رکھتا ہے شاہ عالم نے اپنے باپ' جو احمد شاہ کے مرشد تھے' کی روایات پر عمل کرتے ہوئے سیاسی معاملات پر مصالحانہ نقطہ نظر اختیار کیا۔ 1442ء میں سلطان کی وفات کے بعد خونریزی شروع ہو گئی تھی۔ 1458ء میں ان کا متوسل تیرہ سالہ فتح خان پسر محمد ثانی محمود شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا اور گجرات کا عظیم ترین حکمران بن گیا۔ اس کی ماں سندھ کے حکمران کی بیٹی تھی۔ اس واسطے سے ان کا ٹھٹھہ کے نظام الدین (متوفی 1509ء) سے قریبی تعلق بن گیا۔ زیریں وادی سندھ' سمہ خاندانِ حکومت کے اس عظیم

ترین حکمران کے تحت خوشحالی کے ایک طویل سنہری دور سے گزرا۔ ٹھٹھہ کے قریب ماکلی ہل پر اس کا مقبرہ گنگا جمنی طرزِ تعمیر کا ایک رنگارنگ نمونہ ہے۔ سلطان محمود کو بیگڑا بھی کہا جاتا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ بے گرسے مشتق ہو یعنی دو قلعے گرنز اور چمپانز جو اس نے بالترتیب 1470ء اور 1482ء میں فتح کیے۔ اس نے جوناگڑھ کو زبردستی اپنی ریاست میں ضم کیا اور اس کا نام مصطفیٰ آباد رکھا۔ اس کا حکمران حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ بادشاہ نے اس علاقے میں چند سید خاندان آباد کیے۔ ان کی تبلیغ اسلام میں اتنی تاثیر تھی کہ 1947ء میں ہونے والے استصوابِ رائے میں یہاں کے باشندوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا جو بہر طور ناکام رہا۔

محمود نے احمد آباد کے نزدیک ایک نئی بستی محمود آباد کے نام سے بسائی۔ اپنے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں اسے پرتگیزیوں سے جنگ کرنا پڑی جن کی بحیرہ عرب میں سرگرمیاں سال بہ سال بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ حصولِ مقصد کے لیے اس نے آخری مصری مملوک حکمران قنسوع الغری کے ساتھ اتحاد بنایا اور جنوری 1508ء میں مصریوں کے تعاون سے پرتگیزیوں کو شکست سے دوچار کیا۔ تاہم البکرک 1510ء میں بیجاپور کی عادل شاہی بندرگاہ گوا پر قابض ہو گیا۔ ایک سال بعد محمود بیگڑا باون برس کی کامیاب حکمرانی کے بعد فوت ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی سرگرمیوں کے باعث اس کے امراء نے اسے معزول کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔

"کوہے کا شہزادہ" سے متعلق ہر چیز کو غیر معمولی رنگ دیا جاتا رہا ہے۔ یورپی سیاح اس کی زیادتی خوراک پر مبالغہ آمیز حاشیہ آرائی کرتے ہیں۔ ان کے بقول وہ زہر دیے جانے کے خدشے کے پیش نظر زہر کو بتدریج بڑھتی ہوئی مقدار میں کھا کر اسے ہضم کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس قسم کی مبالغہ آرائی سے تاریخ کا طالب علم اس محمود کو نہیں دیکھ پاتا جو نہایت متمدن اور مہذب شخص تھا جس نے ابنِ خالیکان کی "وفائت الاعیان" جیسی عربی کتب کا فارسی ترجمہ کروایا اور بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں حقیقی دلچسپی رکھتا تھا اور مذہب پر اس کا نقطہ نظر انتہائی مفاہمانہ تھا۔ اس کا وزیر اعظم ایک برہمن تھا۔ سلطنت میں داخل ہونے والے اسماعیلی صوفیاء اور اولیاء سے اس کا سلوک مہربانی کا تھا' جب قاضی نے جونپور کے مہدی کے قتل کا فتویٰ کر دیا تو محمود نے نہ صرف اس پر عمل نہ ہونے دیا بلکہ اس کی طرف قدرے ملتفت ہوا۔

احمد شاہ کی طرح اس کے دورِ حکومت میں بھی کچھ راجپوت گھرانوں نے ممتاز مسلمان گھرانوں میں شادیاں کیں اور یوں ذات سے خارج ہو گئے۔ ان شادیوں کے نتیجے میں اگلی نسل بہت سی ہندوانہ رسوم پر عمل پیرا تھی۔ گجرات واحد ہندوستانی صوبہ ہے جہاں مسلم ذات پات کے نظام پر ایک بڑے پیمانے پر سماجی تحقیق کا کام ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں "درجہ اسلام" کے اعتبار سے بہت سی برادریوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس تحقیق سے حاصل ہونے والے بہت سے نتائج کافی حد تک برصغیر کے دوسرے حصوں کے لیے بھی قابل اطلاق ہیں۔ پچھلے ایک سو برس میں اصلاحی تحریکوں کا ایک بڑا مقصد ان لوگوں کو "مکمل" مسلمان بنانا بھی رہا ہے جو اپنے مسلمان ہونے سے پہلے کے رسوم و رواج سے سختی سے چمٹے ہوئے ہیں، چاہے یہ رواج ذات پات کے نظام کی صورت میں ہوں یا نکاح بیوگان سے انکار کی صورت میں حتیٰ کہ 1911ء میں بھی اقبال کو شکایت تھی کہ مسلمان ہندو مت میں خود ہندوؤں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ چنانچہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ برصغیر کے دوسرے حصوں کی طرح گجرات میں بھی سیدوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سیدوں میں بھی بخاریوں کا اختصاص تھا کہ ان کے ملک کے سرپرست ولی قطب عالم بخاری کا تعلق بخارا سے تھا۔

اسماعیلی مبلغین، صوفیاء اور مہدیوں سے اپنی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود دیگر ااور اس کا بیٹا (1526ء۔1511ء) دونوں سنی رہے۔ اس کا بیٹا مظفر آخری غیر ملکی مسلم حکمران تھا جس نے قاہرہ کے عباسی خلیفہ سے سندِ جواز حاصل کی۔۔ اس کے پاس صفوی ایران سے بھی ایک سفارت پہنچی جو ناکام واپس گئی۔ مظفر حلیم کہلاتا تھا کیونکہ وہ "آستین صبر سے دست سزا باہر نہ نکالتا" شرعی معاملات پر اس کی گرفت کا اعتراف بابر بھی اپنی یادداشتوں میں کرتا ہے وہ نہایت اچھا خطاط اور حافظ قرآن تھا۔ عید میلادالنبی نہایت دھوم دھام سے مناتا۔ اس کے قابلِ تعریف عملوں میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے لیے مکہ جانے والوں کو سواری مفت مہیا کرتا۔ ان کشتیوں میں وہ مقدس شہروں کے غرباء کے لیے مال و منال بھجواتا۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی شخصیت کا صرف ایک پہلو منفی تھا۔ اسے موسیقی سے بے انتہا محبت تھی۔ تاہم علماء اس کے جانشین محمود ثانی پر ایک اور الزام لگاتے ہیں کہ اس کا ہر روز روز عید اور ہر شب شبِ برات تھی۔

بروکیڈ اور مخمل جیسے کپڑوں کی صنعت پر ہمسایہ ریاستیں رشک کیا کرتی تھیں۔
جب پرتگیزیوں نے دفاعی اہمیت کی بندرگاہ ڈیو پر قبضہ کیا تو مظفر کے بیٹے کو دھوکے سے مروا دیا۔ کچھ دیر کے لئے معزول مغل بادشاہ ہمایوں بھی گجرات میں ٹھہرا۔ اگرچہ مظفر کی فوج نے 1524ء میں مہدویوں کو شکست سے دوچار کیا وہ آئندہ دہائیوں سے اس کے لیے باعث پریشانی بنے رہے۔ سیاسی عدم استحکام کے اس دور میں بھی کئی علماء اور صلحاء دور دراز سے گجرات پہنچے۔ برہان پور کے مشہور محدث علی المتقی نے حج پر روانہ ہونے سے پہلے کچھ سال احمد آباد میں قاضی کے عہدے پر کام کیا۔ اسی ریاست میں ان کا مرید' سابق سنی بوہرہ طاہر پٹنی 1518ء میں سنیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ 1508ء میں پٹن میں پیدا ہونے والے محمد ابنِ طاہر ہندوستان کے معروف ترین محدثین میں سے تھے۔ انہوں نے علم الحدیث کی مطالعاتی سہولت کی غرض سے کئی کتب لکھیں۔ ان میں سے ایک کتاب روایان حدیث کے ناموں کے درست تلفظ کے طریقے پر ہے۔ شتاری سلسلے کے عظیم صوفی ولی محمد غوث گوالیاری (متوفی 1562ء) کچھ عرصہ احمد آباد میں مقیم رہے جہاں ان کے دعاوی کا دفاع وجیہہ الدین گرامی (1589ء) نے کیا۔ بدایونی کے بقول وجیہہ الدین گجراتی علمی اور انسانی کمالات سے متصف تھے۔ تمام علومِ مروجہ کے ساتھ ساتھ روحانی شفا پر دسترس رکھتے تھے۔ جتنے طبیعت کے سادہ تھے' ہاتھ کے اتنے ہی سخی تھے۔ باوجود علمی کارناموں کے درویش منش انسان تھے۔ ان کے خلیفہ محمد ابنِ فضل اللہ نے ایک کتاب "تحفہ المرسلہ الالنبی" (1620ء) تحریر کی۔ یہ تصنیف میں تصوف کی ترویج کا ذریعہ بنی۔ جب خود محمد چشتی (متوفی 1614ء) نے اردو اور گجراتی ملی جلی زبان میں "خوب ترنگ" لکھی تو تصوف پر مقامی زبان اور روزمرہ میں لکھنے کا رواج پڑا۔ مغل سلطنت میں ضم ہونے کے بعد بھی گجرات نے عربوں سے تعلق منقطع نہیں کیا۔ خدامت کے ایک خاندان کے ایدراس کے افراد یہاں سکونت پذیر ہوئے تھے جو غزالی کی احیاء علوم الدین اور حدیث کا درس دیتے تھے۔ بعد ازاں یہ لوگ بیجاپور چلے گئے۔ محمد غوث گوالیاری کے ایک روحانی جانشین محمد غوری نے ایک بار پھر اولیاء کی مختصر تاریخ "گلزار ابرار" کے نام سے مرتب کی۔ 576 مذکور اولیاء میں سے اکثریت اس کے ہم وطن اولیاء کی ہے۔ "کافرانہ" تحریروں کی بھی کمی نہ تھی الغ خانی (متوفی 1611ء) کی "ظرف اولی مظفر وعلہ" زیادہ مشہور تصنیف ہے جو مغلوں کے قبضے کے فوراً بعد وجود میں آئی۔

اسماعیلی فرقے/آبادیاں اگر وہ اپنے طویل دورِ حکومت میں محمود بیگڑا نے کچھ کا صوبہ بھی اپنی سلطنت میں ضم کر لیا۔ یہاں کے کچھ قبائل قبولِ اسلام کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر انہیں شریعت کی کچھ خبر نہ تھی۔ ماخذوں میں ان کا نام لباحتیہ دیا گیا۔ یہ نام قرامطیوں کے زمانہ قدیم میں استعمال ہوتا تھا۔ سلطان گجرات کی نئی رعایا یقیناً اسماعیلی رہے ہوں گے کیونکہ کچھ آج بھی ان کے مراکز میں سے ایک ہے۔

گجرات کا تعلق اسماعیلیوں سے بہت پہلے بن گیا تھا۔ اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ کامبے اور گردونواح میں پہلا قبول اسلام دربار مصر سے ہندوستان بھیجے داعین کے ہاتھوں پر ہوا تھا۔ فاطمی دعویٰ کے ماننے والے مستنصر کی 1094ء میں وفات کے بعد پھٹ گئے تھے۔ ایک فرقے نے چھوٹے بیٹے مستعالی کو اور دوسرے نے بڑے بیٹے نطار کو امام مانا۔ مستعالیوں کا عقیدہ تھا کہ مستعالی کا پوتا ابو القاسم طیب 1142ء میں بارہویں اثنا عشری کی طرح پردے میں چلا گیا تھا۔ اس کی نمائندہ یمن کی ملکہ ہرا تھی۔ اس وقت سے لے کر مستعلین جنہیں ہندوستان میں بوہرہ کہا جاتا تھا' نے یمن میں داعی مطلق کی موجودگی کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ اپنا حج بھی وہیں کرتے اور وہیں اپنے محصولات ابوہروں / بھیجتے بوہروں کا مرکزی عقیدہ ان کا داعی پر پختہ ایمان ہے جو ملاجی صاحب یا سیدیں کہلاتا ہے اور اسے عزت مآب کا خطاب بھی حاصل ہے۔ اسے زمین پر خدا کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے اور اس لیے وہ معصوم عن الخطا ہے۔ ہر بالغ کو داعی یا اس کے نمائندہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا پڑتی ہے۔ جس کی تجدید ہر سال 18 ذی الحج کو ہوتی ہے۔ جب رسولؐ کے علیؑ کو اپنا وصی مقرر کرنے کے یاد میں جشن ہوتا ہے۔ بوہرہ مذہب زیادہ تر فاطمی اصول پر قائم ہے۔ اسی لئے ان کے قوانین کی بنیاد قاضی نعمان کی "دائم الاسلام" پر ہے۔ مقامی نمائندے کی تقرری داعی کرتا ہے۔ اس کے فرائض سنیوں کے قاضی کے سے ہوتے ہیں۔ لیکن اسے قاضی کی نسبت بہت زیادہ اختیار بوہروں پر حاصل ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں پہلے بوہرہ داعی کو کامبے میں پیر رواں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یقیناً مبلغین کی ایک بڑی تعداد اس علاقے میں آتی رہی ہو گی۔ کیونکہ یہاں بڑی مقدار میں لوگ بوہرہ ہوئے۔ اس فرقے میں پہلا اختلاف پندرہویں صدی میں ہوا۔ اس دوران ہندوستان میں داعی کا نمائندہ احمد آباد میں مقیم تھا۔ جس کا نام داؤد تھا۔ اندرونی اختلاف کے

باعث اس کا ایک پیروکار جعفر پٹنی سنی ہو گیا۔ یوں بوہروں کا سنی فرقہ وجود میں آیا جن کا مرکز پٹن ہے اور وہ کونکان کے ساحل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سنی بوہروں نے کاشتکاری کا پیشہ اختیار کیا۔ جبکہ اصل بوہرہ گروہ اپنے آبائی پیشے تجارت کے ساتھ منسوب رہا۔ (بوہرہ کا لفظ گجراتی لفظ ووہرہ ہے جس کا مطلب تاجر ہے)

دوسرا بڑا نفاق' اس وقت ہوا جب عین پر سنی عثمانی ترکوں کے قبضے کے بعد داعی سیدین یوسف ابن سلیمان (متوفی 1567ء) ہندوستان چلا آیا اور سدھ پور میں مقیم رہا۔ بوہروں کی اکثریت نے اسے قبول کر لیا اور اپنا فرقہ داؤدی کے نام سے تشکیل کیا۔ جبکہ ایک بہت چھوٹی لیکن موثر اقلیت یمن کے داعی سے منسلک رہی۔ انہیں سلیمانی بوہرے کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ فرقہ مزید تقسیم ہوا۔ 1765ء میں حیات اللہ نامی شخص نے سیدین سے برتر ہونے کا دعویٰ کیا۔ ایک اور نفاق 1897ء میں ناگپور میں ہوا جس کے بانی کا دعویٰ تھا کہ اس کا براہِ راست تعلق امام سے ہے۔ رواں صدی کے شروع میں مہدی باغ والا نامی یہ فرقہ بڑی تیزی سے' لیکن باقی معاشرے سے کٹ کر' ترقی کر رہا تھا۔

اگرچہ بوہرہ اپنے آخری دور میں شیعوں کے قریب رہے لیکن اورنگ زیب کے دور میں ان پر خاصی سختی رہی۔ چنانچہ انہوں نے تقیہ اختیار کیا مذہبی ادب چھپا کر رکھا جاتا رہا ہے اور اب منظر عام پر آ رہا ہے اپنے عمومی مذہبی رویے میں یہ عام ہندوستانی مسلمانوں کی طرح ہیں انہیں کی طرح یہ اولیاء کے مزاروں کا احترام کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے داعین کے مزار ہیں۔ جن میں سے آٹھ احمد آباد میں ہیں۔ سورت میں' جو آج کل داؤدیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے' سات داعین کے مزار ہیں اولیاء کی طرح ان کے مزاروں پر بھی حاضری دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے ماننے والوں کی مرادیں امام تک پہنچا دیں۔ سب سے زیادہ حاضری چندا بھائی کے مزار پر دی جاتی ہے جو بمبئی میں قلعے کے علاقے میں ہے۔

سلیمانیوں کا مقام دعوت بڑودہ میں ہے۔ یہ اپنا مذہبی ادب اردو میں لکھتے ہیں جسے گجرات میں ہمیشہ سے مسلم بالائی طبقے کی زبان خیال کیا جاتا رہا ہے۔ جبکہ داؤدی اپنا مذہبی ادب گجراتی میں طبع کرتے ہیں۔ حیدر آباد اور بمبئی میں واقع مراکز میں ان کے کچھ دینی مدارس ہیں جہاں ان کے علماء تھوڑے سے طالب علموں کو حقائق یعنی بوہرہ تعلیمات کا درس دیتے ہیں۔

اسماعیلیوں کی نظاری شاخ میں ایک تبدیلی بالکل مختلف طرح کی تھی۔ حسن صباح

جس نے اپنے پہاڑی قلعے الموط میں شہزادہ نظار کو پناہ دی تھی' 1124ء میں انتقال کر گیا۔ چالیس سال بعد حس الاکریش اسلام نے قیامت برپا ہونے کا اعلان کر دیا جس کا مطلب شریعت کی تقلیب روحانی تھا۔ اس میں مناہیاتِ شرعی کو ختم کر دیا گیا تھا یعنی ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان کیا گیا تھا۔ امام کو خدا کی تجسیم کامل خیال کیا جاتا تھا۔

امام کے نیچے حجت ہے جسے بزبان فلسفہ پہلا شعور کہا جاتا ہے اس نظام میں امام کا درجہ پیغمبروں سے برتر ہے۔ مذہبی احکام کی تشریح تاویل سے کی جاتی ہے اور مورخین کو رفتہ رفتہ علم کی گہرائیوں سے روشناس کروایا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے پانچ ستونوں کی تعمیر بھی روحانی طریقہ سے کی جاتی ہے۔

اگرچہ درست تاریخوں کا تعین مشکل ہے لیکن اتنا بہر حال طے ہے کہ پہلے نظاری مبلغ ہندوستان میں "قیامت" کے فوراً بعد وارد ہوئے۔ ان کا نام پیر نوست گورو بیان کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی کرامات سے گجرات کے ہندو حکمران راجہ سدھریہ جیا سنگھ کو متاثر کر کے مسلمان کرنا چاہتا تھا۔

بیسویں حجت پیر شمس کے متعلق بہت سی روایات داستانوں میں بکھری ملتی ہیں۔ وہ بدخشاں سے براستہ بلوچستان کشمیر وارد ہوا تھا۔ جہاں سے وہ ملتان اور پھر اچ پہنچا عین ممکن ہے کہ ہنزہ کی دور دراز وادی میں بسنے والے اسماعیلی اسی کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اس مسلک میں شامل ہوئے ہوں۔ ملتان میں اس کا مدفن مقبرہ شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے۔ سندھی اور سرائیکی لوک گیتوں میں اس شہید محبت کا ذکر کرتے ہوئے بیشتر اوقات اسے مولانا روم کے صوفیائی معشوق سے ملایا جاتا ہے شمس کے پیروکار آج بھی مغرب میں ملتان سے ڈیرہ غازی خاں تک اور جنوب مشرق میں بہاولپور میں ملتے ہیں۔ شمسیوں نے بھی اسماعیلی فرقوں کی طرح کئی ہندوانہ رسوم کو برقرار رکھا لیکن وہ آغا خاں کے حلقہ ارادت میں آتے ہیں۔ ایک مفروضہ یہ بھی ہے جن رافضیوں کا فیروز شاہ شاکی تھا اور جنہیں اس نے ختم کرنے کی کوشش کی دراصل پیر شمس کے ماننے والے تھے۔ یہ ممکن ہے کیونکہ ابھی اثناء عشری شیعوں کو کوئی سیاسی اہم مقام حاصل نہیں تھا اور اسماعیلی فرقہ ہمیشہ سے سنیوں کی نفرت کا مرکز تھا۔

ان کا سب سے نمایاں داعی پندرہویں صدی کے اوائل کا پیر صدرالدین تھا جو اچ

کے نزدیک دفن ہے۔ سندھ کے لوہانوں کو مسلمان کرنے کا اعزاز اسے دیا جاتا ہے۔ نو مسلموں کو خواجہ کا لقب بھی انہوں نے دیا تھا جو بعد میں کھوجہ ہو گیا۔ ان کی کتاب "داس اوتار" ہندومت اور اسلام کا عجب امتزاج ہے۔ مصنف اپنے ہندو قارئین کو آگاہ کرتا ہے کہ وشنو کے جس دسویں اوتار کا انتظار کیا جارہا تھا مغرب میں نمودار ہو چکا تھا وہ علیؓ ہیں اسی تعلق کی بنیاد پر وہ محمدؐ کو برہما کا درجہ دیتے ہیں۔

پیر صدرالدین نے ہی پہلا جماعت خانہ قائم کیا۔ آج بھی کھوجہ برادری کی معاشرتی زندگی کا مرکزی جماعت خانہ ہے یہ نام غالباً انہوں نے چشتی صوفیاء کے حلقوں سے لیا۔ درحقیقت سندھ اور گجرات کے صوفیوں اور اسماعیلیوں میں جتنے گہرے روابط تھے بعد کے زمانے میں آج تک قائم نہ ہو سکے۔ اسماعیلیوں کے مذہبی ادب کو جنان کہا جاتا ہے جس کے قدیم ترین نمونے پیر صدر کے عہد تک جاتے ہیں۔ اپنے رنگ روپ میں یہ گجراتی اور سندھی صوفیانہ کلام سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں بھی عورت کو روح، جہیز کو نیک اعمال کی علامات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے زبان و بیان کے اعتبار سے پہلا جنان مسلم صوفیانہ شاعری اور ہندو بھجن کے بین بین ہے۔

پیر صدرالدین کی جگہ ان کا بیٹا حسنؒ قدیرالدین اپنے فرقے کا رہنما بنا اس کا انتقال بھی اچ میں ہوا۔ اس کے اٹھارہ بیٹوں میں سے سب سے چھوٹا امام شاہ گجرات میں سکونت پذیر ہوا۔ جہاں محمود بیگرا نے اسے ایک متقی شخص کے طور پر عزت دی اور اپنی ایک بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ امام شاہ کا 1215ء میں انتقال ہوا۔ جس کے بعد ایک بڑا افتراق رونما ہوا۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک جو راجپوت بیوی میں سے تھا برہان پور میں مقیم رہا جو بالآخر ست پنتھی یا امام شاہی اسماعیلیوں کا مرکز بن گیا۔ یہ فرقہ اپنا عشر داعی کو دینے کی بجائے امام شاہ کے جانشینوں کو دیتے تھے۔ یہ شاخ ہندوانہ طور طریقوں میں اس قدر آگے نکل گئی کہ امام شاہ کو دیوتا اندر کی تجسیم اور اس کے بیٹے نور محمد شاہ کو وشنو کی تجسیم قرار دینے لگے۔ ان کا ادب بھی غیر معمولی حد تک ہندومت اور اسلام کا ہم زیستانہ ملاپ ہے۔ بعض تصنیفات میں دخترِ رسولؐ بی بی فاطمہؓ کو لکشمی دیوی، بی بی عائشہؓ کو ساوتری اور آدمؑ کو مہادیو یا ایشور کے مساوی قرار دیا جاتا ہے۔ بڑی ست پنتھی تصنیف "داس اوتار" میں پیر شمس کو ایک طوطے کا بہروپ لے کر ایک شیطان صف انسان کو ست پنتھی بنا دکھایا گیا ہے خیال رہے ہندوستانی

روایات میں طوطا عقل کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی روایات دوسرے ہندوستانی داعیوں کے گرد بھی گھومتی ہیں۔ یہ فرقہ جو خود کو ست پنتھی مومن بھی کہلاتا ہے شادی بیاہ اور دوسری تقاریب کے کوئی خاص رسوم و رواج نہیں رکھتا۔ ان لوگوں نے رفتہ رفتہ اکثریت کے مذہبی رجحانات سے اثرات قبول کر لئے۔

کھوجوں کی ایک شاخ پیر مشائخ کی ہے جو سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں سامنے آئے۔ پیر مشائخ سے ایک سنی سلسلہ بھی چلتا ہے جو معین الدین چشتی تک جاتا ہے اس کے ماننے والے زیادہ تر شیعہ ہیں۔ سندھ، گجرات اور کچھ کے علاقوں میں اور بھی چھوٹے چھوٹے فرقے پائے جاتے ہیں جن میں سے کئی خاندان بعد ازاں ہجرت کر کے مشرقی اور جنوبی افریقہ چلے گئے۔ یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ بوہروں کے برعکس نظاری کھوجے فاطمی قواعد کی پابندی نہیں کرتے ان کا ایک رواجی قانون ہے جس میں کئی ہندوانہ عنصر شامل ہیں۔

آغا خاں کے ایران سے 1840ء میں سندھ آنے پر کھوجہ برادری کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

تیسرا باب

مغلوں کا ہندوستان

ملٹن کی جنت گم گشتہ (Paradise Los) کے رویائے آدم میں "عظیم مغلوں کا آگرہ اور لاہور" بھی شامل ہے۔ اس مصرعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغل عہدِ حکومت یورپی علماء اور شعراء کے ذہنوں پر کس طرح مرتسم تھا۔ وہ اسے ہندوستانی اسلام' بلکہ شکوہِ اسلام کا جوہر تصور کرتے تھے جس کی دوسری نظیر شائد' صرف الف لیلیٰ ہی میں دیکھی جاسکتی تھی۔ اس میں دہلی کا مذکور نہ ہونا تاریخی صورتحال دیکھ کر سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس شہر کو تیمور نے ملیامیٹ کر دیا تھا اور مغل دور کے آخر تک بحال نہ ہو سکا تھا۔ اس دوران اس کے صرف ایک حصے 'پرانا قلعہ میں شیر شاہ سوری نے کچھ اہم عمارات ہوائیں تھیں۔

لودھی خاندن کے آخری چند سالوں کے دوران شمالی ہندوستان مقابلتاً پرامن رہا۔ لیکن بابر نے برصغیر پر کئی چھاپوں کے بعد بالآخر 1525ء میں لودھیوں کو پانی پت کے میدان میں حتمی شکست دی اور شمال مغربی برصغیر کا حکمران بن گیا۔ بابر تیمور کی اولاد سے تھا۔ اس نے لڑکپن سے سیاسی اور جنگی زندگی کا آغاز کیا اور افغانستان اور فرغانہ میں اپنے رشتہ داروں سے کئی جنگیں لڑیں لیکن وہ محض جنگجو بادشاہ نہیں تھا۔ اس نے چغتائی ترکی میں اپنی سوانح عمری لکھی جسے ایک بادشاہ کی پرکشش اور سبق آموز خود نوشت خیال کیا جاتا ہے۔ اسلامی تصوف میں دلچسپی کے باعث اس نے وسط ایشاء کے ممتاز صوفی عبیداللہ احرار کی کتاب کا ترکی میں منظوم ترجمہ کیا (رسالہ اولیدیہ) ادبی صلاحیت اور مذہبی مسائل میں دلچسپی تیموری

خاندان میں نسل در نسل چلی۔
بابر کا چھیالیس برس کی عمر میں 1530ء میں انتقال ہوا۔ اور اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا۔ بابر اسے بہت چاہتا تھا اور اس نے ایک مذہبی سامری رسم ادا کرتے ہوئے اس کے بدلے اپنی زندگی پیش کی ہے۔
ہمایوں کو اپنے بھائیوں (جن میں سے کامران مرزا ترکی کا عمدہ شاعر تھا) اور پٹھان سردار شیر شاہ سوری سے جنگیں لڑنا پڑیں۔ شیر شاہ سوری سے مقابلہ زیادہ سخت اور فیصلہ کن تھا۔ سوری بابر سے بھاگ کر مشرقی صوبوں میں چلا گیا تھا اور جونپور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بنگال کے سلطان کو شکست سے دوچار کر کے حکومت پر قابض ہو گیا تھا۔ ہمایوں کی حکمرانی کے پہلے دس سالوں پر اس ذہین منصف اور مدبر مسلمان حکمران کے خلاف مسلسل جنگ کے سائے ہیں۔ اس نے 1539ء میں ہمایوں کو شکست دی' بنگال کا بادشاہ بنا اور شیر شاہ لقب اختیار کیا۔ ایک سال کے بعد اس نے ہمایوں کو قنوج کے قریب ایک بار پھر شکست دی اور اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کیا۔ اس نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں شمالی پنجاب کو شامل کر لیا اور جہلم کے نزدیک ایک قلعہ تعمیر کروایا جس کا نام بہار میں اپنے مستقر کے نام پر روہتاس رکھا۔
شیر شاہ مسلم ہند کے عظیم حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ لیکن اس کی کامیابیوں سے اس درجہ صرف نظر کیا جاتا ہے کہ سوائے مغلوں کے ایک باغی سردار کے وہ کسی شمار میں نہیں آتا۔ بطور بادشاہ نہایت عادل اور بے مثل انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ مقابلتاً مختصر دور حکومت میں اس نے سونار گاؤں سے دریائے سندھ تک 1800 کاروان سرائے بنوائیں جن کے ساتھ مسجد اور پانی تک اترتی سیڑھیوں والے کنویں یعنی باؤلیاں ملحق تھیں۔ سلطان 1545ء میں بارود کے پھٹنے سے مر گیا۔ سہرام میں ایک مصنوعی جھیل میں بنا اس کا مقبرہ گنبد دار مقبروں کی مرعوب کن مثال ہے۔
شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا اسلام شاہ حکمران بنا۔ اس کے دور میں مہدی کے پیروکار منظر عام پر آئے۔ سلیم چشتی کے ایک خلیفہ بیانہ عبداللہ نیازی نے مہدیت قبول کر لی تھی۔ اس دور کا ممتاز ماہر الٰہیات شیخ علائی اس کے زہد و تقویٰ سے متاثر تھا۔ بدایونی نے اس کا ذکر خاصے ہمدردانہ انداز میں کیا ہے۔

"اپنے آباؤاجداد کے طور طریقوں کو چھوڑا' علمیت و شیوخیت سے
دستبردار ہو کر اپنی عزت نفس اور پندار باطل کو پاؤں تلے کچلا اور خود کو
مکمل کسر نفسی سے گردوپیش کے ان غربا کی خدمت کے لیے وقف کر
دیا جنہیں وہ ہمیشہ بہ نظیر فہمائش دیکھا کرتا تھا"

شیخ نیازی سے ذکر سیکھا اور 300 افراد پر مشتمل ایک خانقاہ بنائی جس میں مذہبی اشتراکیت (Religion Communism) کا دور دورہ تھا۔ سیاسی وجوہات کی بناء پر مرشد نے انہیں گجرات بھیج دیا۔ گجرات میں موسیقی اور دھمال کا چلن تھا جس کی وہ ایک اچھا مہدی ہونے کے ناطے ممانعت کرتے تھے۔ اس لئے جلد ہی بیانہ واپس لوٹ آئے پھر

"سلطان پور کے عبداللہ المقلب بہ مخدوم الملک نے بندگان خدا کو
نیست و نابود کرنے پر کمر باندھی"

مخدوم الملک ممتاز قدامت پسند ماہر الہیات تھا۔ اگرچہ یہ زور دار خطاب اسے ہمایوں نے دیا تھا لیکن اس نے بڑی وفاداری سے سوری اور پھر دوبارہ مغلوں کی خدمت کی۔ کئی دہائیوں تک یہ ہندوستانی علماء کا رہنما رہا۔ اس نے اسلام شاہ کو قائل کر لیا کہ شیخ علائی انقلابی ہے اور مہدی ہونے کا دعویدار ہے۔ نتیجتاً اسلام شاہ نے سلیم علائی کو جلاوطن کر کے دکن بھجوا دیا جہاں اس کے گرد سپاہی جمع ہو گئے۔ 49-1848ء میں اس نے طاقتور افغان فوج لے کر بیانہ پر چڑھائی کر دی اور میاں عبداللہ نیازی کو بے رحمی سے سزا دی۔ جو اس دوران مسلسل قرآن کی آیت "خدا ہمارے گناہ معاف کرے" پڑھتا رہا۔ اسلام شاہ کے سپاہی باوجود ظالمانہ زدوکوب کرنے کے اسے ہلاک نہ کر سکے۔ بالآخر اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ مہدیت کے رجحانات سے کنارہ کش ہوا اور نوے برس کی عمر میں بمقام سرہند 1591ء میں فوت ہو گیا۔ تاہم اس کے مرید شیخ علائی کو دکن سے بلوا کر کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا (1550ء)

"کہتے ہیں کہ رات بھر میں اس کے جسدِ خاکی پر اتنے پھول ڈالے گئے
کہ پورا جسم ڈھک گیا اور یوں کہئے وہی اس کا مدفن بنے"

اس تعزیر کا تقابل اکثر غیاث الدین کے ہاتھوں سیدی موالی کی سزا سے کیا جاتا ہے۔ دونوں واقعات میں بے گناہ متقیوں کو محض سیاسی وجوہ پر قتل کیا گیا۔ سوری خاندان جلد ہی کمزور ہو گیا۔ کمزوری کے اسباب میں وسیع فرقہ ورانہ کشمکش بھی شامل تھی۔ اس سے

ہمایوں کی ہندوستان واپسی آسان ہو گئی۔

ہمایوں اپنی دوسری شکست کے بعد ہندوستان سے فرار ہوا تھا۔ پہلے اس نے سندھ میں پناہ لی۔ یہاں کے مقامی شاہ کو 1520ء میں ترک ارغونوں نے ہٹا دیا تھا یہاں اس کے باپ کا وفادار دوست ترکمانی سردار بیرم خاں اس سے آملا۔ یہیں اس کا بیٹا اکبر 1542 میں عمر کوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا۔ پھر اس معزول حکمران نے اپنی ایرانی ماں کی وساطت سے ایران میں روابط بڑھائے اور صفوی بادشاہ شاہ طماسپ کے دربار میں چلا گیا۔

طماسپ کے باپ شاہ اسماعیل اول نے 1501ء میں ایران کا سرکاری مذہب شیعہ اسلام قرار دیا تھا۔ کہا جاتا ہے طماسپ نے ہمایوں کے سر پر تاج رکھا جس کے "شیعیت کی علامت کے طور پر بارہ کنگرے تھے۔ اس کا اردبیل کی خانقاہ میں جانا شیعیت سے متاثر ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ شیعیت سے کس درجہ متاثر ہوا تھا' اس کے قیام ایران کے باعث بعد ازاں ہندوستان میں ایرانی مصوروں اور شعراء کی کثیر تعداد وارد ہوئی۔ میر سید علی "مانی ثانی" جس کی تصاویر کا ہر ورق شاہکار ہے' دوست محمد اور عبدالصمد جیسے مصوروں نے ہندوستانی فنون لطیفہ کو نئی تحریک دی۔ انہوں نے مقامی مصوروں کے ساتھ مل کر مغل منی ایچر کی بنیاد رکھی۔

بیرم خاں نے دھیرے دھیرے اپنے آقا کی ہندوستان واپسی کو ممکن بنانے میں کامیابی حاصل کی۔

"ہندوستان کی فتح ثانی اور تعمیر سلطنت اس کی انتھک کوشش' شجاعت اور دانشمندانہ حکمت عملی کے باعث ممکن ہوئی"

"شیعہ ہونے کے باوجود بیرم خان ایک معروف صوفی کی اقتداء میں نماز ادا کرتا جس کے اثرات دِل کے نرم گوشوں میں گھر کر گئے تھے"

ہمایوں کے تخت دہلی پر 1555ء میں واپسی کے بعد سکندر لودھی کے درباری شاعر جمالی کمبوہ کے بیٹے شاہ گدائی کو سلطنت صدر الصدور بنوانے میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ چھ ماہ بعد 1556ء میں ہمایوں اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا۔ اس کا نابالغ بیٹا اکبر اس کا جانشین بنا۔ جلد ہی اکبر نے پانی پت میں سوریوں کو فیصلہ کن شکست دے کر اپنی لیاقت بطور بادشاہ منوالی۔ اسی میدان میں اس کے دادا نے لودھیوں کو شکست دی تھی۔ سوریوں کے

جرنیل ہندو ہیموں نے پانی پت میں ہتھیار ڈال دیئے۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کے باعث ہم تیموری خانوادے کے خاندانی معاملات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

شہزادی گلبدن بیگم کی ماں ایران کے ولی احمد جام کے گھرانے سے تھی۔ اس نے اپنی خوش کن یادداشتوں میں اپنے باپ' بھائی اور دوسرے افراد خانہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ فارسی دانی اور خطاطی پر توجہ دینے والی شاہی خاندان کی باکمال خواتین میں گلبدن بیگم سر فہرست ہے۔

ہمایوں شطاری سلسلے کے دو صوفیاء سے خصوصاً متاثر تھا۔ ایک شیخ بہلول جنہیں شیخ پھول بھی کہا جاتا ہے اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی محمد غوث گوالیاری۔ ہمایوں ان کی "اتنی عزت کرتا تھا کہ کوئی اور شائد ہی اس درجہ کو پہنچتا تھا" ایرانی صوفی شاعر فرید الدین عطار کی آل اولاد ہونے کے دعویدار اس کے نو کے نو لڑکے صوفیانہ رجحان رکھتے تھے۔ صوفیانہ کمالات اور دم و درود میں شیخ بہلول سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اسے ہمایوں کے مزاج میں اتنا زیادہ دخیل تصور کیا جاتا تھا کہ اس کے تخت کے دعویدار بھائی ہندال نے **1538**ء میں انہیں سزائے موت دی۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد غوث نے بارہ برس چنار کی پہاڑیوں میں گوشہ نشینی میں گزارے اور کٹھن معاملات سے دوچار ہوا۔ پھر گوالیار چلا گیا۔ **1588**ء میں دارالحکومت آگرہ میں بڑے کروفر ار شان و شوکت سے وارد ہوئے مگر برہم ہو کر گوالیار کو لوٹ گئے۔

"جہاں انہوں نے بقیہ عرصہ اپنے مریدین کی تربیت' ایک سرائے کی تعمیر' درویشوں سے مخصوص دھمال' سماع اور منازل سلوک طے کرنے میں صرف کیا"

اس نے **1652**ء میں وفات پائی اس کے مزار پر بعد ازاں سرمگیں مرمر سے ایک گنبد بنوایا گیا۔ کیونکہ

"وہ اپنی برکات و نوازشات کے باعث اتنا محترم ہو چکا تھا کہ مطلق العنان اور طاقتور حکمران بھی اس کے اعزاز میں خلوص و نیاز سے سر جھکاتے تھے"

محمد شاہ کی شہرت کا دارومدار بنیادی طور پر "جواہر خمسہ" پر ہے۔ عربی اور فارسی

میں لکھی گئی یہ کتاب اسمائے الٰہی اور مسائلِ علم نجوم کے باہمی تعلق پر ہے۔ اپنے بھائی کی طرح یہ بھی دم درود اور سحر کلام کی مشق رکھتا تھا۔ یہ اس کی وجہ شہرت بھی تھی۔

''معراج نامہ'' میں عالم وجد میں لکھی گئی تعلّی کے باعث عوام الناس کے ہاں مشکوک ٹھہرے۔ ''جواہر خمسہ'' کے عمیق مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کے نظری علم اور عملی ریاضت کا خود محمد غوث کی اپنی تعلیمات سے تعلق کس طرح کا ہے۔ لیکن اس کے لیے دونوں مذاہب کی باطنی یا شرعی روایات سے مکمل واقفیت ضروری ہے۔ شیخ محمد غوث یا اس کے کسی مرید نے ہتھایوگا کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ عمل اس کے مخصوص رویے کا اظہار ہے۔ محمد غوث نے اعلیٰ روحانی سطح پر دو ہندوستانی روایات کے ملاپ پر جو کام کیا اسے ایک خاص حوالے سے تان سین نے مکمل کیا۔ ان کا یہ مرید اکبر کا درباری موسیقار اور ہندوستان کی موسیقی کے نامور فنکاروں میں سے ایک تھا۔ سرمگیں گنبد میں وہ آپ کے پہلو میں دفن ہے۔ سنجیدہ طبقے کے ماہرین الٰہیات کی فن موسیقی کی مخالفت بے وجہ نہیں تھی۔ یہی وہ فن تھا جس میں ہندوستانی اور اسلامی روایات کے مکمل ملاپ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

چودہ سال کی عمر میں عنانِ حکومت سنبھالنے والے اکبر کو ایسا صوفی کہا جاتا رہا ہے جس نے ایک سلطنت تشکیل دی۔ اکبر پر جدید و قدیم ہر دو مورخین کی آراء دو انتہاؤں کی حامل ہے۔ کچھ اسے ہندوستان کا عظیم ترین اور سب سے روادار حکمران قرار دیتے ہوئے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں' جبکہ دوسری انتہا پر کھڑے مورخین کی رائے میں اس کی مفاہمتی سیاست کے باعث ہندوستان میں اسلام کی قوت ختم ہو گئی۔ بلاشبہ اکبر کو فوج کے لیے باصلاحیت سپہ سالار اور دانشور دوست دونوں میسر تھے۔ اس کے وفادار سپریم کمانڈر بیرم خاں نے ابتدائی ایام حکومت میں اسے سہارا دیا۔ ایام جوانی میں مختلف وجوہات کی بناء پر اکبر کے تعلقات اپنے دوست سے کشیدہ ہو گئے۔ بیرم خاں مکہ جاتے ہوئے 1562ء میں قتل ہو گیا۔ اکبر نے اس کی بیوہ اور اپنی نزدیکی رشتہ دار سلیمہ بیگم سے شادی کر لی۔ بعد ازاں بیرم خاں کا بیٹا عبدالرحیم خانخاناں اکبر کا خاص اثاثہ ثابت ہوا۔ وہ سلیم (بعد ازاں جہانگیر) کا اتالیق بنا اور اس کی شادی شاہی خاندان میں ہوئی۔ عبدالرحیم شاندار سپہ سالار' فارسی اور ہندی کا اچھا شاعر اور فنون لطیفہ و شاعری کا باذوق نقاد تھا۔ علماء اور اہلِ ہنر کی

قدر دانی میں شہنشاہ کا مدِ مقابل تھا۔ اس نے 1576ء میں گجرات فتح کیا اور 1584 میں دوبارہ اسے حاصل کیا۔ 1591ء میں سندھ اور کچھ بعد دکن کے کچھ حصوں کو سلطنت میں شامل کیا جہاں کئی سال بطور صوبیدار برہان پور میں مقیم رہا۔ گجرات میں بس جانے والے سندھ کے ایک عالم میر معصوم نامی دربار سے وابستہ ہو گیا اس نے فتح پور سیکری کی تزئین میں فن خطاطی کا مظاہر کیا اکبر کا سفیر بن کر ایران گیا اور شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے آبائی علاقے سندھ کی معتبر واقعہ نگاری کی۔

ناخواندہ ہونے کے باوجود اکبر کو مذہبی مسائل سے گہری دلچسپی تھی اور اپنے دادا بابر کی طرح اکبر بھی درویشوں کا معتقد تھا۔

درویش متصوفانہ اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 1564ء میں اس نے اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر پہلی برہنہ پا حاضری دی۔ بعد میں اس طرح کی کئی حاضریاں گزاری گئیں جن میں سے ایک راجپوتوں کے مضبوط مرکز چتوڑ کی فتح کے شکرانے میں تھی۔

"یہ کہہ کر پورے دربار کو قہقہہ بار کر دیا کہ اللہ کے نزدیک بھی گائے کی بہت حرمت ہے ورنہ قرآن کے پہلے پارے میں اس کا ذکر کیوں کرتا"

ان سالوں میں اکبر کی مذہبی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ حقیقت کے متلاشی کو یہ امر بہت ناگوار گزرا کہ بلند ترین مذہبی ادارے بھی بدعنوانی سے پاک نہیں۔ خانقاہوں کی دیکھ بھال اور علماء کے وظائف کا انتظام ادارہ صدر الصدور کی ذمہ داری تھا۔ اس ادارے میں بھی رشوت ستانی اور اس طرح کی دوسری قباحتوں کے سراغ ملے۔ اس وقت صدر الصدور عبدالغنی مشہور صوفی عبدالقدوس کا پوتا تھا۔ اس نے اپنے گھرانے کی روایات ترک کر دی تھیں۔ "عبدالغنی جتنا بااختیار اور طاقتور صدر الصدور کسی بادشاہ کے عہد میں کوئی اور نہیں ہوا" کچھ علماء کی تنگ نظر بھی اکبر کی طبع پر گراں گزرتی تھی اس حوالے سے بدایونی بھی، جسے اکبر کے درباریوں میں سے قدامت پسند ترین خیال کیا جاتا ہے' اکبر سے متفق تھا۔ عبادت خانے کی ایک مجلس کی بدایونی کی لکھی ہوئی کارروائی سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

"ایک رات اچانک علمائے عصر کی گردن کی رگیں پھول گئیں جس کے بعد بے پناہ

شور اور افراتفری پھیل گئی۔ بادشاہ سلامت اس بد تمیزی پر سخت ناراض ہوئے اور مجھے کہنے لگے "آئندہ اگر علماء میں سے کسی کی بے ہودہ گوئی یا آپے سے باہر ہونے کی اطلاع ملی تو میں اسے مجلس سے نکلوادوں گا" میں نے بڑی آہستگی سے آصف خاں کو بتایا "میں اگر احکامات پر عمل کروں تو زیادہ تر علماء کو مجلس سے نکلنا پڑے گا" بادشاہ نے اچانک پوچھا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ میرا جواب سن کر خوش ہوئے اور اس رائے کو پاس بیٹھے حاضرین کو بھی سنایا"

علمی حوالے سے فیضی اور ابوالفضل عامی کے اثرات کی گرفت روز افزوں تھی۔ یہ دو عالم اور شاعر شیخ مبارک ناگوری کے بیٹے تھے۔ شیخ مبارک پر مہدی تحریک کے نمایاں اثرات تھے۔ بدایونی نے اگرچہ اس کے ابتدائی دور کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی تعریف کی ہے مگر اس کے دنیا داری کے بڑھتے ہوئے رجحان کا بھی شاکی ہے۔ فیضی (پیدائش 1547ء) دربار میں 1566ء میں لایا گیا۔ جبکہ اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل بہت بعد میں کہیں 1574ء میں داخل دربار ہوا۔

فیضی کی ایک رباعی بادشاہ کے احساسات کا اظہار ہے۔

یا رب قدمی براہ توصیدم دہ شوق بنہاتخانہ تجریدم دہ
دل بسگی بسیر تھیقم بخش آزاد گئی زقید تقلیدم دہ

1578ء میں شکار کی ایک دعوت کے دوران طاری ہونے والی وجد آور واردات کے نتیجے میں بادشاہ اصل اور خالص اسلام کی بجائے محیط کل کی طرف متوجہ ہوا اور آخر کار 1579ء میں اکبر نے "محضر نامہ" جاری کیا۔ ونسنٹ سمتھ کہتا ہے کہ یہ بادشاہ کے مبرا عن لخطا' ہونے کا اعلان تھا۔ اس کی رو سے بادشاہ کا اجتہاد کرنے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ یعنی کہ اسے حق مل گیا کہ وہ مذہبی اور سیاسی معاملات پر عدل و انصاف کے اصولوں کی روشنی میں خود فیصلہ کر کے احکام جاری کر سکتا ہے۔ اس دستاویز میں سلطانِ عادل کو مجتہد سے برتر مقام دیا گیا تھا۔

یہ دستاویز شیخ مبارک نے تیار کی تھی اور صدر الصدور اور دوسرے علماء سے اس پر زبردستی دستخط کروالئے گئے تھے۔ اسی سال عبدالغنی اور مخدوم الملک (جو باہم چپقلش رکھتے تھے) کو زبردستی حج پر بھجوا دیا گیا۔ واپسی پر ناقابل یقین حد تک دولت مند مخدوم الملک احمد آباد میں یا تو مر گیا یا قتل کروا دیا گیا۔ جبکہ کچھ ہی دیر بعد عبدالغنی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور وہ قید ہی

میں قتل کر دیا گیا (اس نے اکبر کی خواہش کے برعکس ایک برہمن کو سزا دی تھی) محضر کے نفاذ کے دو سال بعد دینِ الٰہی کی تدوین کی گئی۔ اسے مذہب کی بجائے برادری یا حلقہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ اس کے انیس ارکان میں سے ہندو صرف ایک تھا۔ اس اصطفائی (یعنی کہ مختلف مکاتبِ فکر کے منتخبات پر مبنی) تحریک کے قواعد مختلف مذاہب کی روایات میں سے بہترین اصول منتخب کر کے مرتب کئے گئے تھے۔ مثلاً نفسانی خواہش' دھوکہ دہی' غیبت و بدگوئی اور جبر کی ممانعت کے اصولوں میں جین کے اہمسا کی جھلک نظر آتی ہے۔ جبکہ تجرد کیتھولک عیسائیت سے ماخوذ ہے۔ دین الٰہی کے مرکزی ستونوں میں سے ایک روشنی کی تقدیس ہے چاہے سورج کی ہو یا دائمی آگ کی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی جڑیں زرتشتی مذہب میں ہوں۔ ابوالفضل نے حقانی بادشاہت کی آفاقی نشانیوں کے ایرانی تصور پر نظر ثانی کی اور انہیں جلالِ اکبری میں شناخت کرتے ہوئے "بادشاہ سلامت کو عوام کا روحانی رہنما" قرار دیا۔ ابوالفضل نے ہی اکبر سے وابستگی کے چار مدارج تشکیل دیئے جن میں کوئی شخص اپنی جائیداد زندگی' وقار اور ایمان سے اکبر کے حق میں دستبردار ہو جاتا تھا۔ دین الٰہی کے متعارف کروائے جانے پر بدایونی کی اکبر کے مدحت نفور میں بدل گئی۔ اسی طرح فیضی کے معاملے میں دوستی کی جگہ نفرت نے لے لی۔

بدایونی شریف آمل کا زہر آلود لہجے میں ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ایمان کے چار مدارج کا حامل یہ شقی القلب جو عقل و فہم سے بعید کہانیوں کی جگالی کرتا تھا آج بنگال میں بادشاہ سلامت کے مذہب کا پیغمبر ہے۔

بدایونی کے بعد بہت سے دوسرے مصنفین نے بھی دینِ الٰہی کی مذمت کی اور اسے اسلام سے انحراف قرار دیا۔ کچھ کے نزدیک یہ فقط اسلام میں بدعت کا درجہ رکھتا تھا۔ معاملہ کچھ بھی رہا ہو خود اکبر نے پیغمبری یا الوہیت جیسے کسی بھی دعویٰ سے انکار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو اللہ اکبر سے غلط فہمی ہوئی ہو کہ اکبر خدائی میں شراکت کا کسی طور پر دعویدار ہے۔ دین الٰہی کی توضیح بعض اوقات غیر مقلد شخصیت کے فرقے کے طور پر بھی کی جاتی رہی ہے جس میں اکبر نے خود کو انسان کامل کا کردار دیا۔ اس طرح کے انسان کا تصوف کے عالم مدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ابن عربی کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والا ایک صوفی' جس نے "مکار صوفیوں کی معمول کی بحث کے انداز میں وجودی وحدانیت پر دلائل متعارف

کروائے تھے اور یوں کھلے انحراف اور بدعت کا اجازت نامہ دے دیا تھا' شیخ تاج الدین نے انسان کامل سے مراد خلیفہ عصر لیا اور یہی اکبر بھی قرار دیا۔ بعض نے دینِ الٰہی کو شمسی توحید قرار دیا۔ اس کے بنیادی اصولوں کا سراغ سہروردی مقتول کے اشراقی مکتبِ فکر میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی حکمتِ اشراق سے ہندوستانی مسلم دانشور بخوبی آگاہ تھے۔ اس نے اسلامی' ایرانی اور یونانی افکار سے متصوفانہ اور لاادری نظریات ملا کر اپنا ایک فلسفیانہ نظام دینے کی کوشش کی اور اس کی قیمت اپنی زندگی سے ادا کی (لاادری' جو خدایا کائنات کی ابتدا و انتہا کے بارے میں کوئی بھی علم رکھنے سے انکار کرتا ہے)

اکبر کے صلح کل کے مسلک کا کئی طرح سے اظہار ہوتا ہے۔ یقیناً اس نے بھی ہمسایہ ریاستوں کو ضم کرنے کا کام جاری رکھا لیکن سلطنت میں اس نے ہندوؤں کو انتظامیہ میں خاصہ بڑا حصہ دیا۔ جزیہ غیر مسلموں کے دوسرے درجے کے شہری ہونے کی علامت تھا۔ اس نے جزیہ ختم کر دیا جیسے کشمیر کے سلطان زین العابدین نے ایک صدی پہلے کیا تھا۔ اس نے عبادت گاہوں کی تعمیر میں حائل ہر طرح کی رکاوٹیں بھی ہٹا دیں۔ عیسائی مشنریاں' جن سے اکبر کے دوستانہ تعلقات تھے' اسی وجہ سے کچھ چرچ بنا پائیں۔ ٹھٹھہ کا 1598ء میں بنا ہوا چرچ ان میں سے ایک ہے۔ ہندوؤں نے بھی نئے مندر بنائے اور پرانوں کی مرمت کی۔ اکبر نے سکھوں کے تیسرے گورو رام داس کو امر تسر کا شہر بطور جاگیر دیا۔ اس طرح امر تسر کے سکھ فرقے کا مرکز بننے میں اکبر کا بھی حصہ ہے۔

قدرتی بات ہے کہ اکبر ملکی اکثریت یعنی ہندوؤں کی حمائت چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے دہلی کے تمام بادشاہوں کے مقابلے میں اس نے ہندوؤں کے تمدن کو سمجھنے کی بہت زیادہ اور سنجیدہ کوشش کی۔ اس نے اہلِ افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ مان سنگھ کی تعریف بدایونی بھی کرتا ہے۔

"اسلام کی شمشیر ایک ہندو کے ہاتھ میں ہے"

اس کے منصب داری نظام میں تمام عہدیداروں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی تھی۔ اکبر نے راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کیں لیکن ان کے مذہب میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی۔ اسی امر سے قدامت پسند مورخین کو اکبر سے شکائت ہے کہ وہ اپنے محل میں ہونے والی بت پرستانہ رسوم سے وابستہ ہو گیا ہے۔

1587ء میں روایتی عربی اسلامی علوم پر زور دینے کی بجائے مفید علوم' کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کیا گیا۔ بدایونی نے اس کی حسرت آمیز تاریخ کہی (995ھ) وہ لکھتا ہے کہ

"مکتب علماء سے اس طرح خالی ہیں جیسے ماہِ رمضان میں مے فروش کی دکان میخواروں سے"

وہ دعویٰ کرتا ہے کہ بہت سے شیوخ اور فقراء دوسری جگہوں' خصوصاً قندھار' بھجوا دیئے گئے اور ان کے بدلے گھوڑے حاصل کئے گئے' اس پر اس کے مداح بھی قدرے مشکوک ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں کے رسوم ورواج میں کم از کم مداخلت کے باوجود اکبر ستی کے خلاف تھا۔ اس کا یہ رویہ نا قابل فہم نہیں۔ لیکن یہ اسی کے دور میں ہو' اور غالباً اس کے دور میں ہو سکتا تھا کہ موت کو گلے لگانے والی ایک خوب صورت ہندو عورت کی فارسی میں پہلی اور آخری منظوم داستان لکھی گئی۔ عہدِ اکبر کے دیگر مسودوں کی طرح کی اس "سوز و گداز" نامی مثنوی کو بھی منی ایچر سے مصور کیا گیا ہے۔ اکبر کے عہد میں منی ایچر مصوری اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اکبر کی تصنیف ابوالفضل کے اکبر نامہ' کو مصور کیا گیا۔ دوسری جانب داستان امیر حمزہ اور ہندو اساطیر کی بھی تزئین کی گئی جو وسیع کینوس کا متقاضی کام تھا۔

جہاں پناہ ابتدائی ایام جوانی سے ہی اس فن کی طرف ملتفت تھے اور ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ تعلیم اور تفریح دونوں کا ذریعہ تھا۔ "میں یہ کہے بغیر رہ سکتا کہ اشیاء کی ساخت پر غور کرتا اور پھر انہی کی مماثلت تیار کرتا' منبع حکمت اور زہر جہالت کا تریاق ہے۔ فقہی الفاظ کے یہ تنگ نظر پیروکار فن مصوری سے دشمنی رکھتے ہیں۔ لیکن اب ان کی آنکھیں بھی سچائی دیکھنے لگی ہیں"۔ ایک دن نجی محفل میں جہاں پناہ نے تبصرہ کیا "بہت سے لوگ مصوری سے متنفر ہیں لیکن میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ مصور کے پاس خدا شناسی کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ کسی جاندار کی تصویر بناتے ہوئے جب مصور اعضاء کو یکے بعد دیگر بناتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ انہیں انفرادیت نہیں دے پا رہا۔ پھر اس کا دھیان خدا کی طرف جاتا ہے جو خالق ہے اور یوں اس کا علم بڑھتا ہے"۔ (آئین اکبری)

اس وجہ سے بہت سے مصور اور شاعر ایران سے ہندوستان اکبر کے دربار کی

طرف کھنچے چلے آئے کہ ان کے خیال میں ان کا فن یہیں تکمیل پا سکتا تھا۔ وقائع نگاروں نے عہدِ اکبری کے ایک سو ستر شعراء کا ذکر کیا ہے جن میں سے انسٹھ دربار سے وابستہ تھے۔ ان میں سے عرفی اور فیضی کی شخصیات ممتاز ترین ہیں۔ شیراز سے آمدہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والا عرفی عظیم الشان اور پر تاثیر قصائد کا فن کار خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم کچھ سوانح نگار اس پر ناواجب مبالغہ آرائی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ فیضی کو 1576ء میں ملک الشعراء بنادیا گیا تھا اس نے نہ صرف نظامی کے اتباع میں ایک خمسہ ترتیب دیا بلکہ عمیق اور عسیر الفہم عربی پر اپنی دسترس ظاہر کرنے کی غرض سے بے نقط حروف میں دو کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں سے ایک "موارد الکلام" اخلاقیات پر ہے اور دوسری "صوات الالہام" قرآن کی تفسیر پر ہے جسے عرفی کی تقریباً بے سود تحریر کہا گیا۔ قاضی نور اللہ ششتری نے اس کی تنقید پر مبنی ایک فاضلانہ مقالہ تحریر کیا۔ دہلی سے استنبول تک صدیوں فیضی اور عرفی کا تقابل علمی حلقوں کا موضوع بنا دیا۔ بدایوں لکھتا ہے کہ

"وہ اشعار کا ڈھانچہ بنا سکتا تھا لیکن ان ہڈیوں میں گودا نہیں ہوتا تھا"

آج کے قاری کو عرفی کے مقابلے میں اس کی پر شکوہ شاعری ذہنی مشق محسوس ہوتی ہے۔ فیضی بادشاہ کا ایلچی بن کر ہندوستان کے مختلف درباروں میں جاتا رہا۔ ان درباروں میں احمد نگر کا دربار بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں اس نے بادشاہ کے دارالترجمہ میں مہابھارت کے ترجے جیسے منصوبوں پر بھی کام کیا۔ اس کے مرنے پر مخالفین نے وفات کی کدورت آمیز تاریخیں نکالیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اکبر کی اسلام دشمن نہیں تو غیر اسلامی حرکات کی زمہ داری فیضی پر عائد ہوتی تھی۔ کتوں سے اس کی محبت کا کنایہ آمیز ذکر کرتے ہوئے (1594ء۔1004ء) نکالی گئی "چہ سگ پرست مرد" بد "فیضی ملحدی" (1004ء) اس کے باوجود فیضی کی لکھی گئی نعت رسول میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو نعت کی عام روش سے ہٹ کر ہو۔

اکبر نے مسلمانوں کی ہندوؤں کے ادب سے اجنبیت کم کرنے کی غرض سے تراجم کا جولائحہ عمل تیار کیا تھا اس میں فیضی کے چھوٹے بھائی تاریخ دان ابو الفضل نے بھی حصہ لیا تھا۔ خود اس نے لکھا ہے۔

"روشن خیال' شاہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان

متعصبانہ نفرت موجود ہے جس کی وجہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے بے خبر ہونا ہے۔ چاہا کہ اسے دور کیا جائے اور اس مقصد کے لیے اول الذکر کی کتب ثانی الذکر کے لیے قابل فہم بنانے کو مناسب گردانا۔ ان کا اولین انتخاب "مہابھارت" تھا۔ کیونکہ وہ اسے نہایت جامع کتاب خیال کرتے تھے جو مسلمہ ہونے کا شرف بھی رکھتی ہے حکم ہوا کہ دونوں قوموں کے غیر جانبدار اور اہلِ افراد کی ایک مجلس اس کا ترجمہ کرے۔ یوں وہ ہندوؤں کو دکھانا چاہتے تھے کہ ان کی بیشتر توہمات اور غلط کاریوں کا قدیم کتب سے کوئی جواز نہیں ملتا اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی احساس دلانا چاہتے تھے کہ دنیا کے ماضی کو صرف سات ہزار سال پر محیط ماننا کتنی نادانی ہے" مہابھارت کا رزم نامہ کے عنوان سے ترجمہ کرنے میں عبدالقادر بدایونی نے اس کی معاونت کی۔ اسے سنسکرت پر جتنی دسترس حاصل تھی اتنا ہی زیادہ اکبر کے حکم سے ہونے والے اس کام سے چڑ' وہ کہا کرتا تھا کہ خدا اس میں مصروف لوگوں کو معاف کرے اور ان کے عذر اور پچھتاوے قبول کرے۔

بدایونی کی تعلیم و تربیت بطور ایک حنفی عالم کے ہوئی تھی۔ وہ بڑے فخر سے بتاتا ہے کہ بہ آواز کی خوب صورتی کی وجہ سے 'اسے 1576ء میں آگرے میں امام مقرر کیا گیا۔ اس نے تاریخ پر اپنی کتاب منتخب التواریخ' 1596ء کے بعد لکھی۔ جس کی بنیاد نظام الدین احمد کی "طبقات اکبری" پر ہے۔ آغاز میں اکبر کی تعریف میں رطب للسانی کے بعد وہ اس کے مذہب مخالف رویے کی تصویر کشی بڑے تاریک رنگوں سے کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ ابوالفضل کے بالکل برعکس ہے جس نے شہنشاہِ معظم کو "اکبر نامہ" میں تابناک خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بدایونی محض قدامت پسند تنگ ذہن عالم نہیں تھا۔ اسے تصوف میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ چشتیہ اور قادریہ سلسلے میں بیعت تھا۔ صوفی ہو یا مہدوی' جتنی وہ قانون الٰہی ماننے والے کی عزت کرتا تھا اتنا ہی بدعت اور غیر واجب سے متنفر تھا۔ دور اکبری کے آخری برسوں میں اس کی مایوسی اس کے ناقدانہ رویے کو سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہے اکبر کو بنظر انصاف دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تنقید اور ابوالفضل کی "کلمہ کفر تک پہنچی ہوئی" خوش آمدانہ ممدوح پرستی کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے۔

اکبر اسلامی تبرکات کا احترام کرتا رہا۔ 1548ء میں جب اس کی پھوپھی گلبدن بھتیجی اور بیوی سلیمہ حج پر گئے گجرات کے شاہ علی تراب اور اعتماد خاں نے بھی اس سال حج

کیا۔ واپسی پر وہ مکہ سے نقش پائے رسولؐ ساتھ لائے۔ اکبر "استقبال کو چار کوس گیا اگرچہ پس پردہ محرکات کا اندازہ لگانا مشکل ہے" اور ہم خاصے تیقن کے ساتھ بدایونی کے اس بیان کو مسترد کر سکتے ہیں کہ "رسول اکرمؐ کا نام لینا بھی ناممکن ہو گیا تھا"

لگتا ہے کہ اکبر کے "غیر اسلامی" رجحانات کو عیسائی مبلغین نے بھی مبالغہ آمیزی سے پیش کیا ہے۔ جنہیں امید تھی کہ وہ اکبر کو عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کر لیں گے۔ اب یہ ذاتی اور شخص رجحانات کا مسئلہ ہے کہ اسے ہندوستان کا عظیم ترین مسلم حکمران مانا جائے یا پیچیدہ مذہب کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا شخص اور معاشرتی مسائل کے حامل وسیع ملک کو متحد کرنے میں اس کی کامیابی کو "پرخطر فتح" قرار دیا جائے۔

اکبر اندرون ملک قیام امن کی کوششوں میں مصروف تھا کہ جنوب مغربی سرحد پر ایک نئی مذہبی سیاسی تحریک نے جنم لیا۔ اس کا تقابل کئی طرح سے مہدوی تحریک سے کیا جا سکتا ہے۔ جو ان دنوں دھیرے دھیرے لیکن مسلسل زور کھو رہی تھی۔ 1525ء میں مہدی کی وفات کے بیس سال بعد وہ جالندھر میں پٹھان نسل سے ایک اور باغی مذہبی رہنما نے جنم لیا۔

بایزید انصاری کے خاندان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایوب انصاری کی نسل سے ہیں۔ جو رسول اکرمؐ کے پرچم بردار تھے اور جن کا روضہ استنبول میں مرجع خلائق ہے۔ کٹھن لڑکپن سے گزرنے والا بایزید جوان ہونے پر اپنے باپ کے آبائی علاقے وزیرستان میں جا بسا۔ وجدانی طبع اسے ودیعت ہوئی تھی اور ہو سکتا ہے 'یوگیوں کی صحبت نے بھی اس کے صوفیانہ رجحانات میں اضافہ کیا ہو۔ اس کے متعلقین کو یقین تھا کہ وہ اسم اعظم جانتا تھا۔ اس کی متعدد مذہبی تحریریں ہیں جو صوفی نظریے کی تشریح و توسیع پر مشتمل دکھائی دیتی ہیں۔ یہ پشتو کا اولین مذہبی ادب ہے۔ اس کے نزدیک Gnosis ہر فرد کے لیے فرض العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک کامل مرشد کو تخلقو بہ اخلق اللہ کی تجسیم ہونا چاہئے۔ یعنی اسے اپنے خدا کی خصوصیات پر پورا اترنے کی کوشش کرنا چاہئے وہ اپنے مریدوں کو توبہ اور چلہ کا حکم دیتا ہے۔ اس کی طریقت اسی مقام 'جو صوفیوں کے ہاں حقیقت کہلاتی ہے' پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ آگے آٹھ مدارج یا مراحل میں سکونت تک جاتی ہے۔ پیر روشن بایزید نے 1565ء میں چالیس سال کی افسانوی عمر میں تبلیغ کا آغاز کیا۔ اس کا دائرہ کار زیادہ تر پٹھان برادری خصوصاً درہ خیبر کے شنواری اور مہمند زئی تک محدود تھا۔ لیکن اس نے ہندوستان کے مختلف

مقامات کو اپنے داعی بھیجے۔ مغلوں کو سلسلہ روشنیہ کے مذہبی پہلو نے اتنا متفکر نہیں کیا جتنا بایزید کے سرحدی علاقے میں اثرورسوخ نے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف ایک فوج جنوبی مغربی سرحد کی طرف بھیجی۔ روشنیہ 'جنہیں مغل مورخین حقارت سے تاریکیہ یعنی کہ کالے کہتے تھے' نے شاہی فوج کو پہلی بار 1585ء میں شکست دی۔ خود پیر روشن زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پھر مان سنگھ نے 1587ء میں ان کی بیس ہزار پیادہ اور پانچ ہزار گھڑ سواروں پر مشتمل فوج کو شکست دی۔ شکست کے باوجود بایزید کے پانچ بیٹوں نے 1640ء تک پشاور کے علاقے میں مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ لوگ آج بھی اٹک کے نزدیک وہ چٹانیں دکھاتے ہیں جہاں مغل دستوں نے زندیق کے بیٹوں کو دریائے سندھ میں ڈبویا تھا۔ اس کی "خیر البیان" اور اس کے مرید مولا ارزانی کے منظوم بیانات سے اس کے نظریات ہم تک پہنچتے ہیں۔ ان نظریات کی تشریح مختلف طریقوں سے کی جاتی رہی ہے ان میں وحدت الوجود کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ ایمان کی اسماعیلی تشریح کے اثرات اس کی تعلیمات اور مثالی معاشرے کے تصور اور ہنزہ میں چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں بسنے والے اسماعیلیوں کے عقائد سے بھی جھلکتی ہے۔ اس کی مہم خارجی اعتبار سے ناکام بھی رہی ہو تو یہ اعزاز بہر حال اسے جاتا ہے کہ اس نے پشتو کو ایک ادبی زبان کے مرتبے تک پہنچادیا۔ اس کی اولاد مادری زبان میں صوفیانہ شاعری میں اسے پیچھے چھوڑ گئی۔

بایزید کے نظریات کے رد پر اخوند درویزہ کی "مخزن اخلاق" سے بھی پشتو کے عالمانہ اظہار کو تقویت ملی۔ اس کے خاندان کے دیگر افراد نے پشتو میں فقہ پر کام کی روایات کو جاری رکھا۔ ان میں سے سوات کے اخوند محمد قاسم کا نام ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اکبر کے طویل اور کامیاب دورِ حکومت کے آخری سالوں پر اس کے چہیتے بیٹے سلیم کی بغاوت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اس بغاوت کا ایک المناک پہلو یہ تھا کہ سلیم نے اکبر کے وفادار دوست ابوالفضل کو 1602ء میں دکن لوٹتے ہوئے راستے میں قتل کر دیا جہاں وہ تعینات تھا۔ اکبر نے اپنے بیٹے کو کبھی معاف نہیں کیا۔ 1605ء میں اس کی وفات کے بعد سلیم جہانگیر کے نام سے تخت نشین ہوا۔

اپنے جان نشینوں اور پیش رووں کی طرح جہانگیر کا عہد بھی باہمی چپقلشوں اور بغاوتوں سے بھرپور تھا۔ لیکن مغل شہنشاہیت کی تعریف و تحسین میں عام طور پر اس امر کو

نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عہدِ جہانگیری کے ایک حصے کو تھامس رو نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ انڈیا میں 1605ء سے 1619ء تک مقیم رہا اور اس نے نئی نئی قائم ہونے والی برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے کئی مراعات حاصل کیں۔ کمپنی اس کے بدلے میں سمندر میں مغلوں کی معاون بن گئی اور یوں مسلمان بحفاظت براستہ سمندر عرب جانا شروع ہو گئے۔ اپنے عہد حکومت کے آغاز ہی میں جہانگیر کو اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت فرو کرنا پڑی جسے گروارجن کی مدد حاصل تھی۔ 1606ء میں گروارجن کی سزائے موت سکھ تاریخ کا اہم موڑ بن گئی۔ کیونکہ اس فرقے کی مقدس تحریروں کی جمع بندی گردارجن نے "آدی گرنتھ" میں کی تھی۔ اس نے ایک صدی سے ارتقاء پذیر اس فرقے کو ایک فوجی قوت کی شکل دی۔ 1613ء میں شہزادہ خرم اور بعد ازاں شاہجہان نے بھی بغاوت کر دی۔ 1632ء میں صفویوں کے ہاتھوں قندھار کا چھن جانا مغل سلطنت کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا کیونکہ یہ شہر وادی سندھ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان اہم ترین تجارتی مرکز تھا۔ یہ شہر، کبھی مغلوں کے ہاتھ آجاتا اور کبھی صفویوں کے لیکن اس پر مستقل قبضے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

لگتا ہے کہ جہانگیر کے ذہن میں اپنے باپ کی نسبت قدرے قدامت پسندانہ حکمتِ علمی تھی۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس مسئلے کا ایک پہلو بڑھتا ہوا شیعہ اثرو رسوخ تھا۔ شیعہ اسلام کے ممتاز مفکرین میں سے ایک نور اللہ شستاری 1584ء میں ہندوستان پہنچا۔ وہ دو سال سے لاہور میں صدر قاضی کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ اسے عربی تحریر پر دسترس حاصل تھی۔ شیعہ ہوتے ہوئے بھی اس کے فیصلے غیر جانبدارانہ ہوتے تھے اور وہ اسلامی فقہ کے چاروں مکاتب کے مطابق فیصلہ دینے میں مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ بدایونی لکھتا ہے:

> "اگرچہ مذہباً وہ شیعہ ہے لیکن اپنی غیر جانبداری، عدل، انکساری، زہد و تقویٰ، نیکی اور شرفاء کی سی دوسری خصوصیات کے باعث یکتائے روزگار ہے۔ وہ اپنے علم و فضل جود و سخا، معاملہ فہمی، حق گوئی اور دقتِ نظر کے لیے معروف ہے۔ اور یہی سخت گیری غالباً اس کے زوال کا سبب بنی۔ جہانگیر نے ایک معمولی مسئلے پر اسے بلایا مگر مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس نے خود کو شافعی کہا یعنی تقیہ اختیار کیا۔ جیسا کہ اندازہ کیا جا

سکتا ہے اس کی ایمانداری کو ناپسند کرنے والے ماتحت علماء نے بادشاہ
کے کان بھرے اور یوں اس نے 1610ء میں نور اللہ کو کوڑے مروا
کر موت کے گھاٹ اتار دیا"

یوں نور اللہ ششتاری شیعہ اسلام کا تیسرا شہید بنا۔ تاہم درباری حلقوں میں شیعیت کے مبلغ شاعر نہیں تھے۔ جہانگیر کی 1611ء میں مہر النساء سے شادی نے بھی اس مسلک کی راہ ہموار کی۔ یہ خاتون جو بعد میں نور جہاں کہلائی ایرانی نسل تھی اور اس کا پہلا خاوند پراسرار حالات میں مرا تھا۔ شادی کے وقت نور جہاں کی عمر 34 سال تھی وہ عملاً ریاست کی سربراہ بن گئی جلد ہی اس کا باپ اعتماد الدولہ اور بھائی آصف خاں شہنشاہیت کے موقر اور موثر ترین رکن بن گئے۔ جہانگیر امورِ حکومت سے زیادہ علومِ فطرت میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس نے بڑے سکون سے زندگی گزاری اور مشاہدے میں آنے والے دلچسپ جانوروں اور شخصیات کا حال اپنی سوانح حیات تزک جہانگیری میں قلم بند کرتا چلا گیا۔ اگرچہ اس نے شراب پر پابندی لگا کر اسلامی احکامات نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن خود بکثرت شراب نوشی کرتا تھا۔ تاہم اس کا یہ شوق دیندار لوگوں کی تحریم و تکریم کے آڑے نہ آیا۔ لاہور کے قادری سلسلہ کے ولی اللہ میاں میر کی وہ خصوصاً عزت کرتا تھا۔ میاں میر ہی کی وجہ سے اس کے پوتے دارا کو تصوف میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اجین کا ایک ہندو جوگی گوسین جادروپ جہانگیر کے قریبی دوستوں میں شامل تھا۔ ایک صوفی نے یوگا وہشت کا خلاصہ لکھا اور اس کا انتساب جہانگیر کے نام کیا۔ باپ کی طرح جہانگیر نے اجمیر حاضری کا سلسلہ برقرار رکھا اور دربار میں شاعروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ اس کے عہد میں یورپی موضوعات، مسیحی مذہبی مناظر وغیرہ پر بھی تصاویر بنائی گئیں۔ مصوروں نے اپنی تصاویر میں اسے دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں کے مابین ایک صوفی کے طور پر پیش کیا۔

لیکن یہ امن صرف تصاویر تک محدود تھا۔ جہانگیر کے عہد میں کئی صوفی ابھرے جنہیں سلطنت کے لیے خطرہ خیال کیا گیا۔ مثلاً جب یہ دیکھنے میں آیا کہ جوارہ کا ایک مجذوب سید احمد افغان مواعظ سے اپنے علاقے کے لوگوں کو جھنجھوڑ رہا ہے تو اسے تین سال کے لیے گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ حالانکہ ہندوستانی تاریخ میں اس کی تحریک نہائت سطحی اور عارضی تھی۔ اس سے بہت زیادہ اہم شخص وہ ہے جس نے برصغیر میں علمی راسخ العقیدگی کے احیاء کی

کوشش کی۔بعد ازاں کچھ لوگوں نے اسے "بدعقیدگی سے بھری دنیا میں سچے مسلمان کی مثال قرار دیا۔ جس نے اپنی زور دار شخصیت سے ایک پاکیزہ مثال قائم کی اور اسلام کو انتشار سے بچایا" ایسے بھی ہیں جو اسے ہندوستانی مسلمانوں میں فرقہ واریت کے بیج بونے والا واعظ قرار دیتے ہیں۔وہ شخص احمد سرہندی تھا۔

احمد سرہندی 1566ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالواحد عبدالقدوس گنگوہی کے صابریہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔

انہوں نے سیالکوٹ میں تعلیم پائی جو اس وقت فلسفہ اور الٰہیات کا مرکز تھا۔ کچھ عرصہ فیضی اور ابوالفضل سے دوستانہ مراسم رہے۔ راسخ العقیدہ سنی علماء کی روایت کے مطابق ایک رسالہ ردِ شیعہ میں تحریر کیا۔ جے۔ ایم۔ ایس بالجن کے الفاظ میں "عزتِ نفس رکھنے والے ہر عالم نے 'ایام جوانی میں' شیعوں کے خلاف مجادلہ ضرور تحریر کیا" اور احمد سرہندی کے نزدیک تو بدعت وایجاد کرنے والوں میں سے بدترین وہ ہیں جو صحابہ رسولؐ سے عناد رکھتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے خاندان سے محبت 'اور مبالغہ کی حد تک محبت 'ایمان کا لازمی جزو ہے۔ لیکن جب شیعہ پہلے تین خلفاء پر تبرئ کرتے ہیں یعنی ان سے اعلانِ برائت کرتے ہیں جو بعض اوقات نفور کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو سنی مسلمان انہیں ملعون گردانتے ہیں۔ 1599ء میں خواجہ باقی باللہ (1603ء۔1563) نے انہیں سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کر لیا۔

نقشبندیہ اپنا سلسلہ یوسف ہمدانی سے ملاتے ہیں جو بارہویں صدی میں 'خرد مند' روایت کے شیوخ میں سے ایک ہے۔ اس سلسلے کی تنظیم بہاؤالدین نقشبند (وفات 1389ء) نے کی۔ان کے جانشینوں 'خصوصاً خواجہ امراء' کی سرکردگی میں یہ تنظیم وسطی ایشیاء اور افغانستان کی قابلِ ذکر سیاسی قوت بن گئی۔دوسرے سلسلوں کے برعکس 'جو ذکر بالجہر سماع اور دائروی رقص کی بدولت ماننے والوں کی ایک بھیڑ اکٹھی کر لیے تھے' نقشبندی ذکر خفی پر زور دیتے تھے۔ روح کی طہارت اور سنتِ رسولؐ پر سختی سے عمل ان کے بنیادی اصول تھے۔ان کا طریقہ آٹھ اصولوں پر مبنی ہے۔

۱۔ ہوش در دم

۲۔ نظر بر قدم

۳۔ سفر در وطن

۴۔ خلوت درانجمن

۵۔ یاد کرد

۶۔ بازگشت

۷۔ نگہداشت

۸۔ یادداشت

اس خرد مندی کے باعث انہوں نے ایسی تحریکوں اور سلسلوں کا توڑ کرنے کی کوشش کی جو اسلام اور دوسرے مذاہب کا فرق ختم کر رہے تھے اور لوگوں کو بغیر اسلام قبول کروائے اپنے ساتھ ملا رہے تھے۔

باقی باللہ ایک گوشہ نشین خاموش طبع آدمی تھا۔ تاہم عبدالحق محدث جیسے علماء اور اکبر کے معتمد دوست فرید بخاری جیسے سیاستدانوں کے ساتھ اس کی خط و کتابت تھی۔ ان کے شاگرد احمد نے نقشبندی سلسلے کی لوگوں کو راہِ راست دکھانے کی روایت پر سرگرمی سے عمل کیا۔ ان کی تصانیف بہت تھوڑی ہیں انؒ کی کوششوں کی بنیاد 534 فارسی خطوط پر ہے۔ جنہیں جہانگیر نے "لایعنیت کا پلندہ" قرار دیا۔ انہی میں سے ایک خط میں لکھتا ہے کہ وہ منازل عرفان کی کن بلندیوں تک پہنچ گیا تھا۔

> "تجلیات میں ابنِ عربی سے بھی آگے نکل کر بلند ترین ممکن مقام حاصل کرنے اور رتبہ میں خلفاء بلکہ محبیات سے بھی بڑھ جانے جیسے دعوؤں نے احمد سرہندی کو اپنے ہم عصروں کی نظر میں مشکوک کر دیا۔ جہانگیر نے انہیں 1669ء میں آگرہ بلوایا اور گوالیار میں قید کروا دیا تاکہ ان کے "مضطرب دماغ" کو قدرے سکون ملے۔ گوالیار میں احمد سرہندی کو خدا کی صفت جلال کا روحانی تجربہ ہوا۔ ایک سال بعد رہا کیے گئے اور انہیں تحائف سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال 1624ء میں ہوا"۔

احمد سرہندی کو مجدد الف ثانی اور امام ربانی بھی کہا گیا کیونکہ لگتا تھا کہ یہ وہی مجدد ہیں جن کے ظہور کی توقع محمدؐ کے بعد دوسرے ہزار سال کے آغاز میں کی جا رہی تھی۔

تجدید کے یہ نظریات ان کے خطوط میں واضح طور پر ملتے ہیں لیکن بعض اوقات بڑی حیران کن صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اپنی زندگی میں محمدؐ کے دو وجود تھے ایک تجسیم انسانی میں اور دوسرا نوری وجود۔ پیغمبر کے نام میں میم ان دو وجودوں کی علامت ہے۔ ہزار سال گزرنے پر جسمانی وجود مکمل طور پر غائب ہو گیا۔ اس وجہ سے پہلے میم کی جگہ (الف) نے لے لی جو اسلامی تصوف میں الوہیت کی علامت ہے۔ اس طرح محمدؐ کی جگہ احمد نے لے لی۔ "تکمیل رسالت" جو کہ وصال نبیؐ کے بعد بتدریج درجہ کمال سے نیچے آرہی تھی ایسے اشخاص کی صورت از سر نو نمودار ہو گی جو اس کے اہل ہوں گے ان افراد پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنائت ہو گی کیونکہ اس کے بغیر رسول کی پیروکاری اور وراثت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے پیروکاروں کی تعلیمات میں تکمیل رسالت' کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ مجدد کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ امت کے لیے محمدؐ کی شریعت کے تحت ایک خاص زمانے کی رہنمائی کر سکیں۔ امت کا کوئی بھی "عام شخص" اس اصلاح سے اِن کی کیا مراد تھی انہوں نے واضح نہیں کیا۔ اس ذمہ داری سے سرفراز کیا جا سکتا ہے احمد سرہندی نے اس امتی عام شخص کی وضاحت میں کئی پیچیدہ نظریات وضع کئے لیکن مخفی اسرار صرف قریبی دوستوں پر منکشف کئے۔ تاہم یہ امر یقینی ہے کہ "محمد احمد شد" (محمد احمد بن گیا) اِن کی اپنی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو "قیوم" بھی کہتا ہے جو آمنا (72-33) کا سزاوار ہے۔ اس کی امانت داری سے زمین و آسمان نے اظہار عجز کیا تھا۔ بطور قیوم کے وہ قطب سے بلند درجہ رکھتا ہے۔ قطب صوفیاء کے سلسلے میں بلند ترین مرتبے کا نام ہے۔ اس مرتبے کا دعویٰ اس کے تین جانشینوں کو بھی تھا۔ جدید قاری کو یہ سب بے معنی لگے گا۔ قصور کے عبداللہ خیوشگی نے سترہویں صدی کے آخر میں لکھا کہ احمد سرہندی نے بڑے متکبرانہ انداز میں پیغمبری خصائص کے حامل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ مولانا مودودی نے بھی ان کے دعویٰ مجددیت کے متعلق سخت تنقیدی رویہ اختیار کیا ہے۔ احمد سرہندی مقام قیوم پر لکھتے ہیں۔

> "تمام فرشتے' ارواح اور انسان معاونت کے لئے اس سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان ایک واسطہ ہے" (مکتوبات' بحوالہ رضوی)

احمد سرہندی کی تعلیمات ان کی اکبر کے صلح کل اور مفاہمت کے خلاف تنفر کا

منطقی نتیجہ ہیں۔ وہ اکبر کے نظریے کو شعار اسلامی کے خلاف سمجھتے تھے اسی سے ان کی "تکمیل رسالت" اور "تکمیل ولائت" کی وضاحت ہوتی ہے اور ان کا قرب النوافل (یعنی صوفیاء کے فرائض سے بڑھ کر قرب الٰہی کے طریقے) پر قرب الفرائض (یعنی پیغمبروں کے فرائض کے اندر رہتے ہوئے قرب الٰہی کے طریقے) کو ترجیح دینا بھی سمجھ میں آتا ہے۔ اس اصول کا تعلق پھر مقام صوفیاء یعنی جذب اور مقام پیغمبر یعنی ہوش جیسے مسائل سے ہے۔ احمد سرہندی انہیں بنیادوں پر وحدت الشہود کو ابن عربی کے وحدۃ الوجود سے افضل جانتے ہیں۔ ولی حالت جذب میں ذات سے متحد کر دینے والی بے خودی کی کیفیت میں آجاتا ہے اسے سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ اگر شاعر ہے تو نعرہ ہمہ اوست (ہر چیز وہ ہے) لگاتا ہے اور اگر فلسفہ دان ہے تو وجود کی وحدانیت پر نظریے پیش کر کے تاویل کرنے لگتا ہے۔ لیکن جو شخص رسولوں کی پیروی کرتے ہوئے بطور ایک مسافر کے سفر کرتا ہے اسی مقام پر پہنچ جاتا ہے لیکن وہاں رکتا نہیں۔ بالآخر تقلیب اور تطہیر کے بعد اسی دنیا (سیر الی الاشیا) میں لوٹ آتا ہے۔ اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ ذات سے اتحاد کی واردات موضوعی تھی نہ کہ معروضی۔ سچ یہ نہیں کہ "ہر چیز وہ ہے" بلکہ یوں ہے کہ "ہر چیز اسی سے ہے"۔ اس کا نعرہ "ہمہ اوست" نہیں بلکہ "ہمہ از اوست" ہوتا ہے۔

یورپ کی مذہبی تاریخ میں جن نفسی رویوں کو صوفیانہ اور پیغمبرانہ تقویٰ کا نام دیا گیا احمد سرہندی نے بھی انہیں شناخت کیا ہے تاہم ان کا ماخذ قدیم متصوفانہ روایات ہیں۔ ان کے ہاں اس دنیا میں واپس آجانے یا حالت جذب سے لوٹنے پر زور دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس دنیا کا صرف وہ نصف قدرے حقیقی ہے جو رجوع بہ اللہ ہے یعنی کہ جس کی توجہ خدا کی طرف ہے۔ ان کے نزدیک ایک راسخ العقیدہ یعنی پیغمبری کے ولی کا فریضہ ہے کہ وہ دنیا میں کام کرے تاکہ رضائے الٰہی کا اتباع اختیار کر سکے۔ ایسے شخص کی کیفیت کو سرہندی کے ایک مرید نے بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے کہ اس راہ کے آخری مراحل میں اس کا دل اللہ کے آخری حرف کے نورانی احاطے میں ہوتا ہے اور اس نور سے محصور وہ اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے نقشبندیہ کے پاس فکری بنیادیں موجود تھیں۔ وسطی ایشیاء میں عبیداللہ احرار (بابر کا ممدوح) ۔

کی سرکردگی میں یہ سلسلہ سیاسی اعتبار سے خاصا موثر تھا۔ احمد سرہندی نے پرانے شیوخ کے اس نظریے کو اختیار کیا کہ ''خدمت عالم کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی طاقت استعمال کی جائے اور حکمرانوں کو مطیع کیا جائے'' اس وجہ سے انہوں نے مغل دور کے امراء کو خطوط لکھے کہ وہ راسخ العقیدگی کے احیاء پر آمادہ ہو جائیں۔ سرہندی کے مخاطب ان امراء میں خانخاناں عبدالرحیم بھی شامل ہے۔ احمد سرہندی کا خیال تھا کہ کافروں کو احساس ذلت دلایا جانا ضروری ہے جو کہ جزیہ کا اصل مقصد بھی ہے۔ گائے کی قربانی پر اکبر نے پابندی لگائی تھی لیکن سرہندی کے نزدیک یہ شعارِ اسلامی میں سے معزز ترین تھا۔

انہوں نے بدعات' پیروں پیر کے نام پر روزہ رکھنے یا اس کے مزار پر قربانی جیسی توہمات کے خلاف بھی جنگ کی اس حوالے سے انہوں نے خواتین کی اصلاح پر خصوصیت سے زور دیا۔ یہ سب ان کے نزدیک شرک کا درجہ رکھتی تھیں۔ یہ امر ابھی تک متنازعہ ہے کہ اورنگ زیب قیوم ثانی محمد معصوم بن احمد سرہندی سے کس حد تک متاثر تھا۔ نادر شاہ کے ہاتھوں دلی کی غارت گری کے فوراً بعد چوتھے اور آخری قیوم کا 1740ء میں انتقال ہوا۔ چوتھے قیوم کی وفات کے بعد مکمل ہونے والی اپنی غیر مطبوعہ کتاب روداتِ القیومیہ میں ابوالفیض کمال الدین احسان نے تفصیل کے ساتھ قیوم کی اہمیت و تفصیل بیان کی۔ کتاب کا انداز مذہبی احوال ناموں کا سا ہے۔

روایتی تصوف سے گریز کے باوجود سرہندی بھی فلسفے کی تنظیم و تدوین کے سلسلے میں ابنِ عربی کی خدمات کا معترف ہے جس کی وضع کردہ اصطلاحات کو بعد میں آنے والے تمام صوفیاء نے استعمال کیا۔ ہر چند کہ ابنِ عربی کے وحدت الوجود کو وہ حقیقت مطلق تک رسائی کی راہ کی ابتدائی منزلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن' دوسرے تقریباً سارے صوفیاء کی طرح' انہوں نے بھی ابنِ عربی کے ذخیرہ الفاظ کو بلا جھجھک استعمال کیا۔

معاصرین کی سرہندی کے عزائم پر متضاد آراء ہیں۔ ان کے دعویٰ کو تسلیم کر کے مان لینے والوں میں سے ایک عبدالحکیم سیالکوٹی تھے۔ عقائد اور صرف و نحو کی مستند کتب پر ان کی شرحیں پورے برصغیر میں استعمال ہوئی تھیں۔ برصغیر میں' مولانا صدرا شیرازی کا صوفیانہ فلسفہ انہوں نے متعارف کروایا۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی شہرت سلطنت عثمانیہ تک جا پہنچی تھی۔ اس پائے کا عالم سرہندی کو کھلم کھلا مجدد کا پر تکریم نام دیتا تھا۔ جبکہ دوسری طرف دلی

کے بہت بڑے شیخ حدیث عبدالحق دہلوی نے ان کے متعلق بعض نہایت منفی آراء کا اظہار کیا۔ انہوں نے قرار دیا کہ سرہندی عجز وانکسار سے متصف نہیں اور یہ کہ ان جیسا متکبر شخص پہلے کبھی نہیں گزرا۔ عبدالحکیم نے سرہندی کا تقابل جونپور کے مہدی سے کیا جس کا دعویٰ تھا کہ "اس نے اتباع رسول کے ذریعے رسول کی سی اکملیت حاصل کرلی ہے"۔ ان کا خیال تھا کہ "سرہندی ایسے بیان دیتا ہے کہ خوف سے مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

عبدالحق کا تعلق بھی صوفیانہ ذہن رکھنے والے خاندان سے تھا۔ ان کے چچا شتاری سلسلے سے منسلک تھے۔ انہوں نے ہندی میں بھی کچھ کتابیں لکھی تھیں۔ "مرجع خوبی و مبدا کمال اس نوجوان نے کئی برس مکہ میں تعلیم حاصل کی حدیث میں ان کے استاد عبدالوہاب برہانپوری تھے جو مکہ کے ممتاز ترین ہندوستانی مہاجرین میں سے ایک علی متقی برہان پوری کے شاگرد تھے۔ اس وقت کا برہان پور دفاعی حکمت عملی کا حامل اہم مقام ہونے کے ساتھ ساتھ سندھی صوفیوں اور جولاہوں کا مرکز بھی تھا۔ ان کی وجہ سے یہ اقتصادی اور روحانی سرگرمیوں کے حوالے سے اہمیت اختیار کر گیا۔ برہان پور سے نکل کر علی المتقی ملتان گئے تھے۔ بعد ازاں احمد آباد میں قاضی کے طور پر کام کرتے رہے۔ بالآخر 1534ء میں مکہ پہنچے اور وہیں 1568ء میں لاولد مر گئے۔ انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ "کنزالاعمال" کے نام سے مدون کیا۔ احادیث مبارکہ پر عمل کرنے کے خواہاں شخص کے لیے یہ نہایت مفید کتاب ہے۔ علی المتقی نے کچھ عرصہ مہدیوں سے صرف نظر کئے رکھا۔ بعد ازاں وہ ان کا دشمن بن گیا جس کا اظہار ان کی تصنف "تلخیص البیان فی علامت مہدی آخرالزماں" سے ہوتا ہے "کنزالاعمال" کی طرح اس کتاب کی بنیاد بھی سیوطی کی تصانیف پر ہے۔ انہوں نے اپنی سوانحی تصنیف "زادالمتقین" کا انتساب بھی مکہ میں اپنے دو استادوں کے نام کیا۔ دہلی واپس آنے کے بعد انہوں نے عربی اور فارسی میں بہت سی تصنیفات کیں جو مطالعہ حدیث' اور اصول تاریخ نگاری پر اور قصص الاولیاء کی روایت میں ہیں۔ قصص اولیاء کی روایت میں لکھی گئی کتب میں سے قصص الاولیاء "اخبار الاخیار" قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب سلسلہ چشتیہ کے اولیاء پر ہے۔ خود ان کا تعلق چشتی سلسلے سے تھا۔ ہندوستان کے پہلے ممتاز نقشبندی خواجہ باقی باللہ کے ساتھ ان کی دوستانہ خط وکتابت تھی ان کا اپنا ذخیرہ کتب زیادہ تر احادیثؐ سے متعلقہ علوم پر مشتمل تھا۔ انہوں نے حدیث اور دوسرے شعبوں کی نادر کتب کی نقول کے لیے

کاتبوں کی خدمات حاصل کیں۔ حدیث سے یہ دلچسپی ان کی اولاد میں پشتوں قائم رہی۔ ان کی زائے میں سرہندی کی مجذوبانہ بڑیں راسخ العقیدگی کی حدود سے نکل گئی تھیں۔

عبدالحق محدث' عبدالحکیم سیالکوٹی اور مولانا فاروقی جونپوری نے اپنے بڑے بڑے کام شاہجہان کے زمانے میں سرانجام دیئے جو اگر سنہری نہیں تو جواہر جڑے سنگ مر مر کا دور ضرور تھا۔ جہانگیر 1627ء میں مر گیا تھا۔ نور جہاں جس نے اپنا پروقار مقبرہ' لاہور میں تعمیر کروایا تھا 1645ء میں فوت ہوئی۔ نور جہاں اب اپنے سنسان معتبرے میں محو خواب ہے جسے ایک معروف ریلوے لائن اس کے شوہر کے مقبرے سے جدا کرتی ہے۔ اس کا بھائی آصف خاں بھی شہزادہ خرم کے شاہجہان بننے میں استعمال ہوا تھا۔ شہزادہ خرم' جو 1622ء میں پیدا ہوا تھا' نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ یقیناً وہ ان پر اسرار حالات سے باخبر تھا جن میں اس کے بڑے بھائی خسرو کی 1622ء میں موت واقع ہوئی تھی۔ بالآخر آصف خاں نے خرم کے دوسرے بھائی شہریار کو اندھا کر دیا۔ اور یوں خرم کو بادشاہ بنا دیا۔ جو اس کی بیٹی ممتاز محل کا خاوند تھا۔ ممتاز محل اپنے خاوند سے ایک سال چھوٹی تھی۔ چودھویں بچے کی پیدائش پر 1631ء میں اس کا برہان پور میں انتقال ہوا۔ شہنشاہ نے اس کا جو مقبرہ تعمیر کروایا ہندی مسلم فن تعمیر کی سب سے مشہور یادگار ہے۔

سیاسی میدان میں شاہجہان کو جزوی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ برہان پور کا مستقر استعمال کر کے اس نے دولت آباد کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ احمد نگر کی شمولیت مکمل کی۔ بنگال میں ہگلی کی بندرگاہ پرتگیزیوں سے چھین لی۔ ملکی معاملات میں اس کی حکمت عملی "پتھروں کی طرح سخت ہونے لگی جنہیں وہ بہت پسند کرتا تھا" اس نے رجعت پسندانہ حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی لگا دی۔ حتیٰ کہ 1633ء میں کچھ مندر گروا دیئے۔ ہندوؤں پر دوبارہ زیارتی ٹیکس عائد کر دیا۔ ہندو دھرم قبول کرنے پر پابندی لگا دی حالانکہ ایسے واقعات بہت کم ہوئے تھے۔ تاہم ہندو کونیات (Cosmology) کی ایک کتاب کا فارسی ترجمہ اسی کے عہد میں صابریہ سلسلے کے مرکز رودالی میں عبدالرحمٰن چشتی نے "مراۃ المخلوقات" کے عنوان سے کیا۔ عبدالحکیم سیالکوٹی نے صفاتِ الٰہی پر اپنی کتاب "رسالہ حقانیہ" بادشاہ کے نام معنون کیا۔ فلسفہ دان مولانا محمود جونپوری کو آگرے بلو لیا گیا۔ اس کی بڑی کتاب کا نام "الحکمۃ البالغہ" ہے کتاب کی شرح بھی اس نے خود "الشمس

البازعنہ" کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب فلسفے کی معیاری حوالے کی کتاب بن گئی اور ہندوستان بھر کے دینی مدارس کے آخری سالوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ ان مدارس میں فرنگی محل بھی شامل تھا جس کے بانی نے بہت سے اور لوگوں کی طرح اس پر حواشی تحریر کیئے ملا محمود کا رجحان وحدت کی طرف نہیں تھا۔ اس نے اسی لئے محبت الہ آبادی کے نظریات مسترد کر دیئے۔ اس کے برعکس اسی کا ہم وطن عبدالرشید جونپوری ابن عربی کے مطالعے میں اس قدر محو تھا کہ شاہجہان کی دعوت ملاقات بھی قبول نہ کی۔

شاہجہان نے مذہبی تنظیم کی تین حصوں میں تقسیم کو برقرار رکھا۔ قاضی القضاء شرعی امور کا نگران تھا۔ عطیات کی نگرانی صدر الصدور کے پاس تھی۔ جبکہ محتسب عوامی اخلاقیات کا ذمہ دار تھا۔ اسلامی تہواروں پر بے دریغ روپیہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ رمضان کے لیے تیس ہزار اور محرم 'رجب' شعبان اور ربیع الاول ہر ایک کے لیے دس ہزار روپے مختص تھے۔ خود شاہجہان شاعروں' مصوروں اور فن کاروں کی صفوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس دور کا اشیائے تعیش کا سب سے بڑا پارکھ خود شاہجہان تھا۔ اس نے عمارات کی تعمیر متواتر جاری رکھی۔ 1638ء میں 'ابھی تاج محل زیر تعمیر تھا کہ اس نے دہلی کے لال قلعے کی بنیاد رکھی۔ قلعے کے سامنے جامع مسجد 1648ء اور 1650ء کے درمیان مکمل ہوئی اور یوں دہلی "شاہجہان آباد" بن گئی۔ اسے اپنے درباریوں کے جلو میں بیٹھ کر پورے شاہی کروفر سے تصاویر بنوانے کا شوق تھا۔ ونڈسر کے شاہجہان نامہ کی منی ایچر اس دور کے شکوہ وسطوت کی عکاس ہیں۔ تاہم اس کے دو بیٹوں دارالشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان ہونے والی کشمکش نے اس کے شاندار دورِ حکومت کے آخری دو سالوں کو دھندلا کر دیا تھا۔ ان کی کشمکش میں ہندوستانی اسلام کے متضاد رجحانات کی تجسیم ملتی ہے۔ دارا ہندومت اور اسلام میں ایک مشترکہ بنیاد کی تلاش یعنی متصوفانہ مزاج شخص کی نمائندگی کرتا ہے ایسی کوششوں کی بنیاد کلمہ اسلام کے پہلے نصف یعنی سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں پر ہے جس کے تصوف پسند ہندو بھی قائل ہیں۔ جبکہ اورنگ زیب' غالباً نقش بندی اثرات کی وجہ سے اسلام کو منفرد رکھنے پر زور دیتا تھا۔ وہ کلمہ اسلام کے دوسرے حصے پر بھی زور دیتا تھا کہ "محمد خدا کے رسول ہیں" کلمے کا یہی حصہ ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب سے علیحدہ کر کے اس کی پیغمبر اسلام کے بیان کردہ اصولوں میں تجدید کرتا ہے۔

جب احمد سرہندی کا انتقال ہوا تو جہانگیر کا سب سے بڑا پوتا نو سال کا تھا۔ دارا شکوہ 19 مارچ 1615ء کو اپنے دادا اکبر کی وفات کے دس سال بعد پیدا ہوا اس نے اپنے دادا کے نظریات کی ترویج نو کرنے کی کوشش کی۔ جہانگیر کی طرح دارا اجمیر میں پیدا ہوا جہاں اس کے باپ شہزادہ خرم نے بیٹے کے لیے دعا مانگی تھی۔ شائد اسی لئے خرم کو اپنے بڑے بیٹے سے بہت زیادہ محبت تھی' جو عالمگیر کے لیے باعث پریشانی تھی۔

شاہجہان 1627ء میں تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کا وارث عملی سیاست کی بجائے مطالعے' خطاطی اور تصوف میں دلچسپی لیتا تھا۔ جبکہ عالمگیر اس سے چار برس چھوٹا ہونے کے باوجود لڑکپن ہی سے کئی فنون میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ ملک الشعراء کلیم نے پندرہ سالہ اورنگ زیب کی ایک جنگلی ہاتھی کے ساتھ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ سین کئی منی ایچرز کا موضوع بھی بنا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اورنگ زیب کو دکن کا گورنر مقرر کیا گیا۔ نوعمری میں اسے اپنے باپ کے ہمراہ لاہور میں حضرت میاں میر کی درگاہ پر حاضری کا موقع ملا جہاں اس کی بیماری معجزانہ طور پر جلد رفع ہو گئی۔ یہ واقعہ دارا کے ذہنی رجحانات کی تشکیل میں بہت اہمیت رکھتا ہے مغلوں کی چشتیہ سلسلے سے وابستگی کی روایت کے برعکس وہ قادریہ سلسلے سے منسلک ہو گیا۔

پہلے قادریہ صوفیاء پندرہویں صدی میں ہندوستان آئے لیکن ہندوستان میں اسے باقاعدہ متعارف کروانے کا سہرا سلسلہ کے بانی شیخ بندگی محمد غوث کی اولاد میں ایک شخص کے سر بندھتا ہے۔ جو 1842ء میں اچ میں آباد ہو گیا تھا۔ ان کے سجادہ نشین کا گھر آج بھی پاکستان میں اس سلسلے کا مرکز ہے جہاں سلسلے کا ریکارڈ محفوظ رکھا گیا ہے۔ اچ اس سلسلے کا مرکز ہے جہاں سلسلے کا ریکارڈ محفوظ رکھا گیا ہے۔ اچ سے یہ سلسلہ جنوبی پنجاب میں پھیلا جہاں' فرید گنج شکر کی درگاہ پر ہونے والے مکاشفے کے نتیجے میں' شیخ داؤد نے اس کا پہلا مرکز پاکپتن اور ملتان کے درمیان قائم کیا۔ اس کے نوجوان مداح بدایونی نے اس واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد قادریہ سندھ میں پہنچ گئے یہاں سہون میں میر محمد ابن قاضی سیندینو اپنے نانا اور سندھ کے پہلے معروف شاعر قاضی قادن کی وفات سے کچھ مدت پہلے' 1550ء میں پیدا ہوئے۔ قاضی سیندینو' جو میاں میر کے نام سے معروف ہوئے'۔ لاہور میں رہائش پذیر ہوئے اور تجرد کی زندگی گزارنے کے بعد یہیں فوت ہوئے۔ منی ایچرز میں انہیں بیٹھے ہوئے

دکھایا گیا ہے۔ ایک شال کمر اور گھٹنوں کے گرد پھرا کر کسی گئی ہے۔ گردہ دار انگلیوں میں تسبیح ہے اس ولی اللہ کا 1635ء میں انتقال ہوا۔ ان کا خوب صورت مقبرہ لاہور چھاؤنی کے علاقے میں ہے۔ علامہ اقبال نے اس ولی کی مدح سرائی اسرار خودی میں کی۔

دارا نے اپنی فارسی تصنیف "سکینۃ الاولیا" کا انتساب میاں میر، اپنے دوستوں اور برگزیدہ بہن بی بی جمال خاتون (وفات 1639ء کے بعد) کے نام کیا۔ 1640ء

میاں میر کے خلیفہ مولا شاہ بدخشی، جس کا دارا 1940ء میں کشمیر میں مرید ہوا، اپنے مرشد کے برعکس قادر الکلام مصنف تھے۔ انہوں نے دارا اور اس سے زیادہ اس کی بڑی بہن میں تصوف کی تعلیم کے لیے درکار صلاحیت دریافت کی۔ ان کے لیے یہ نوجوان شہزادہ دنیادار صاحب قراں (امیر تیمور اور شاہجہان کا لقب کی بجائے ذل کا صاحب قرآں تھا۔ دارا خود لکھتا ہے۔

"اپنے دور جوانی میں چار بار میں نے ہاتف غیبی کو کہتے سنا "خدا تمہیں ایسی چیز سے نوازے گا جو اس سے قبل کسی بادشاہ کو عنائت نہ کی گئی"

جہاں آراء بیگم جو اپنی ماں کی وفات کے بعد سلطنت کی محبوب اور معزز خاتون اول بن گئی تھی اسی بات کو یوں آگے بڑھاتی ہے۔

"تیمور کی اولاد میں سے صرف ہم دو بھائی بہن ہیں جنہیں اس نعمت سے سرفراز کیا گیا۔ تلاش حق اور وصل خدا کے راستے پر ہمارے آباؤ اجداد میں سے کوئی نہ چلا"

خیال رہے کہ دارا کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے کچھ زیادہ شغف نہیں تھا۔ اس معاملے میں وہ مولانا رومی کا ہم خیال تھا کہ "دنیاداری کا مطلب خدا کو بھول جانا ہے۔ اس کا لباس کے پہننے یا نہ پہننے اور اہلِ و عیال کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں"لیکن لگتا ہے کہ وہ حبس دم یعنی دوران ذکر سانس روک لینے کی مشق کرتا تھا، جس کی تعلیم مولیٰ شاہ اور بیشتر ہندوستانی صوفیاء دیتے تھے۔

ایرانیوں سے اقتصادی اور فوجی اہمیت کے قلعہ قندھار واپس چھینتے۔ جس میں اورنگ زیب جیسا اچھا سپاہی دوبار ناکام ہوا تھا، جیسی مہمات پر رہنے کے باوجود دارا اپنی ذمہ داری ہمیشہ کسی اور کو منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا تاکہ اپنا وقت مطالعہ کے لیے وقف

کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے الہ آباد کا گورنر بننا محض اس لئے قبول کیا تھا کہ وہ اس شہر کے ممتاز صوفی شیخ محب اللہ کے قریب میں رہ سکے جس سے تصوف کے مسائل پر اس کی اکثر و بیشتر خط و کتابت رہا کرتی تھی یہ اور بات ہے کہ دارا نے کبھی اس شہر میں رہائش اختیار نہ کی۔

محب اللہ (1587-1548) فرید گنج شکر کی نسل سے تھے اور ان کا تعلق رودالی کے چشتی صابری سلسلے سے تھا۔ وہ 1628ء میں الہ آباد میں سکونت پذیر ہوئے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ابن عربی کے وحدت الوجود کا کھل کر دفاع کرتے تھے۔ انہوں نے "فصوص الحکم" کی عربی اور فارسی میں شرحیں بھی لکھیں تاہم ان کی پسندیدہ کتاب عراقی کی "لامعات" تھی۔ قرآن کی صوفیانہ تفسیر "ترجمہ الکتاب" اور کئی دوسری تصنیفات کے باعث ہند کے ابن عربی کہلاتے تھے۔ فصوص الحکم کی طرح ان کی کتاب "انفاس الخواص" کا ڈھانچہ اولیاء اور پیغمبروں کی تعلیمات کے گرد بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کے صوفیانہ نظریات کی بنیاد ہے۔ اگرچہ محب اللہ عبدالقدوس گنگوہی جو انہی کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے کی طرح شعار اسلامی اختیار کرنے پر زور دیتے تھے لیکن انہیں زندیق قرار دیا گیا اور ان کے قتل کا فتویٰ جاری ہوا جس پر عمل نہ کیا گیا۔ بعد ازاں ان کے جانشین کو اورنگ زیب نے طلب کر کے دھمکی دی کہ شیخ کی کتب نذر آتش کر دی جائیں گی جن میں اس نے کہا ہے کہ جبرائیل پروں والی مخلوق نہیں۔ بلکہ پیغمبر کے اندر کی روحانی طاقت تھی۔ محب اللہ کی یہ توجیہہ داستان طرازی کے خلاف مستقبل کے رجحان کی پیش بینی تھی۔

دارا شکوہ نے یکے بعد دیگرے کئی فارسی تصانیف لکھیں۔ اس کے ادعا میں درست معنوں میں انکسار و عجز نہیں ملتا لکھتا ہے۔

"اسے قادری (دارا شکوہ کا قلمی نام) نہیں قادر (مطلق) کا کام خیال کریں"

اس فقرے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی تحریر کو کشف الٰہی خیال کیا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا دیوان "اکسیر اعظم" کہلاتا ہے لیکن شاعری بے لطف اور پھیکی ہے۔ اس کے موضوعات عموماً صوفیانہ ہیں۔ "جنت وہ جگہ ہے جہاں ملا نہ ہو۔ روحانی واردات اور اندھی تقلید باہم متضاد ہیں"۔

ہندوستانی صوفیانہ شاعری میں اقبال تک یہی مضامین ملتے ہیں۔ دارا کو ہر کہیں وحدت وجود نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ کلمہ ابتداء یعنی "اللہ کے نام سے" ..... کو تبدیل کر کے

ایک شعر میں اس طرح لکھتا ہے۔

"اس کے نام سے جس کا کوئی نہیں اور جو توجہ دیتا ہے چاہے کسی بھی نام سے پکارو"
صوفیاء کی تاریخ اور افکار کے وسیع مطالعے سے اس کا بڑا مقصد اسلام اور ہندو مت کے مشترکہ نسب نما کی تلاش تھی۔ اس کی ایک کتاب کا عنوان مجمع البحرین (دو سمندروں کا اتصال' سورہ 18/60) اسی عظیم خواہش کی عکاس ہے۔ اس کتاب میں اس نے صوفیانہ اظہار کا تقابل ہندو مت کی اصطلاحات سے کرنے کی کوشش کی جیسا عہد اکبری میں میر عبدالواحد بلگرامی نے کیا تھا۔ ہندو سنت بابا داس کے ساتھ اس کا بحث مباحثہ بھی دو مذاہب کے درمیان مفاہمت کی اسی تلاش کا حصہ تھا لیکن اس کا سب سے بڑا کام پچاس اپنشدوں کا "سرِ اکبر کے عنوان سے ترجمہ تھا" اسے سیر الاسرار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ کچھ پنڈتوں کی مدد سے 165 میں کیا گیا تھا دارا اپنشد کو 'کتاب جو مخفی ہے" (سورہ 57/78) مانتا تھا اور چونکہ قرآن میں اس پر اشارہ موجود ہے اس لئے اس کا علم حاصل کرنا مسلمانوں پر واجب ہے کیونکہ یہ وحدانیت کا خزانہ ہیں۔ دارا کے ترجمے کو بنیاد بنا کر 1807ء میں روپراں (Anquatil Dupperant) نے اپنشدوں پر لاطینی تصنیف (-Oupenk hat id est See retum Tegendum) لکھی۔ اس کام نے بہت سے مغربی مفکرین کو مسحور کیے رکھا۔

دارا کا تصوف صرف نظری سطح تک محدود رہا۔ اسے عملی سیاسیات میں متعارف کروانے کا مواقع دارا کو نہیں ملا جو بہر حال ایک مشکل کام رہا ہوتا۔ شاہجہان 1657ء میں بیمار ہوا تو اورنگ زیب کو اس کے متوقع اور بظاہر وارث سے جنگ کا موقع مل گیا جسے اس نے بالآخر شکست دے دی۔ اس کی باوفا بیوی نادرہ بیگم 'جو اس کے ہمراہ تھی' راستے میں مر گئی۔ داراشکوہ نے اس کی لاش لانے کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا تاکہ اسے اس کی خواہش کے مطابق مقبرہ میاں میر کے قریب دفنایا جا سکے۔ اس کے جلد بعد داراشکوہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر ارتداد کا جرم ثابت ہوا اور 1659ء میں اسے اپنے ایک بیٹے سمیت موت کی سزا دی گئی۔ اس کی بہن نے صوفیانہ روش اپنائے رکھی۔ اسے تحریر و تصنیف کا خدا داد ملکہ تھا اس نے اتنی تیزی سے تعلیم و تربیت کی منازل طے کیں کہ اگر ممکن ہوتا تو ملا شاہ اسے اپنا خلیفہ مقرر کر دیتا۔ ملا شاہ کا 1661ء میں حالت علالت و غربت میں انتقال

ہوا۔ جہاں آراء اس کے بعد بیس سال بعد تک زندہ رہی اس کا مدفن احاطہ نظام الدین دہلی میں ہے۔

اورنگ زیب کے داراشکوہ پر غیض و غضب کی وجہ غالباً صرف اس کی تصوف میں دلچسپی یا ہندو اقدار کو ماننے کا رجحان نہیں تھا۔ اس کا خصوصی معتمد چندر بھان برہمن فطری صلاحیتوں کا مالک ہندو تھا۔ چندر بھان عبدالحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا سرمد کی پر عجائب شخصیت دیکھ کر یورپی بھی حیران رہ جاتے تھے۔ سرمد ایرانی یا آرمینی یہودی تھا اس نے مسیحی اور اسلامی الہیات کا مطالعہ کیا تھا جس کا کچھ حصہ شیراز کے ملا صدر کے زیر نگرانی مکمل ہوا۔ موخر الذکر کے فلسفے کو عبدالحکیم سیالکوٹی ہندوستان میں متعارف کروا رہے تھے۔ سرمد نے اسلام قبول کیا' تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ عرصہ ٹھٹھہ میں قیام کیا جو تجارت کا اہم مرکز اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارخانہ تھا۔ وہ ایک ہندو لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوا اور درویش بن گیا۔ امکان ہے کہ یہ سب کسی محیط کل متصوفانہ محبت کے صدمے کا اثر تھا وہ براستہ گولکنڈہ دہلی پہنچا اور داراشکوہ کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ اسے شہزادے نے "مرشد اور معاون" کہہ کر مخاطب کیا وہ ننگ دھڑنگ گھومتا پھرتا۔

"اس غریب پر شیخ محی الدین ابن عربی نے روحانی واردات"

صوفیانہ اور دستور زمانہ کے خلاف افکار سرمد نے اپنے قطعات میں نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں۔ ان کی یاسیت میں اس کے المناک انجام کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اس نے حلاج اور عین القدعات ہمدانی کی راہ اختیار کی۔ ان کی طرح سرمد بھی ابلیس کو عاشق صادق خیال کرتا تھا جو ماقبل سرمدی رضا سے سرتابی پر اس معشوق کی لعنت کو ترجیح دیتا ہے۔

سرمد تو حدیث کعبہ و دیر مکن — در کوچہ شک چو گرہان سیر مکن

وہیو بند کی ز شیطان آموز — یک قبلہ گزین و سجدہ غیر مکن

اپنے مثالیوں' حلاج اور عین القدعات ہمدانی کی طرح سرمد کو بھی 1661ء میں سزائے موت دی گئی۔

اس کے نزدیک سزائے موت سنانے والے بھی محبوب ہی کا ایک روپ تھے۔ اسے دہلی کی عظیم مسجد کے نزدیک دفن کر دیا گیا۔ سرمد شہید کہ سادہ سے مزار پر لوگ آج بھی حاضری دیتے ہیں۔ شیطان کو عاشقِ صادق خیال کرنے کے سرمدی افکار پر جھلک ایک

صدی بعد شاہ عبداللطیف سندھی کی شاعری اور پھر ایک خاص انداز میں 'اقبال کی ابلیسیات میں بھی نظر آتی ہے۔

دارا کے حلقے کا ایک اور شخص محسن فانی (متوفی 1670ء) تھا جو کبھی محب اللہ الہ آبادی کا مرید رہا تھا۔ محسن عام طور پر کشمیر میں رہتا تھا جہاں مغل دربار کے دوسرے اراکین کی طرح دارا بھی گرمیوں کا زیادہ تر حصہ گزارتا تھا۔ اس نے الہیات پر فاضلانہ تصنیفی کام کیا اور عام سی شاعری کی۔ جس میں وحدت کے تخیلات بکثرت ملتے ہیں۔

اسے لمبے عرصے تک تقابل ادیان پر ایک کتاب "دبستان مذاہب" کا مصنف خیال کیا جاتا ہے جو لگتا ہے کہ دراصل کسی پارسی مصنف کے قلم سے تھی۔ کتاب اپنے انگریزی ترجمے میں بھی خاصی گنجلک ہے۔ لیکن اس میں اس دور کے ہندوستان کی بڑی مذہبی رووں' پارسی' مسیحی' ہندو' تبتی' یہود' اہل فلسفہ اور صوفیاء پر بڑے دلچسپ مشاہدات ملتے ہیں۔

1666ء میں شاہجہان کا آگرے میں انتقال ہو گیا۔ اس کی بیٹی جہاں آراء آخری سالوں میں اس کے قریب رہی۔ اس کی پوتی زیب النساء نے علم اور تصوف کی راہ اپنا کر اپنی پھوپھی کی مثال پر عمل کیا۔ اورنگ زیب کی اس بیٹی نے بہت سی عالمانہ کتابیں فارسی میں ترجمہ کروائیں۔ ان میں فخرالدین رازی کی "تفسیر" بھی شامل ہے۔ جسے ملا صفی الدین نے "زیب التفاسیر" میں تحویل کیا۔ زیب النساء شاعرہ بھی تھی فارسی میں شاعری کرتی تھی۔ اس نے "مخفی" اور "زیب" کے تخلص استعمال کئے۔ اس کی بہن زینت النساء کو بھی' اورنگ زیب کی اور بیٹیوں کی طرح' شاندار مذہبی تعلیم دی گئی۔ یہ شہزادی اپنے جودوسخا کے لیے مشہور تھی۔ اس نے دہلی میں زینت المساجد کے نام سے ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کروائی۔

اس کے باپ اورنگ زیب عالمگیر پر بہت سے مورخوں نے سخت گیری اور مذہبی عدم رواداری کے الزامات عائد کئے ہیں۔ درحقیقت اس کا پورا عہد زندگی کی آسائشوں کے خلاف روزافزوں سختی سے متصف ہے۔ اس نے درشن جیسے کئی رسوم ورواج ترک کر دیئے جو ایک سے عرصے سے مغل دربار میں جاری تھے۔ درشن میں بادشاہ صبح سویرے ایک جھروکے سے اپنا دیدار کرتا تھا تاکہ لوگ اس تابناک نظارے سے فیوض وبرکات حاصل کر سکیں۔ اسی طرح سالگرہ اور دوسری تقریبات کے موقع پر سونے چاندی میں تولے جانے کی رسم

بھی موقوف کر دی گئی حالانکہ یہ دولت بعد میں خیرات کر دی جاتی تھی۔ حدود کا نفاذ کیا گیا اور تخت نشینی کے گیارہویں سال اس نے اپنے حضور موسیقی پر پابندی عائد کر دی۔ مصوری کی حوصلہ افزائی ترک اور تاریخ نویسی روک دی گئی۔ تاہم یہ روایات کسی نہ کسی صورت زندہ رہیں۔ شاعروں نے، جن کی فارسی روز بروز ادق ہوتی جا رہی تھی' ایسا روزمرہ اپنایا جو زندگی کے حقائق سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ مصوری بھی چھوٹے ہندو اور مسلم درباریوں میں جاری رہی۔ فرمان شاہی کے باوجود مورخین بھی اپنے وقائع مرتب کرتے رہے یا پھر ترک وطن کر کے ان درباروں سے وابستہ ہو گئے جہاں ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

1878ء میں جب وہ اکسٹھ سال کا ہوا تو دنیاوی آسائش و آرام کے خلاف اس کا رویہ اور بھی سخت ہو گیا۔ 1699ء میں جب وہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا اس نے محرم کی تقریبات کی بھی ممانعت کر دی۔ اس کے عہد میں کچھ مندر بھی مسمار کیے گئے۔ اس نے کئی بے قاعدہ ٹیکس ختم کیے اور ان کی جگہ جزیہ دوبارہ متعارف کروایا۔ اس نے ہندوؤں کو بشرطِ اسلام اعلیٰ عہدوں کی پیش کش کر کے انہیں مسلمان کرنے کی کوشش بھی کی۔ نظام الدین برہان پوری کی سربراہی میں ماہرین قانون کے ایک ادارے نے قانونی فیصلوں کو "فتاویٰ عالمگیر" کے نام سے مدون کیا۔ بادشاہ نظام الدین برہان پوری کو اپنے دکن کے ایام سے جانتا تھا۔ یہ مجموعہ مسلمانانِ ہند کی قانونی تاریخ پر ایک اہم دستاویز اور ستارہویں صدی کے اواخر کے مسلم اداروں کے متعلق اہم معلومات کا ماخذ ہے۔

اورنگ زیب مبالغہ آمیز صوفیانہ دعوؤں' وحدت الوجود کے نمائندوں کے خطرناک رویے اور مقبول عام پیر پرستی کے خلاف تھا۔ لیکن وہ جدید تصوف کو قدرے پسند کرتا تھا۔ جب اس کے سامنے رومی کی مثنوی پڑھی گئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ عبداللطیف برہان پوری جیسے نیک لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوتا جو اسے پاکبازی کی زندگی گزارنے، مستحقوں کے وظائف مقرر کرنے اور مظلوموں کی دادرسی کی نصیحت کرتے۔ درحقیقت زیادہ تر سیدوں کی طرح برہان پور کے صوفیوں نے بھی تخت کی جنگ میں اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا۔ جبکہ شیعہ رہنماؤں بشمول سیدانِ بارہہ' نے دارا کی طرفداری کی۔ اس زمانے کے ایک فراریت پسند شاعر غنیمت کنجاہی نے اورنگ زیب کے اس معمولی سے متصوفانہ رجحان کو ایسے بیان کیا ہے۔

به تخت سلطنت ہم شوکت جم
جو دور خلوت ابراہیم ادہم

اور اس طرح اس نے اورنگ زیب کا تقابل اس افسانوی شہزادے سے کیا جس نے جذب کی راہ میں اپنی بادشاہت ترک کر دی تھی۔

اورنگ زیب نے مسلمانوں کی تعلیم میں دلچسپی لی۔ اس کے عہد میں لکھنو کا ادارہ ایک بہت بڑا کالج بن گیا۔ بادشاہ غریب طالب علموں کو ان کی کارکردگی کے لحاظ سے امداد دینے کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ برنیئر نے "مسلمانوں کا فرد تعلیم" میں جو شکایت اورنگ زیب عالمگیر سے منسوب کی ہے۔ غالباً ایک فرانسیسی سیاح کی من گھڑت ہے۔ جس نے ہندوستان کے مسلم مذہبوں پر اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے بادشاہ کے کسی تبصرے یا رائے کو استعمال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اورنگ زیب کا عہد مروجہ علوم سے خالی نہیں تھا۔ ابو سعید ملا جیون (متوفی 1717ء) اسلامی اصولِ قانون اور فلسفے کا ماہر تھا۔ بادشاہ نے غزالی کی "احیائے علوم الدین" اسی سے پڑھی۔ اسی پائے کا عالم اس کا ساتھی محب اللہ بہاری تھا۔ (متوفی 1707ء) لکھنو کا یہ قاضی بعد ازاں قاضی القضاہ بنا دیا گیا۔ اس کی کتاب "مسلم الثبوت" (مادہ تاریخ 1697 = 1109) اصول الفقہ کی آخری کتابوں میں خاصی اہمیت رکھتی ہے اسے مصر تک میں سراہا گیا۔ جبکہ اس کی کتاب "مسلم العلوم" ہندوستان میں منطق پر بہترین کام ہے۔ شعراء میں سے نصیر علی سرہندی (متوفی 1697ء) ایک دلچسپ شخصیت ہے۔ یہ ذوالفقار خاں کی کرناٹک کی مہم میں شریک تھا۔ جہاں اس نے کانچی کے شیخ حمید الدین اولیاء کو منظوم خراج تحسین کیا زندگی کے آخری دور میں یہ نقشبند سلسلے میں شامل ہو گیا۔ یہ اور اس سے بھی زیادہ مرزا بیدل (متوفی 1721ء) اپنی مشکل گوئی کے باوجود تفصیلی مطالعے کے مستحق ہیں۔ دنیا پر اس کے متحرک نقطہ نظر نے اقبال پر گہرے اثرات چھوڑے جس کا ذکر اس نے اپنی 1910ء کی ایک تحریر میں کیا ہے۔ افغانستان اور مسلم وسطی ایشیاء میں اس کے ابیات اور نثر کا گہری دلچسپی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اورنگزیب کی تیمور کے گھرانے کا اسلامی تشخص بحال کرنے کی کوششوں کو اکثر و بیشتر شدید تعصب کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کا تقابل نہایت منفی انداز میں اکبر کے ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم رعایا سے فراخدلانہ سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر سے ہی

جب وہ دکن میں بادشاہ کا نمائندہ تھا‘ اس کی قسمت دکن کی قسمت سے منسوب ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنے سے پہلے شہزادوں کی طرح اورنگ زیب نے بھی بڑی بے رحمی سے اپنے بھائیوں سے نجات حاصل کی۔ جانشینی کی طرح پہلا شکار اس کا بڑا بھائی شاہ شجاع بنا جو شیعہ تھا اور بنگال کا گورنر بھی رہا تھا۔ اس کے بعد اسی سال یعنی کہ 1659ء میں قید سب سے چھوٹے بھائی مراد کو بھی پھانسی دے دی گئی۔

یہ سب جنگوں کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز تھا اور کئی بار ایسا ہوا کہ اورنگ زیب کو اپنے پانچوں بیٹے‘ سوائے ایک کے‘ جیل میں ڈالنا پڑے سکھوں کو بھی اس کے غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے گرو تیغ بہادر کی 1675ء میں سزائے موت کے بعد اس فرقے نے متشددانہ کارروائیوں کا آغاز کیا۔ جو اگلے ڈیڑھ سو سال میں برصغیر کے شمال مغربی غالب مسلم آبادی والے علاقوں تک پھیل گئیں۔ آفریدی اور یوسف زئی پٹھان قبائل نے بھی مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی حالانکہ وہ عام طور پر وفاداری کا مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ ان کے نہایت قابل رہنما خوشحال خاں خٹک (متوفی 1689ء) کی وجہ شہرت محض غیر ملکی انتظامیہ سے آزادی کی دلیرانہ جنگ نہیں بلکہ وہ اپنی مادری زبان کے بہترین اور قادر الکلام شاعر کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اس نے پشتو میں مسرت انگیز نغماتِ عشق‘ متصوفانہ دانش اور قید کے پر جذبات نغمات لکھے۔ اگرچہ اب بھی کچھ راجپوتوں نے اورنگ زیب سے دوستانہ تعلقات بحال رکھے لیکن بہت سوں نے بغاوت کر دی اور مرکزی صوبہ جات میں طویل عرصے تک جاری رہنے والی شورش سے جنگوں کا آغاز ہوا۔ دکن میں مرہٹے اپنے باصلاحیت رہنما شیواجی (متوفی 1680ء) کی زیرِ نگرانی اُٹھ کھڑے ہوئے اور مغل فوجوں کی ہمت پست کر دی۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک وہ اقتدار کی نمائندہ مسلم طاقتوں سے نبرد آزما رہے۔ 1681ء میں اورنگ زیب ایک بار پھر برہان پور گیا اور پھر کبھی واپس نہ لوٹا۔ اپنے اس مستقر سے اس نے 1686 اور 1687ء میں بیجاپور اور اور گول کنڈہ کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا گول کنڈہ کے آخری حکمران ابوالحسن تاناشاہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ :

> "بالآخر جب اسے اورنگ زیب کے افسروں نے گرفتار کر لیا تو اس نے انہیں ناشتے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ وہاں اس نے ان پر واضح کیا کہ کیسے وہ درد اور لذت دونوں کو یکساں بے اعتنائی سے خدا کی

دین سمجھ کر قبول کرتا ہے جس نے اسے ایک گداگر سے بادشاہ اور
ایک بار پھر گداگر بنا دیا"

جنوب کی ان شیعہ ریاستوں کو ایران کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے مغل ہمیشہ اپنے لئے خطرہ خیال کرتے تھے۔ لیکن ان کی طاقت ختم ہو جانے پر مغل سلطنت کے جنوبی پشتے گر گئے جو اسے مرہٹوں سے بچاتے تھے۔ فوج کا حوصلہ پست' شاہی افسروں کا نظم و ضبط تباہ اور ریاست کے مالی وسائل ناکام ہونے لگے۔ اسی دور میں ہندوستان میں اہل یورپ کا اثر و رسوخ زیادہ مضبوط اور وسیع ہو گیا۔ پرتگیزیوں کے بعد' جن کی موجودگی 1498ء سے ہندوستانیوں کو پریشان کئے ہوئے تھی' برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک میں داخل ہو کر ٹھٹھہ اور بنگال کے درمیان کئی علاقوں میں اپنی آبادیاں اور کارخانے بنا لئے۔ شاہ چارلس دوئم کو 1661ء میں بمبئی اپنی پرتگیزی بیوی کیتھرائن آف برگنزا کے جہیز میں ملی۔ ہندوستان کی دولت پر فرانسیسیوں کی رال بھی ٹپکنے لگی اور 1688ء میں انہوں نے پانڈی چری میں اپنا مستقر بنایا کچھ چھوٹے اڈے ڈچ کے پاس تھے۔

اپنے آباؤ اجداد کی طرح اورنگ زیب بھی تحریر کی بہت اچھی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کے خطوں میں اس کی روح جھلکتی ہے اس کے آخری خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی شان و شوکت اور درشت گیری کے باوجود وہ اپنی ناکامی سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

"میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں' کہاں جاؤں گا یا یہ کہ گناہوں
بھرے اس گنہگار کا کیا بنے گا"

اپنے دور کی آخری منی ایچر میں کم و بیش نوے سال کا یہ شخص تخت پر بیٹھا اپنی تسبیح پر جھک کر دانے رولتا نظر آتا ہے۔ وہ شخص جو کہ مسلمانوں کی شان و شکوہ اور طاقت بحال کرنا اور اپنی سلطنت کو ہر ممکن حد تک وسیع کرنا چاہتا تھا اسے منتشر ہونے سے نہ بچا سکا۔ 3 مارچ 1707ء کو اس کی وفات کے فوراً بعد سلطنت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

چوتھا باب

مسلم طرز زندگی

صوفیاء اوران کے مقابر' صوفیانہ شاعری

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے ابتدائی چند سو سال کے دوران جو رسوم و رواج متشکل ہوئے' آنے والے کئی سو سال تک بغیر کسی تبدیلی کے برقرار رہے۔ برصغیر پاک و ہند جیسے وسیع علاقے میں بنیادی مذہبی اصولوں میں مقامی رواج کا شامل ہو جانا عین قرین قیاس ہے۔ اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی نچلے طبقے نے توہمات' جادو اور ایسے رجحانات اپنا لئے جو راسخ العقیدگی کے منافی تھے جس پر اٹھارہویں اور بیسویں صدی کے مصلحین نیکتہ چینی کی۔ ذرا بلند سطح پر دیکھیں تو بنگال اور دیگر ہندوستانی علاقوں کے ازمنہ وسطیٰ کے بعض صوفیاء میں ہتھیا یوگا کے اثرات کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے غالب پہلو قرار دینا نامناسب ہوگا۔ بحیثیت مجموعی ہندوستانی مسلمانوں کا طرز زندگی قرآن و سنت کے اصولوں پر استوار تھا اور اپنی اصل میں دنیا کے باقی مسلمانوں سے مطابقت رکھتا تھا۔

آخری عمر میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے جنگل میں جا بسنا ہندوؤں کے نزدیک مثالی عمل تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں مذہبی زندگی مسجد' چھوٹی ہو بڑی جامع مسجد' کے گرد گھومتی ہے۔ مسلمان اجتماعی عبادت گزاری کو افضل گردانتے ہیں۔ اجتماع جتنا بڑا ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ جوزف ہوروز (Joseph Horouitz) لکھتا ہے۔

''مسجدوں کی تعداد بعض اوقات چھوٹی آبادیوں میں بھی' حیران کن طور پر زیادہ ہے۔ متقیوں کو مساجد بنانے کی تحریک شائد ایک حدیث سے ملی ہو جو دوسرے مسلم ممالک میں زیادہ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مگر ہندوستان میں بہت مشہور ہے کہ ''جس نے اللہ کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا' خواہ وہ پرندے کے گھونسلے جتنا ہو' اللہ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا'' لیکن اسے ہندوستانی ماحول کے زیر اثر قرار دینا بھی زیادہ بعید از حقیقت نہ ہو گا جہاں ہر امیر آدمی کی خواہش ہوتی تھی اور آج بھی ہے کہ اس کا اپنا ایک مندر ہو''۔

لیکن یہ نقطہ نظر زیادہ قابل قبول نظر آتا ہے کہ مساجد بنوانے والے اجنبی ماحول میں اسلام کا نظر آنے والا نشان یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قطب مینار اور دولت آباد کے چاند مینار جیسے قدیم ترین میناروں کو ''مینار فتح'' قرار دیا جاتا ہے۔

اگرچہ بر صغیر کی قدیم ترین مسجد' واقع بھنبھور (سندھ) کا ڈیزائن معاصر عباسی عراق کی مساجد سے اخذ شدہ ہے عموماً مقامی طرز تعمیر بھی مساجد کے ڈیزائن پر اثر انداز ہوتا رہا۔ سندھ اور بلوچستان کے صحراؤں میں پتھروں سے بنی سادہ نمازگاہیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان مستطیلی احاطوں کی مغربی دیوار میں' یعنی قبلہ رخ' میں ایک نصف کرہ بنا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں پتھروں کے چننے میں سجاوٹ کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ محراب کے پیچھے ایک ٹہنی گڑی ملتی ہے ممکن ہے یہ اوائل کے عرب رواج کی باقیات ہو جب کعبہ کی سمت دکھانے کے لیے زمین میں نیزہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ مکران کے ملاح بانس کے پرانے چپوؤں پر پھٹے پرانے جال لپیٹ کر مسجد بنا لیتے ہیں۔ ایک سیاح نے اسی علاقے میں ایسی نمازگاہ بھی دیکھی جس کی دیواروں کا تعین آرہ مچھلی کے تالو گاڑ کر کیا گیا تھا۔ کھیوڑہ (پنجاب) کی نمک کی کانوں میں ایک مسجد نمک کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ جہاں درخت نسبتاً زیادہ اگتے ہیں انہیں یوں لگایا جاتا ہے کہ چاردیواری کے ستونوں کا کام کریں۔ ان کی شاخیں خوش آمدیدی چھاؤں فراہم کرتی ہیں۔

ہندو پاک کے حکمران خوب صورت عبادت گاہیں بنا کر لافانی ہو گئے۔ اجمیر میں آدھے دن کا جھونپڑا' اپنی ہم عصر دہلی کی قوت الاسلام مسجد کی طرح' زیادہ تر ہندو مندروں کے ملبے سے تعمیر کیا گیا۔ اس کی اونچی محرابی چھتوں پر خط کوفی میں آیات قرآنی کی بہت عمدہ

نقاشی دیکھنے کو ملتی ہے۔بعد کی صدیوں میں مسلمان جہاں بھی پہنچے ایک جامع مسجد ضرور بنائی۔ جونپور' منڈو' گور اور خصوصاً احمد آباد کی مسجدوں کے طرز تعمیر سے ہندوستانی فن تعمیر کی شمولیت اور نئے انداز اپنانے کے مختلف مراحل کا اندازہ ہوتا ہے۔احمد آباد کی سب سے بڑی مسجد کا طرز تعمیر مندر کی داخلیت سمونے کی خواہش کی عکاس ہے۔ایرانی' ماہرین تعمیرات اپنے ساتھ ایران کا طرز تعمیر لائے۔لیکن دنیا کے چونکہ زیادہ تر کام ہندو کاریگر کرتے تھے' مساجد میں بعض اوقات اسلامی دنیا کے وسطی اور مغربی حصوں کی مساجد سے بالکل علیحدہ خصائص جھلکنے لگتے ہیں۔ تغلق عہد کی مساجد بالکل سادہ ہے اور زیادہ تر صرف پتھر سے بنائی گئی ہیں۔لیکن ایک سال کے بعد ہی مسقّف کے ستون بیلوں سے بھر گئے۔چھت کی تعمیر میں خصوصاً شاندار اختراعات کی گئیں۔ان کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ہندو مندروں کے برعکس مساجد میں ایک بڑے اجتماع کے لئے چھتی ہوئی اور کھلی وسیع جگہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مختلف علاقوں میں مختلف تعمیراتی سازوسامان استعمال ہوا۔ مثلاً بنگال میں جہاں پتھر دستیاب نہیں۔اینٹ استعمال کی گئی۔کشمیر میں تعمیر زیادہ تر لکڑی سے ہوئی اور عمارتوں نے روایتی مندر کی مخروطی شکل اپنائی۔پھر سنگ سرخ اور سنگ مرمر کے امتزاج اور بالآخر' مغل عہد میں' صرف سنگ مرمر کے استعمال سے ایسی عمارات بنائی گئیں جو مغربی ناظر کو مجسم حسن دکھائی دیتی ہیں۔ مغل عہد میں آگرہ' لاہور اور دہلی سے دور دراز کے علاقوں کی تعمیرات کی بھی ایک اپنی دلکشی ہے۔اس کی بہت عمدہ مثال ٹھٹھہ کی عظیم مسجد (1635ء) ہے۔اس کے بانوے چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں اور بڑے دروازے پر رنگین ٹائل سے ستاروں کا پیچیدہ اور خوب صورت جال بنا ہوا ہے۔سندھ' جہاں برتن سازی کی روایت بہت پرانی ہے' اور پنجاب میں رنگین ٹائیلوں کا رواج تھا۔

لاہور کی مسجد وزیر خاں میں ٹائل سے کی گئی گلکاری مغل دور میں مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں کی طرز تزئین کی نمائندہ ہے۔ایک روایتی مغلیہ مسجد کے مینار کثیر پہلو اور نیچے سے اوپر محیط میں کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور سرے پر چھتری ہوتی ہے۔ایسے مینار کو گاؤدم بھی کہتے ہیں۔صدیوں تک یہ مینار مثال کا کام دیتے رہے۔پاکستان کی کچھ مساجد ابھی حال میں جدید انداز پر تعمیر کی گئی ہیں۔ان میں پرشکوہ سفید خیمے اور سبک نازک مینار بنائے گئے ہیں۔

مذہبی عمارات کی کندہ کاری خطِ کوفی سے کی گئی جو اپنی اصل صورت اور قدرے

گتھے ہوئے انداز میں استعمال کیا گیا۔ قطب مینار کی نقاشی اس کی ایک مثال ہے۔ لیکن انہیں دیکھ کر مغربی اسلامی دنیا کی سی شان و شوکت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہندو سنگ تراشوں کے لیے عربی حروف کی کندہ کاری یقیناً مشکل کام رہا ہوگا۔ طغریٰ' معکوس اور گلاب نما جیسی پیچیدہ ہیئتیں بھی آزمائی گئیں۔ آگرہ' دہلی اور سکندرہ میں مغل دور کی آیات قرآنی کی کندہ کاری بے نقص خوب صورتی کی حامل ہے۔ شعر کندہ کرنے کے لیے زیادہ تر ایرانی خطِ نستعلیق برتا گیا۔ یہ کام نستعلیق کے بلند ترین معیارات پر پورا اترتا ہے

"عربی کا استعمال مقابر اور مساجد میں کی گئی کندہ کاری تک محدود ہے۔ بعد کے زمانوں میں فارسی شاعری پر مبنی کتبے بھی ملتے ہیں جن میں زیادہ تر شاعر کسی ایک مصرعے کی صورت عمارت کی تاریخ تکمیل بیان کرتا تھا۔ مثلاً میر معصوم سندھ میں اپنے یادگاری مینار کو ساقِ عرشِ بریں قرار دیتا ہے جس سے اس کی تاریخ تکمیل **1003** یا **1594**ء نکلتی ہے"۔

ایک عام مسلمان ان کتبوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا ہو سکتا ہے کہ اسے محض احساسِ تقدس حاصل ہوتا ہو اگر عربی یا فارسی کا تھوڑا بہت علم ہو بھی تو خطِ تفریٰ میں لکھے گئے کتبے پڑھنا کچھ آسان کام نہیں۔

لیکن ان کی بھی بہر حال اپنی اہمیت ہے کیونکہ ناقابلِ فہم ہونے کے باوجود انہیں باعث رحمت خیال کیا جاتا تھا۔

مسجدوں کے پہلو میں عید گاہ تعمیر کی جاتی تھی یہ دیواروں سے گھری ایک کھلی جگہ ہوتی تھی جس میں صرف ایک محراب بنائی جاتی تھی۔ یہاں اہلِ ایمان عید الفطر اور عید الضحیٰ کے لئے اکٹھے ہوا کرتے تھے بہت کم عید گاہیں تعمیراتی حسن کو مدِ نظر رکھ کر بنائی گئیں۔

مذہب' طرز رہائش اور ملبوسات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ عورتوں کی مردوں سے علیحدگی کے مسلم رواج کے باعث گھر میں ان کے لیے ایک علیحدہ حصے کی تعمیر ناگزیر تھی۔ چنانچہ مالی طور پر مستحکم گھرانوں کی رہائش گاہ میں ایک مرکزی صحن کی فراہمی کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا جہاں باہر سے نظر آئے بغیر خواتین تازہ ہوا لے سکیں۔ زنانہ غسل خانے بھی خصوصی طور پر بنائے جاتے تھے۔ ان خالصتاً زنانہ حلقوں میں زنانہ محاوراتی زبان کا پیدا ہو جانا عین فطری تھا۔

لباس بھی ہندو عیسائیوں سے جداگانہ تھا محمد مجیب کا خیال ہے کہ نماز کی ستر پوشی کی شرائط کی وجہ سے مسلمان کپڑا لپیٹنے یا باندھنے کی بجائے اسے سلوا کر ملبوسات کی شکل میں پہننے کو ترجیح دیتے ہوں گے۔ اس اصول کا اطلاق خصوصاً خواتین پر ہوتا ہے جنہیں ٹخنوں سے گردن تک مکمل ستر پوشی کا حکم ہے۔ ہندوستانی منی ایچروں کی صورت ہم کم از کم طبقہ بالا کے ملبوساتی فیشن کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں مردانہ لباس کے لازمی اجزاء قمیض پاجامہ اور ٹوپی تھے جن کا کپڑا مالی حالت کے مطابق بڑھیا یا گھٹیا بہر حال ہو سکتا تھا۔ رکوع و سجود کے تقاضوں کے پیشِ نظر پاجامہ خاصا کھلا رکھا جاتا تھا۔ عبادت گزار مسلمان عالم طور ریشمی ملبوسات سے پرہیز کرتے اسی طرح زرد رنگ کا کپڑا بھی عموماً نہ پہنا جاتا مسلمانوں کی صدریاں بائیں جانب بند ہوتیں جبکہ ہندوؤں کی دائیں جانب۔ سردیوں میں بغیر آستینوں کے شلوکہ پہنا جاتا جو عام طور پر مخمل کا ہوتا۔ برطانوی اثرات کے تحت انگرکھے یا شیروانی کا رواج ہوا۔ اسے کھلی سفید شلوار پر پہنا جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ لباس نیم تقریباتی حیثیت اختیار کر گیا۔ پرانے وقتوں میں سر کا لباس عام طور پر پگڑی ہوتا اس کی شکل' کپڑے اور باندھنے کے انداز سے پگڑی والے کی نسل' پیشے اور علاقے کا پتہ چل جاتا۔ بلوچی قبائلیوں کی پگڑی بہت بڑی 'بل دار اور سفید ہوتی' بیشتر پٹھان نیلی یا سفید پگڑی پہنتے جس کے گرد ایک شملہ چھوڑا ہوا ہوتا یا اس پر ایک طرہ لہرا رہا ہوتا۔ پٹھان عام طور پر پگڑی' سنہری کڑھائی کے کلہ پر باندھتے۔ پٹھانوں اور مغلوں کی پگڑیاں سبک اور چند بلوں پر مشتمل ہوتیں۔ سندھ کے کچھ علاقوں میں خاص شکل کی شیشوں سے سجی تنگ ٹوپی پہنی جاتی جو آج بھی مقبول ہے۔ جب کہ سوات میں پٹھان دوہرے کنارے کی براؤن ٹوپی پہنتے تھے۔ 1870ء میں سر سید احمد خاں نے جدیدیت کی علامت کے طور پر ترکی ٹوپی متعارف کروائی۔

مردوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سنت نبویؐ کے اتباع میں داڑھی رکھیں کیونکہ ' داڑھی خدا کا نور ہے' پرانے زمانے میں عمر رسیدہ لوگ داڑھی کو مہندی میں رنگا کرتے تھے۔ اسی طرح خواتین کا لباس بھی متنوع تھا۔ مسلم خواتین عام طور پر شلوار قمیض یا کرتہ کو ترجیح دیتی تھیں تاہم کچھ خواتین نے ساڑھی بھی اپنالی تھی۔ تقریباتی لباس کے طور پر غرارہ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ سر ڈھکنے اور بوقتِ ضرورت چہرے کا پردہ کرنے کے لیے دوپٹہ استعمال کیا جاتا تھا۔ شرفاء میں ایک لباس صرف ایک مرتبہ پہنا جاتا تھا پھر خیرات میں دے

دیا جاتا۔ ابھی چند برس پہلے ایک معمر سندھی خاتون کو ہم جدید خواتین پر ترس آیا کہ ہمیں ہمارے خاوند ہر صبح نیا جوڑا فراہم نہیں کرتے۔ اگر کوئی باپردہ خاتون امرِ مجبوری باہر نکلتی بھی تو کالے یا سفید برقعے سے ڈھکی ہوتی۔

پوری زندگی ادب و آداب کے نپے تلے' سانچوں میں گزاری جاتی۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کی طرزِ زندگی پر پیغمبر کی سنت اور حدیث نے گہرے اثرات مرتب کئے جبکہ صوفیوں نے ادب کا طریقہ متعارف کروایا۔ صوفیاء کا ایک بہت پرانا قول ہے کہ رویہ مذہب کا خادم ہے بچوں کی پرورش صدیوں کے آزمودہ اطوار پر کی جاتی۔ انہیں اپنے بزرگوں' دوستوں اور نوکروں سے مخاطب ہونے کے انداز بتائے جاتے۔ کسی شخص کو بے ادب کہنا تو اس کی سخت ترین توہین کے مترادف تھا۔ ان طور طریقوں کی جھلک زندگی کے تمام پہلوؤں میں نمایاں تھیں اور اس نے زمانہ انتشار میں اہم کردار ادا کیا۔

استقرارِ حمل سے بڑھاپے تک مرد کی پوری زندگی انہی مذہبی رسوم و رواج میں ڈھلی ہوئی تھی۔ دورانِ حمل پیروں سے لڑکے کی دعائیں مانگی جاتیں۔

اس کی طرح بعض علاقوں میں حمل کے ساتویں مہینے ست ماسہ کی رسم ادا کی جاتی۔ دردِزہ کے طویل ہو جانے کی صورت میں کسی برگزیدہ ہستی کی داڑھی ڈبویا ہوا پانی پینے کو دیا جاتا۔

نومولود کے بائیں کان میں اذان اور دائیں کان میں کلمہ پڑھا جاتا۔ منہ میں کچھ شہد ٹپکایا جاتا اور پھر مناسب نام تجویز کیا جاتا۔ نام رکھتے ہوئے یہ امر ملحوظِ خاطر رکھا جاتا کہ اس کا ایک حصہ محمدؐ یا ان کے صفاتی ناموں میں سے کسی ایک پر مشتمل ہوتا۔ بعض گھرانوں میں نام رکھنے کے لئے فال نکالنے کا رواج تھا قرآن کھولا جاتا اور دائیں ہاتھ کے پہلے صفحے کے پہلے لفظ کے پہلے حرف سے شروع ہونے والا نام سعد خیال کیا جاتا۔ بعض اوقات نام رکھنے میں پیدائش کے لمحے یا دن کے حاکم ستارے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ کسی ولی کی دعا سے پیدا ہونے والے کا نام غوث بخش' صاحب دین وغیرہ ہوتا۔ سندھی میں یہی نام سائیں رکھیو بن جاتا۔ متاخرین میں تاریخ ولادت بیان کرتے ہوئے نام رکھنے کا رواج پڑ گیا۔ مثلاً غلام آل محمدؐ سے تاریخ پیدائش 1194ھ یا 1780ء نکلتی ہے۔ سیدوں کے لڑکوں کے ناموں کے آخر میں شاہ یا پہلے میر لگایا جاتا (حسین شاہ' میر درد) نومولود کے نام کو اس کے والدین کے قبیلے

یا طبقے سے بھی گہری نسبت ہوتی۔ درست یا غلط سے قطع نظر ہندوستانی مسلمان چار طبقات میں بٹے ہوئے تھے جن میں سے اولادِ نبیؐ ہونے کے ناطے سیدوں کا کردار سب سے اہم تھا۔ طبقہ شرفاء میں ان کو سب سے اوپر رکھا جاتا۔ اس طبقے کے آباؤاجداد غیر ملکی تھے۔ اشراف کا متضاد اجلاف تھا جس میں مقامی حسب نسب کے لوگ شامل تھے۔ حکمران طبقے سے متعلق ہونے کے باعث اشرافیہ کا رہن سہن ہندوستان میں مسلم طرزِ زندگی کا معیار کہلایا۔

سید اپنا شجرہ متشخص کرنے کے لیے اپنے ناموں کے ساتھ حسینی کاظمی اور رضوی جیسے لاحقہ استعمال کرتے جن میں سے موخرالذکر ہندوستان میں خصوصاً موثر تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آباؤاجداد کا مقام پیدائش بھی اپنے نام کا حصہ بنا لیتے جیسے جیلانی' کرمانی اور بخاری وغیرہ۔ سیدوں کو تحفے تحائف اور نذر و نیاز کرنے میں کچھ تحدیدات کا سامنا تھا سید خواتین کو باقی طبقہ نسواں کی نسبت پردے کی زیادہ سختی کا سامنا تھا۔ بعض گھرانوں میں تو یہاں تک احتیاط کی جاتی تھی کہ حاملہ عورت کو گھر میں نہیں آنے دیا جاتا تھا کہ مبادا پیٹ میں مرد ہو اور ان کی بے پردگی ہو۔ میں نے ایک پٹھان خاتون کو شکائف کرتے سنا کہ اس کی خالہ جسے اپنی سیادت کا خیال رہتا تھا اب ایک مرزا کے ساتھ کی قبر میں دفن ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی برادری شیخ ہیں جو ایک مفروضہ کے مطابق' قبیلہ قریش سے ہیں۔ لیکن دراصل' ان میں سے زیادہ تر ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں۔ شیخ محمد اقبال کے اجداد کشمیر برہمن تھے۔ ترکی اور ایرانی النسل مغل شمار ہوتے اور انہیں اکثر مرزا کہہ کر مخاطب کیا جاتا جبکہ افغانیوں کے کسی گروہ کے ساتھ ہندوستان داخل ہونے والوں کو پٹھان کہا جاتا۔ بلوچ یا خان بھی اسم معرفہ کے بعد لگایا جاتا۔ عموماً نام کا تیسرا حصہ قبیلے کی تخصیص کرتا (جیسے خوشحال خاں خٹک اور جمال خاں بگٹی وغیرہ) پنجاب کی مختلف نسلوں' بلکہ قبائل اور برادری کے لوگ' اپنے نام کے آخر میں چیمہ' اعوان اور کمبوہ وغیرہ لگانے کا رجحان رکھتے ہیں۔

بسم اللہ اور انشاء اللہ وغیرہ جیسے اسم معرفہ عموماً پٹھانوں میں رکھے جاتے ہیں لیکن بعض دوسرے علاقوں کے مسلمانوں میں بھی اعجاز الحق' معراج الدین اور سلیم الزماں جیسے بلند آہنگ نام رکھنے کا رواج ہے جو قواعد کے اعتبار سے غلط ہوتے ہیں۔ طبقہ جہلا میں فارسی عربی مرکب نام عام مل جاتے ہیں۔ سادہ سے چراغ دین کو مفرس کر کے چراغِ دین کر دیا گیا۔

آنے والی نسل اگرچہ نسبتاً تعلیم یافتہ تھی تو اس طرح کا نام مکمل عربی شکل اختیار کر کے سراج الدین ہو گیا۔ بعض اوقات اس طرح کے مرکبات کی اصل دریافت کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس کی ایک وجہ مختلف جگہوں پر آوازوں کی تبدیلی ہے "ز" اور "ج" کی آوازیں سب سے زیادہ باہم بدلتی ہیں۔ بعض اوقات بھائی بہنوں کے نام ایک ہی حرف سے شروع ہوتے ہوئے یا ہم آہنگ رکھے جاتے ہیں کچھ عربی نام مذکر اور مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں (اقبال' ممتاز وغیرہ) مسلمان اہلِ بیت سے گہری عقیدت رکھتے ہیں چنانچہ' خصوصاً شیعہ' اس کے اظہار کے لیے غلام حسین اور کلب علی جیسے نام رکھتے ہیں۔ کچھ بالائی طبقے کے خاندانوں میں لڑکیوں کے لیے مفرس ناموں کا رجحان ہے وقار النساء امتہ الکریم جیسے مرکب نام بھی مستعمل ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات ناموں کے آخر میں بی بی یا مائی کا نام بھی لگایا جاتا ہے۔ جیسے بی بی فاطمہ یا پری بائی۔ کسی خاص پیر خانے سے وابستہ لوگ پیر صاحب سے بچوں کا نام رکھنے کی درخواست کرتے ہیں۔ دیہاتی علاقے میں زمیندار' خواہ وہ ہندو ہے سے نام رکھنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ جس دور میں بدایونی اکبر کا وفادار تھا' لڑکے کی پیدائش پر بادشاہ سے لڑکے کا نام رکھنے کی درخواست کرتا ہے۔

لڑکے کی پیدائش کے بعد عورتیں اپنے تشکر کا اظہار گیتوں میں کرتی ہیں۔

چھٹے دن چھٹی کی تقریب ہوتی جس میں زچہ اور بچہ دونوں کو پہلا غسل دیا جاتا اور نئے کپڑے تقسیم کئے جاتے۔ چھلا پر جو چالیسویں دن منایا جاتا کئی رسوم ادا کی جاتیں اور بساط کے مطابق دعوت کا اہتمام ہوتا۔ اگر کسی ماں کے کئی بچے شیر خوارگی میں مر گئے ہوتے تو ایک خاص رسم ادا کی جاتی۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے عبدالعزیز کو پہلا غسل دینے کے بعد نذر اللہ کرنے کے لیے مسجد کی ایک محراب میں ڈال دیا گیا۔ اس صورت میں نو مولود کے لیے ایسا نام تجویز کیا جاتا جو طوالتِ عمر کے ہم معانی ہوتا جیسے جاوید' عبدالباقی وغیرہ۔

نو مولود کے سات دن پورے ہونے پر اس کے سر کے بال پہلی بار کاٹے جاتے اور ان کے مساوی وزن کی چاندی خیرات میں دی جاتی۔ اس موقع پر عقیقہ بھی کر دیا جاتا لڑکے کے لیے دو اور لڑکی کے لیے ایک بکرا قربان کیا جاتا جس کا ہر جسمانی نقص سے مبرا ہونا ضروری ہے۔

بچے کی عمر چار سال چار ماہ اور چار دن ہوتی تو بسم اللہ واجب ہو جاتی۔ رسم کے

مطابق مملا صندل کی روشنائی سے بااسم اللہ لکھتا جسے بچے کو چاٹنا ہوتا تھا اس کے بعد بچہ ملا کے پیچھے پیچھے با اسمك الله ذی خلقاً والی آیت دھراتا۔ مٹھائی تقسیم کی جاتی اور اگر لڑکی ہوتی تو پہلی بار اس کی مینڈھیاں بنائی جاتی ختنے عام طور پر سات سے سولہ برس کی عمر کے درمیان ہوتے۔ چونکہ یہ عمل لڑکے کے مسلمان برادری میں شامل ہونے کا نشان ہے اس لئے اسے مسلمانی بھی کہتے تھے۔ بعض علاقوں میں لڑکوں کو جلوس کی شکل میں قریبی ولی کی درگاہ پر لے جانے کا رواج بھی تھا۔ ختنہ کا کام عموماً حجام سرانجام دیتا جس کی بیوی دایہ کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔ سندھ میں سکول بھیجنے کا آغاز عموماً بدھ کے دن سے کیا جاتا تھا۔

آج بھی لڑکا قرآن ختم کر چکتا ہے تو استاد کو ملبوسات وغیرہ تحفتاً دیئے جاتے ہیں دیہاتوں میں زمیندار یا کوئی اور کھاتا پیتا شخص مدرسہ تعمیر کرواتا ہے' جو ایک درخت کے نیچے ایک چار دیواری پر مشتمل ہو سکتا ہے' جہاں لڑکے اسلام کی مبادیات سیکھتے ہیں۔ بالائی طبقے کے گھرانوں میں بچوں کو عربی اور فارسی سکھانے کے لیے اتالیق رکھے جاتے تاکہ وہ نہ صرف اپنے مذہبی فرائض سرانجام دے سکیں بلکہ فارسی شاعری کا ذوق بھی پیدا کریں۔ بچہ نو سال کا ہو جاتا تو اسے رمضان کا پہلا روزہ رکھوایا جاتا اس موقع پر روزہ کشائی کی تقریب منعقد کی جاتی۔ تاہم اس موقع پر راگ رنگ کا اہتمام نہ کیا جاتا۔

اس کے بعد شادی کا مرحلہ آتا۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک لڑکی کی شادی پہلے حیض کے بعد جتنی جلدی کر دیجائے اتنا ہی بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے پاکستان اور ہندوستان دونوں میں جہاں شادی کی کم از کم عمر سولہ سال رکھی گئی ہے' قانون کی مسلسل خلاف ورزی کی جاتی ہے' بہت سے خاندانوں میں برادری کی شادی کا رواج ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کزن میرج اقتصادی وسائل کی حفاظت اور باہمی تعاون کا ایک ذریعہ ہے۔ عام طور پر ذات سے باہر شادیوں کا رواج نہیں مثلاً پنجاب میں صدیوں سے آباد کشمیری کسی اور ذات میں شادی کم ہی کرتے ہیں۔ کچھ ذاتوں میں کزن میرج کی اتنی پابندی کی جاتی ہے کہ بعض اوقات لڑکی کو اپنے مستقبل کے خاوند کے بالغ ہونے کا دس دس سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات بدلے یا وٹہ سٹہ کی شادیاں بھی کی جاتیں ہیں۔ ان شادیوں میں جس گھرانے میں لڑکی بیاہی جاتی ہے اس کی ایک لڑکی کو بہو بھی بنایا جاتا ہے۔ اسی نظام پر عمل کرنے والی برادیوں میں لڑکوں کی زیادہ تعداد' جسے عام طور پر رحمت خیال کیا جاتا ہے'

مناسب رشتوں کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ بالائی طبقے کے خاندانوں میں بھی خاندان سے باہر بہت کم شادیاں کی جاتیں تھیں۔ کثیر الذدواجی نظام کی وجہ سے عام طور پر مناسب رشتہ مل جاتا تھا۔ میں نے ایک پیر کو بڑی تلخی سے شکایت کرتے سنا جس کی بھتیجی دوسری پیر فیملی میں بیاہی گئی تھی کہ "پچھلے پانچ سو برس سے ہم نے اپنی کوئی لڑکی کسی کو نہیں دی۔ رشتوں کے طے پانے میں کفوت یعنی برابری کا اصول اہم کردار ادا کرتا ہے" پرانے وقتوں میں سید خاندان اپنی لڑکی غیر سید کے ساتھ بیاہنے کی بجائے ساری زندگی گھر بٹھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ تعلیم نسواں کے عام ہونے سے ان رواجوں کی سختی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔

جب شادی خاندان سے باہر کرنا مقصود ہوتی تو مشاطہ یا نائن کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ اسے ممکنہ دستیاب جوڑوں کا اچھی طرح پتہ ہوتا۔ بوقت ضرورت یہ بچولن کا کردار بھی ادا کرتی۔ شادی کی تیاریاں لمبا عرصہ لیتی ہیں اور اس میں بہت پیچیدہ رسوم و رواج کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک امر جس پر ہر دو فریقین کو راضی ہونا پڑتا ہے مہر ہے یہ وہ رقم ہے جو خاوند کو اپنی بیوی کو ادا کرنا ہوتی ہے۔ یہ نکاح نامہ میں بھی مذکور ہوتی ہے نکاح نامہ ہر شادی کا جزو لازم ہے یہ بیوی کے حقوق کے تحفظ کا ایک ذریعہ ہے لیکن ماضی کی طرح حال میں بھی بیوی یا اس کا وکیل ان حقوق سے اچھی طرح آگاہ نہیں کہ انہیں نکاح نامے میں درج کروا سکے۔ آج کی طرح ماضی میں بھی شادی پر لمبا چوڑا خرچ اٹھ جاتا تھا۔ لکھنو کے مصنف شرر نے ایک صدی پہلے عقد نکاح پر فضول خرچی کے ہاتھوں خاندانوں کے اجڑنے کی شکایت کی ہے اس مسئلے کو خواتین کی تنظیمیں آج بھی اٹھا رہی ہیں۔ حکومت پاکستان نے بھی شادی پر چراغاں اور بھاری بھر کم خوردونوش کی دعوتوں پر اٹھنے والے مصارف کو محدود بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں خواتین کا تعاون نہ ہونے کے برابر ہے۔

شادی بیاہ کی تقریبات مختلف علاقوں میں علیحدہ علیحدہ انداز میں منعقد کی جاتی ہیں تاہم جہیز دکھائی طرح نتھ ڈالنے کے لیے ناک چھیدائی ہر جگہ موجود ہے۔ بارات کا جلوس پہلے کسی ولی کی درگاہ پر جا کر فاتحہ خوانی کرتا ہے۔ مہندی، ابٹن اور سات سہاگنوں کے عروسی جوڑا کاٹنے جیسی رسوم مذاہب سے زیادہ لوک روایات سے متعلق ہیں۔ لیکن سندھ اور کچھ دوسرے علاقوں میں گائے جانے والے گیتوں میں اپنے مسلمان ہونے پر فخر و مباہات بھی ہوتا ہے۔ زیادہ تر اسلامی ممالک کی طرح ہندوپاکستان میں بھی لڑکے سے توقع کی جاتی ہے

کہ وہ اپنی قرآن پڑھتی ہوئی بیوی کا چہرہ پہلی مرتبہ آئینے میں دیکھے گا۔ اردو میں اس تقریب کو مصحف آرسی کہتے ہیں بنگالی' سندھی اور پنجابی کے کئی لوک گیتوں میں بابل کے گھر سے جا کر سسرال کی حکومت میں آنے والی لڑکی کے جذبات بیان کئے گئے ہیں۔

سسرال میں لڑکی کا مقام عام طور پر پہلا بیٹا پیدا ہونے کے بعد بنتا ہے۔ نچلے طبقے کے خاندانوں میں میاں بیوی ایک دوسرے کو ناموں کی بجائے احمد کے ابایا علی بخش کی ماں کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان معاشروں میں ماؤں کو عام طور پر بے حساب عزت دی جاتی ہے۔

ماضی میں اور کسی حد تک اب بھی بالائی طبقے کے گھرانوں میں جو مساوی حقوق کا اہتمام کر سکتے ہیں کثیر الذدواجی عام تھی۔ روایتی گھرانوں میں عورت خاوند کے گھر میں قدم رکھنے کے بعد پہلی اور آخری مرتبہ مر کر ہی باہر نکلتی ہے آج کے جدید دور میں بھی پیغمبرؐ کی یہ حدیث بہت مقبول ہے۔

"اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ خاوند کے سامنے سجدہ ریز ہو"

لیکن اس کے باوجود درپردہ انہی کی حکومت ہوتی ہے۔ امیر صاحب اثر ورسوخ شخص کی بیویوں کی باہمی چپقلش پس پردہ زندگی کا لازمی جزو ہے۔

بالائی طبقے کے روایت پسند گھرانوں میں پردے کا رواج نسبتاً زیادہ تھا۔ ایسے لوگوں میں پردے یا عورتوں کی علیحدگی کا رواج نسبتاً زیادہ تھا' جو اس طرح خود کو طبقہ بالا کے برابر محسوس کرنا چاہتے تھے جب یہ سب ہو رہا تھا تو شہروں میں تعلیم یافتہ خواتین نقاب ترک کر رہی تھیں۔

معزز کو در آزاد خواتین کے برعکس' جن کا ذکر بھی گھر سے باہر نہیں جاتا تھا' طوائفیں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کھلے عام کر سکتی تھیں۔ انہیں موسیقی اور شاعری کی تربیت کے بہت اچھے مواقع ملتے تھے۔ محمد تغلق جیسے حکمرانوں نے ان کے لیے دلی اور دولت آباد کے علیحدہ علاقوں میں مساجد بنوائیں۔ اسی طرح اکبر نے' بقول بدایونی' ان کے لیے شیطان پورہ نامی بستی بسائی۔ بعد کے زمانے میں رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" میں انیسویں صدی کے لکھنو میں آباد "بازار کی بیٹی" کی ایک ہمدردانہ اور مفصل تصویر کھینچی ہے۔

امیر گھرانوں کی آزاد محصور عورت کی حالت بیشتر اوقات افسوس ناک ہوتی ہے

لیکن دیہات کی عورت پردہ نہیں کرتی کیونکہ اسے کھیتوں میں کام کرنا ہوتا ہے۔ جس دوران انہیں دوسرے مردوں کے ساتھ میل ملاقات کا مواقع بھی ملتا ہے۔ شادی کی بے شمار اور سخت رسوم ورواج سے جکڑے اس معاشرے میں گھر سے بھاگ جانے کے واقعات اس ماحول سے ناواقف شخص کی توقعات سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ پیریاز میندار کی سرپرستی میں بیٹھنے والی پنچائت میں سب سے زیادہ مقدمے اسی جرم سے متعلق ہوتے ہیں۔ بے وفائی کے شک پر بھی عورت کو موت کی سزادی جاتی ہے۔ بلوچستان میں ناجائز تعلقات میں پکڑے جانے والی عورت کو بے رحمی سے قتل کر کے ویرانے میں بے نشاں دفن کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔

بصورت دیگر عورت کی تدفین پر معمول کی اسلامی روایات ادا کی جاتیں ہیں۔ پردہ دار عورت کی موت کے بعد بھی اس کا چہرہ صرف قریبی عزیز دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں رواج ہے کہ مردے سے ایک فٹ گہرا دفن کیا جاتا ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان نے تبصرہ کیا تھا کہ جلانے کی بجائے اپنے مُردوں کو دفنا کر مسلمانوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ سادگی سے تدفین کرنے کے حکم کے باوجود مسلمانوں نے دنیاوی اور روحانی بادشاہوں کے شاندار مقبرے تعمیر کیے۔

مرنے کے تیسرے دن سوئم ہوتا ہے لوگ تعزیت کے لیے آتے ہیں اور قرآن پڑھ کر اس کا ثواب مُردے کو بخشتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں رواج ہے کہ مُردے والے گھر سے سارا کھانا باہر پھینک دیا جاتا ہے اور عزیز رشتہ دار تین دن تک کھانے دیتے ہیں اس کے بعد معمول کی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ وفات کے تیسرے اور چالیسویں دن غریبوں میں خوراک تقسیم کی جاتی ہے۔ لیکن یوں محسوس کیا جاتا ہے کہ فوت ہونے والا شخص تقریب کا مہمان ہے۔ کچھ علاقوں میں ہر جمعرات کو بزرگوں کی فاتحہ دلوانے کا رواج ہے۔ اسلام میں اگرچہ بیٹیوں کا حصہ مقرر کیا گیا ہے لیکن عام طور پر انہیں اپنے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ کم از کم سنی حلقوں میں یہی رواج رہا۔ چونکہ شیعہ فقہ وراثت کے حوالے سے لڑکیوں کے لیے زیادہ فراخ ہے بہت سے گھرانوں میں جن کی اولاد نرینہ نہیں تھی عملی وجوہات کی بناء پر شیعہ ہو گئے۔

ہندو اثرات کے تحت بیواؤں کی شادی پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ بلوچستان،

کشمیر اور ایسے علاقے جہاں قبائلیت غالب ہے مرحوم خاوند کے بھائی سے شادی عام ہے۔ کثیر الازدواجی رواج کے حامی مرحوم خاوند کے بھائی سے شادی کو اپنے موقف کی حمایت میں استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان اسلامی تقریبا میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں روزوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے اور پرہیز گار مسلمان نماز عشاء کے بعد تراویح ادا کرتے ہیں۔ جس میں بیس رکعت پڑھی جاتی ہے۔ خصوصاً لیلۃ القدر عبادت کے لیے وقف ہوتی ہے۔ اس رات قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا۔ عموماً یہ رات ستائیس رمضان کو آتی ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس رات تمام عالم نباتات سجدے میں چلا گیا تھا۔ صوفیوں کو اس رات تجلی الٰہی کی امید ہوتی تھی۔ سنیوں میں یہ خیال عام تھا کہ اس رات مہدوی اپنے جماعت خانوں میں دوران اجتماع اعلان کرتے ہیں "امام مہدی آ کر چلا گیا ہے اس پر نہ یقین کرنے والا کافر ہے" اسی لئے پرانے وقتوں میں سنیوں اور مہدیوں کے درمیان لیلۃ القدر کو فساد ہو جاتا تھا۔ رمضان کے آخری جمعہ کو عبادت میں کثرت کی جاتی۔ کچھ لوگ رمضان کا پورا مہینہ مسجد میں حالتِ اعتکاف میں گزارتے۔ شیعہ رمضان کی اکیسویں کو شبِ علیؓ کے نام سے مناتے اور ایک چھوٹا سا روضہ جلوس کی شکل میں گھماتے اور علیؓ کے نام پر لنگر کا اہتمام کرتے۔

اور جگہوں کی طرح یہاں عید الفطر نیا چاند نظر آنے پر منائی جاتی ہے۔ چاند بلند جگہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے لیے دو ثقہ گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔ ہندوستان میں چاند دیکھنے کے لیے سائنسی طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں جبکہ پاکستان میں کبھی کبھار چاند کے ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ عید کی نماز شہر کا قاضی عید گاہ میں پڑھاتا تھا آج بھی عید پر نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں اور خاص کھانے پکائے جاتے ہیں۔ عیدی کی تحفوں کا تبادلہ کی رسم آج بھی جاری ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ذی الحج میں حج بیت اللہ ہے۔ ہار پہنے ہوئے اپنے عزیز رشتہ داروں سے رخصت ہوتے ہوئے حاجی آج بھی متاثر کن نظارہ پیش کرتے ہیں۔ سولھویں صدی کے بعد گجرات سے مکہ کا بحری راستہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے قزاقوں سے محفوظ کر دیا تھا۔ آج کل پاکستان سے جانے والے لاکھوں حاجیوں کے لیے خصوصی

پروازوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلے زمانوں میں ظالم حکمران کے چنگل سے یا بادشاہ کے لئے اپنے مشکوک امراء سے نجات کا ایک طریقہ حج بیت اللہ بھی تا۔ ترکِ سکونت کر کے مکہ آباد ہونے کی روایت وسطی زمانوں میں شروع ہوئی اور انیسویں صدی میں برصغیر پر کافروں کی حکومت کے دوران مستحکم ہو گئی مکہ علماء کا مرکز رہا ہے بہت سے ہندوستانی مذہبی رہنما مدینہ اور مکہ میں تفسیر اور حدیث کی تعلیم کے لیے سال دو سال مقیم رہے۔ شاہ ولی اللہ جیسی مذہبی اصلاحی تحریکیں اور مشرقی اسلامی دنیا کی صوفیانہ تحریکیں اسی مقدس شہر سے شروع ہوئیں۔ اسی طرح عید الضحیٰ یا بکر عید بھی پورے اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ قربانی کے جانور کا گوشت تین حصوں میں بانٹا جاتا ایک خیرات دوسرا عزیز و اقارب اور تیسرا اپنے خاندان کے لیے ہوتا۔ جانور کی کھال کسی خیراتی ادارے کو دینا اچھا خیال کیا جاتا تھا۔ جانوروں خصوصاً گائے کی قربانی ہندو مسلم فسادات کی بڑی وجوہات میں سے ایک ہوا کرتی تھی اور آج بھی ہے۔ 18 ذی الحج کو شیعہ غدیر خم کے مقام پر رسولؐ کی طرف سے علیؓ کو اپنا وصی مقرر کرنے کی یاد میں عیدِ غدیر مناتے ہیں۔

لیکن مسلمان قرآن میں مذکور ان دو کے علاوہ بھی کچھ تہوار مناتے ہیں۔ شاعری کی مقبولِ عام صفت بارہ ماسہ میں قمری مہینوں کی رعائت سے ہر مہینے کی علیحدہ علیحدہ صفات بیان کی جاتی ہیں۔ سترہویں صدی کے عظیم محدث محقق نے ایک کتاب میں مختلف مہینوں کے متعلق احادیثِ رسولؐ مدون کیں ہیں۔ اسلامی تقویم کے پہلے مہینے محرم کو عوام الناس میں تقدسِ عام کا درجہ حاصل تھا۔ پرانے وقتوں میں محرم کی تقریبات شیعوں تک محدود نہ تھیں بلکہ سنی بھی ان میں حصہ ڈالتے تھے۔ محرم کے دوران پڑھنے کے لیے مقتل حسینؓ پر خاص کتابیں تھیں۔ شیعہ حلقوں میں مجالس منعقد کی جاتی تھیں جن میں کربلا کے واقعات روز بروز کی تفصیلات کے مطابق پڑھی جاتی تھیں۔ یہ مجالس مسجدوں کی بجائے امام باڑوں میں منعقد کی جاتیں جو وقت کے ساتھ ساتھ شیعہ اسلام کا امتیازی نشان بن گئے۔ بانس کی پچھیوں سے چھوٹے چھوٹے تعزیے بنائے جاتے جو قیمتی پارچات سے ڈھکے ہوتے۔ بعض اوقات یہ بیس فٹ تک بلند ہوتے۔ تعزیے کے ساتھ پنجے اور دوسری مذہبی علامات چلتیں۔ دلدل کی علامت بغیر سوار کے زین اور لگام سے مرصع ایک سفید گھوڑا' زنجیروں سے سینہ کوبی اور ماتم عام تھا' جسے اب ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ دسویں محرم کو تعزیے ایک جگہ دفن کر

دیئے جاتے جسے کربلا کہتے ہیں۔ بعض اوقات ماتم بیس صفر یعنی چالیسویں تک جاری رہتا ہے۔ منٹو کی کہانی کالی شلوار میں ایک طوائف محرم کے لیے ایک کالی شلوار حاصل کرنے کو بے تاب ہے۔

بعض صوبوں میں محرم کے جلوس مذہبی سے زیادہ عوامی رنگ اختیار کر گئے۔ ان میں ہندو بھی آزادانہ شریک ہوتے۔ خصوصاً نچلی ذات کے ہندو مسلمانوں کی طرح نذر نیاز چڑھاتے اور مرادیں مانتے۔ محرم کے دوران جذباتیت اپنے عروج پر ہوتی اور اسی لئے محرم کے پہلے دس دن فسادات پھوٹ پڑنے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا۔ اگرچہ سنی بھی اہلِ بیت کی محبت اور مدح سے سرشار رہیں۔ لیکن بعض مصلحین نے مسلسل تبلیغ کی کہ غم کے کھلے عام اظہار میں بدعت کا شائبہ ملتا ہے۔

اگلے مہینے یعنی کہ صفر کو عام پر منحوس خیال کیا جاتا ہے اس مہینے میں شیعوں کے لئے امامؑ کا چالیسواں ہوتا ہے۔ کچھ دوسرے مسالک کے لوگ بھی اس مہینے کے پہلے تیرہ دن کوئی اہم کام شروع نہیں کرتے کیونکہ ان دنوں رسول اللہؐ علیل ہوئے تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ، مثلاً پنجابی دیہاتی، ان دنوں بکثرت خیرات کرتے ہیں۔ صفر کے آخری بدھ یعنی چہار شنبہ کے روز خوشیاں منائی جاتی ہیں کیونکہ اس دن رسول اللہؐ نے صحت پائی کچھ لوگ ایک پتے پر زعفران یا عرق گلاب سے سات سلام لکھ کر اس کی دھونی بطور اکسیر پیتے ہیں۔

بیشتر مسلم ممالک کے برعکس یہاں ہندوستان میں بارہ ربیع الاول کو بارہ وفات یعنی پیغمبرؐ کے وصال کے دن کے طور پر منایا جاتا تھا۔ عظمتِ رسولؐ پر مبنی کتب کا مطالعہ کرتے۔ پہلے پہل قدم رسولؐ یا براق کی شبیہہ سجانے کا رواج بھی تھا۔ رفتہ رفتہ دوسرے مسلم ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی بارہ ربیع الاول کو یوم ولادت رسولؐ خیال کیا جانے لگا۔ پورا مہینہ ایک خوش کن پہلو لئے ہوئے ہوتا۔ شائستہ اکرام اللہ نے "محافل میلاد" کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ جو دراصل بنگالی بالائی طبقوں کا عام رواج تھا۔ ان محفلوں میں لوبان سلگایا جاتا اور خواتین کو عطر گلاب لگایا جاتا۔ لوگ پیغمبرؐ کے نام کی کھیر بنا کر غرباء کو کھلاتے ہیں۔ آج کل پاکستان میں ربیع الاول کے دوران ذکر رسولؐ کی محافل منعقد کی جاتی ہیں جس میں ان کے اخلاقِ حسنہ بیان کئے جاتے ہیں۔

ایک ماہ بعد گیارہ ربیع الثانی کو قادریہ سلسلے کے لوگ پیر دستگیر عبدالقادر جیلانیؒ کا

دن مناتے ہیں۔ جن کے ایک روایت کے مطابق ننانوے نام ہیں۔ اگرچہ سلسلہ قادریہ برصغیر میں چشتیہ اور سہروردیہ کے بعد متعارف ہوا لیکن عبدالقادرؒ کی تعظیم سب سے زیادہ کی جاتی ہے' کہا جاتا ہے کہ لدھیانہ کے قریب ایک درخت ان کے خلال سے پھوٹا تھا وہاں سالانہ میلا لگتا ہے ان سے منسوب ایک خانقاہ سرینگر میں ہے اور کئی بڑے بڑے درخت سندھ میں۔ بعض اوقات لوگ ایک بڑا سبز جھنڈا جلوس کی شکل میں لے کر نکلتے ہیں جس پر صندل کی روشنائی سے پنجہ بنا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ طاعون سے بچنے کے لیے اپنے گھر پر ایک چھوٹا سا جھنڈا نصب کر کے اس کے گرد گیارہ چراغ جلاتے ہیں۔ عبدالقادرؒ کی مدح میں مقامی زبانوں میں کافی زیادہ شاعری کی گئی۔ سب سے پرانی نظم سندھی میں جمان چران (متوفی 1738ء) نے لکھی۔ اس میں پیران بدخشاں کے معجزات گنوائے گئے ہیں۔ ایک بلوچی نظم معراج رسولؐ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے عبدالقادرؒ کے اس دعویٰ کی وضاحت کی گئی کہ "ہر ولی کی گردن پر میرا پاؤں ہے کہانی کے مطابق جب عرش معلیٰ پر جبرائیل کو معیت کا یارانہ رہا تو وہ رسولؐ کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر رسولؐ عبدالقادر کے کندھے پر کھڑے ہو کر حضورِ حق میں پیش ہوئے۔ اس وقت انہوں نے اس ولی اللہ کو یہ اعزاز دیا کہ باقی تمام اولیاء کی گردنیں اس کے پاؤں کے نیچے کر دی۔ پنجابی مسلمانؒ ہر قمری مہینے کی گیارہ تاریخ کو خیرات دینا مستحسن خیال کرتے ہیں۔

ماہِ رجب میں لوگ زکوٰۃ دیا کرتے تھے۔ اسی مہینے میں شبِ معراج منائی جاتی اور متی مسلمان بکثرت عبادت کرتے۔ کچھ لوگ رجب کی ہر جمعرات کو "جلال سرخ بخاری" کے نام کے چاول تقسیم کرتے۔

ان سب تہواروں سے کہیں زیادہ اہم اور عوام الناس میں مقبول شبِ برات تھی جو ماہِ شعبان کے وسط میں آتی۔ جب آسمانوں پر مخلوقات کی زندگی اور قسمت کے فیصلے کیے جاتے۔ شیعہ اس دن امام مہدی کی تاریخ پیدائش مناتے۔ شبِ برات دھوم دھام سے منائی جاتی۔ پرہیزگار لوگ قرآن پڑھتے اور پیغمبر پر درود بھیجتے۔ کچھ لوگ شب بیداری کرتے اور اپنے مرحوم رشتہ داروں کا ختم دلواتے۔ رات جو پورے چاند کی ہوتی آتش بازی سے منور ہو جاتی' کچھ جگہوں پر رواج تھا کہ کاغذ کے ہاتھی گھوڑے بنائے جاتے ان میں شمعیں روشن کی جاتی' ان کے آگے پھل اور دوسری اشیائے خوردنی رکھی جاتیں اور پھر پیغمبر پر یا شیعہ ہونے

کی صورت میں علیؓ اور فاطمہؓ پر بھی فاتحہ بھیجی جاتی۔ راسخ العقیدہ علماء پٹاخوں اور چراغاں کو ہندو دیوالی کی باقیات سمجھتے ہوئے ناپسند کرتے۔ اسی طرح دلی کے نواح میں رہنے والے میو سالار مسعود کے جھنڈے کی "پوجا" کرتے۔ جو ظاہر ہے راسخ العقیدہ علماء کو پسند نہ تھی۔ تاہم سارے ملک میں کسی نہ کسی جھنڈے یا چھڑی کی تعظیم عوام الناس کی سطح پر عام تھی۔

کچھ فرقے ایسے تھے کہ ذی العقد کو سعد نہ سمجھتے اور نہ ہی ان مہینوں میں شادیاں کرتے تھے۔ شیعہ حلقوں میں سال کا یہی حصہ شادیوں کے لئے مناسب سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ محرم میں ایسی تقاریب منعقد نہیں کرتے تھے۔

طبقہ بالا خصوصاً مغلوں میں ایرانی نیا سال بھی نوروز مقبول تھا۔

زندگی کے ہر پہلو میں رسوم و رواج کی پابندی کی جاتی تھی۔ عام لوگ دنوں کے سعد اور نحس ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ بدھ کو اولیاء کے مزار پر حاضری دی جاتی' تاکہ خیر و برکت حاصل ہو۔ منفی اثرات کو دور کرنے کے کئی طریقے رائج تھے ان میں سے ایک اسماء الٰہی کا ورد تھا۔ انہیں عددی قیمت اور معنی کے اعتبار سے پڑھنا صوفیانہ وراثت خیال کیا جاتا تھا۔ اسلام کے اس پہلو کا تفصیلی تذکرہ غلام غوث گوالیاری کی کتاب "جواہر خمسہ" میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے طریقے مروج تھے جو اتنے سادہ نہ تھے۔

دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی خوابوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں آنے والے خطروں سے آگہی' کسی زندہ یا پوشیدہ ولی تک رسائی یا سیاسی فیصلوں میں رہنمائی کے لیے اشارے موجود ہوتے تھے۔ خوابوں پر مستحکم یقین کو احادیثِ رسولؐ سے بھی مدد ملتی ہے۔ لوگ خواب اپنے روحانی مرشد کو سناتے جو انہیں بتاتا کہ وہ راہِ وصالِ خداوندی کی کس منزل پر ہیں۔

قرآن پاک' مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ سے شگون اکثر و بیشتر لیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ دیوانِ حافظ کو استعمال کیا جاتا۔ ہمایوں نے بھی 1454ء میں ہندوستاں لوٹنے کے لئے دیوانِ حافظ سے فال نکالی تھی۔

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مخصوص احتیاطیں کی جاتیں' تانبے کا سکہ اور ایک دھاتی چھلہ کپڑے میں باندھ کر بازو کے گرد لپیٹ لیا جاتا جسے امام ضامن کا روپیہ کہتے تھے۔ بخیریت لوٹنے پر امام ضامن اتار دیا جاتا اور فاتحہ پڑھ کر مٹھائی تقسیم کی جاتی۔ سفر پر کھانے

کے لیے عموماً مٹھائیاں ساتھ لے کر چلتے۔ سب سے زیادہ رواج اس مٹھائی کا تھا جو پندرہویں صدی کے چشتی صابری عبدالحق رودالوی کے نام پر تیار کی جاتی۔ لیکن جہاں گرد اولیاء بو علی قلندر اور شرف الدین مغاری کے نام کی مٹھائی سفر شروع کرنے سے پہلے تقسیم کرنے کا رواج نسبتاً زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ خدا کسی ولی یا پیغمبر کا نام بمعہ فاتح کسی کھانے پر پڑھ کر عزیز و اقارب میں تقسیم کیا جاتا یا خیرات کر دیا جاتا۔ ایسا عام طور پر منت کے طور پر کیا جاتا۔ بعض دن ایسے تھے جن میں مخصوص اولیاء کے نام پر خوراک تقسیم کی جاتی۔ یہی کام شیعہ علیؑ، عباس یا امام جعفر کے نام پر کرتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اصحاب کہف کے نام کی فاتحہ بھی دلوائی جاتی جس میں بادفا کتے کے لیے برتن الگ رکھا جاتا۔ جب کوئی دعا پوری ہوتی تو بعض علاقوں کے لوگ چراغاں کرتے جبکہ کچھ دریا میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بہاتے۔

بچوں کے بیمار ہونے کی صورت میں انہیں دم کروایا جاتا۔ بعض اوقات پانی کا ایک گلاس شام کی نماز پڑھ کر نکلتے نمازیوں سے دم کروا کر بچے کو پلایا جاتا۔ یہ رواج ترکی اور ایران میں بھی ملتا ہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد خصوصاً بالائی طبقے میں 'غسل صحت' کا رواج تھا۔ اس رواج کے باعث شعراء اپنے سرپرستوں کے غسل صحت پر تہنیتی نظمیں یا تاریخ گوئی کرتے اور انعام پاتے۔

روزہ مرہ زندگی کا ایک الگ محافل میلاد یا مولود تھی۔ مولود نظموں کی صورت میں ہوتا تھا۔ پیغمبر کی زندگی کے کسی بھی پہلو سے متعلق ہو سکتا تھا اسے کئی مولود خواں شبِ برات اور شبِ معراج کو بھی پڑھا جاتا۔ کچھ علاقوں میں تو مولود سمیت ختنے اور تجہیز و تکفین ہر تقریب کا جزو بن گئے تھے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اٹھاویں صدی کی ایک تامل نظم سیرہ پرانام سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ محمدؐ کی زندگی پر عمر پلاور کی یہ نظم 'مسلم تامل ادب کے چند شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ محفل سماع میں گائے جانے کے لیے سندھی مولود کی ایک خاص ہیئت وضع کی گئی تھی۔ خواتین کے اجتماع میں مولود صرف خواتین پڑھتیں۔ بعض اوقات کبھی بہت اچھا پڑھنے والی کو مردوں کی مجلس میں پڑھنے کی اجازت بھی مل جاتی۔ چنانچہ بچے ایک ایسی فضا میں بڑے ہوتے جہاں محمدؐ اور آل محمدؐ کی زندگی کا منظوم ذکر ہر تقریب میں کیا جاتا۔ اس شاعری میں نانا پیغمبر اپنے نواسوں سے کھیلتا دکھایا جاتا ہے۔ جنہیں کل شہید ہونا ہے۔ انہی میں علماء کو اوائل اسلام کے ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لوریوں میں پیغمبرؐ کی

زندگی کے حیران کن واقعات کی طرف اشارے ملتے۔ ایک سے زیادہ شعراء نے ایسی نعتیں لکھیں جن کے متواتر پڑھنے سے شاعر کے دعویٰ کے مطابق' کسی نہ کسی دن خواب میں پیغمبرؐ سے ملاقات "لازماً" ہوتا تھی۔ البصیری کے قصیدہ بردہ کی تلاوت آج بھی دکن کی زندہ روایت ہے۔

شیعہ میلاد کی محفلوں میں زیادہ اہمیت شہادت امام کی یاد میں ہونے والی مجالس کو دیتے۔ ان مجالس کو زیادہ سے زیادہ پر تاثیر بنانے کے لیے کئی مستقل پیشے وجود میں آگئے۔ حدیث خواں کربلا سے متعلق احادیث پڑھ کر سناتے۔ واقعہ خواں پوری لفاظی اور جزئیات کے ساتھ واقعات کربلا بیان کرتے۔ جبکہ قادرالکلام مرثیہ خواں امام کے مصائب پر طویل طویل شاعرانہ کمالات سے بھرپور مرثیے پڑھتے۔ جبکہ تین سوز خواں دل ہلا دینے والی تانوں میں مصائب کربلا بیان کرتے۔ راسخ العقیدہ علماء ان رسوم کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

جس طرح بچے کے پہلی بار قرآن ختم کرنے پر تقریب منعقد کی جاتی تھی' اسی طرح جب ایک عالم دورہ مشکوٰۃ یا صحیحین مکمل کرتا اپنے دوستوں کو بلاتا اور مٹھائی اور دوسری اشیاء سے ان کی تواضع کرتا۔

اسلام سے تعلق رکھنے والی کہانیاں سننے سنانے کا عام رواج تھا۔ اکبر نے جس طرح داستان حمزہ نامہ مصور کروایا اس سے معاشرے کے ہر طبقے میں ان کہانیوں کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حمزہ رسولؐ کے چچا کا نام تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک داستان کے مرکزی کردار بھی ہیں جو فارسی اور علاقائی زبانوں میں ملتی ہے۔ زیادہ حیران کن یہ ہے کہ تمیم داری کی عربی کہانی اس سے پہلے ہندوستان پہنچ کر لوک روایات کا اہم حصہ بن گئی۔ اس میں تمیم کی پرستان میں جنوں اور پریوں کے درمیان مہم جوئی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانی سولہویں صدی کے گولکنڈہ اور تامل لینڈ میں یکساں مقبول تھی۔ یہ کہانی ملتان میں بھی سنائی جاتی تھی۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلم معاشرت کا صرف بالائی طبقہ ہی داستان سننے کا شوقین تھا۔ اس کے برعکس گاؤں میں گویے وارد ہوتے اور ہندوؤں کی اساطیری داستانیں سناتے۔ ان کا موضوع عام طور پر گزرے ہوئے اچھے دور کے ہیرو ہوتا۔ پھر مطربوں اور بھانڈوں کے چلتے پھرتے گروہ ہوتے جو گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو ماضی کے

واقعات کے ساتھ حال کے اہم واقعات مثلاً لاڑکانہ یا سونار گاؤں کی کسی ڈکیتی کے حالات تک منظوم سناتے۔ پھر مذہبی قصے سنانے والے بھی ہوتے۔ ہندوؤں میں بھگتی کے قصے اور مسلمانوں میں صوفیاء کے قصے سنائے جاتے۔ جن میں روزمرہ زندگی کے استعارے میں ایمان اور عقیدے کی حقیقت بیان کی جاتی۔

ہندوپاک کا سفر کرنے والے غیر ملکی یہاں لاتعداد خانقاہوں اور اولیاء کے مزار دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ یہاں حاضری دینے والے بے شمار زائرین کو دیکھ کر انہیں یہاں کے گاؤں اور اولیاء کے باہمی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوک شاعری صوفیاء اور اولیاء کے قصے اور معجزے لوگوں کے اندر دور تک گزارنے میں مدد دیتی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ منصور اور مولانا روم جیسے لوگ ہمیشہ کے لیے لوگوں کے اندر جاگزیں ہو گئے ہیں۔ ان قصوں میں سے ایک کلہوڑوں کے ایک وزیر دیوان گدومل کا قصہ بھی ہے جس میں اس نے 1749ء میں احمد شاہ ابدالی کو کپڑے کی ایک تھیلی پیش کی تھی کہ اس میں اسے پیش کرنے کو سندھ کی سب سے قیمتی چیز سیدوں اور اولیاء کے مقبروں کی خاک تھی۔

برصغیر میں ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں رسولؐ کی ریشِ مبارک کے بال برکات کے طور پر محفوظ ہیں۔ ایسا ایک بال دلی کی بڑی مسجد کے سامنے 'ایک بیجاپور میں اور ایک روہڑی (سندھ) میں موجود ہے۔ جہاں اسے یاقوت اور زمرد سے جڑی سونے کی ڈبیہ میں رکھا گیا ہے اور مارچ میں دیدار کے لیے نکالا جاتا ہے۔ اسی طرح کے تبرکات قدمِ رسولؐ تھے جن کی مثل حاجی مکہ اور مدینہ سے لائے تھے۔ ان کے گرد بڑی بڑی اہم عمارتیں قائم کی گئیں۔ بنگال کی قدمِ رسولؐ مسجد اسی تکریم و تقدیس کی شہادت ہے۔ اُچ شریف کی ایک قادری درگاہ میں ایک موئے مبارک اور عبدالقادر جیلانی کی پگڑی اور چند اہم تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح لکھنو کی ایک امام بارگاہ میں امام کے گھوڑے کی ایک نعل بھی موجود ہے جو کربلا میں گم ہو گئی تھی جبکہ چنار کی ایک امام بارگاہ میں حسنؓ اور حسینؓ کے عمامے محفوظ ہیں۔ کئی مقامات پر مومنین پر پیغمبرؐ اور ان کے نواسے ظاہر ہوئے۔ ایسی ہی ایک جگہ مکلی (سندھ) میں ہے جسے جلوہ گہہ امامین کہا جاتا ہے۔ ہندی مسلمانوں نے جو قصص الاولیاء لکھے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اولیاء سے منسوب کوئی بھی معجزہ جو انسانی ذہن میں آسکتا ہے ان میں موجود ہے۔ بلکہ ہندو اثرات کے باعث ان کی رنگ آمیزی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔

کسی ولی یا مرشد کی موجودگی جو عام طور پر سید ہوتا ہے' خوش حال اور بامقصد زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ نظام الدین اولیاء کی ماں نے انہیں شہید اولیاء کے مزاروں پر صحت یابی کی دعا کے لیے بھیجا تھا۔ اولیاء کی برکات کے حوالے سے ایک کہانی 1911ء کی مردم شماری کے تبصرے کی صورت ملتی ہے۔

مسجد سے کہیں زیادہ اولیاء کے مزاروں سے بنوانے والے اور ولی دونوں کی شخصیت جھلکتی ہے۔ فتح پور سیکری میں سلیم چشتی کا چھوٹا سا روضہ سرخ پتھروں کے پس منظر میں ایک خوب صورت سفید موتی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح محمد غوث گوالیاری کے سیاہی مائل سنگ مرمر سے بنے گنبد کے چھوٹے چھوٹے اور درستاروں کی جھرمٹوں کی یاد دلاتے ہیں جن سے اس ولی کو بے حد دلچسپی تھی۔ ملتان میں رکن الدین کا مقبرہ ہندوستانی طرز تعمیر کے مرعوب کن نمونوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بہت بڑے گنبد میں جابجا نیلی اور سفید ٹائلوں سے آرائش کی گئی ہے۔ اُچ شریف میں سہروردی اور قادری اولیاء کے مقابر پر لگی ضوفشاں نیلی جائیں وسعتِ نظر کی دلیل ہیں۔ پٹھان صوفی اور شاعر ایک چھوٹے سے سایہ دار احاطے میں پشاور میں محوِ خواب ہے۔ اسی طرح بھٹ (سندھ) میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مقبرہ ان کی شاعری کی طرح سبک اور دلفریب ہے۔ نیلے اور سفید گلِ لالہ سے بلند و بالا ستون اٹھائے گئے ہیں جن پر دمکتی ہوئی ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ اس کے صحن میں درویش اور صوفیاء دفن ہیں۔ دلی میں نظام الدین اولیاء کا مقبرہ ایک نفیس مرمریں چھتری سے مزین ہے' جن کے گرد ان کے مداحوں کے مزار ہیں۔ جن میں سے طوطیِ ہند امیر خسرو مورخ برنی' صوفی منش شہزادی جہاں آراء اور اردو کے آخری کلاسیکی شاعر مرزا غالب زیادہ اہم ہیں۔ اکثر اوقات مدفن کی نشان دہی ایک جھنڈ سے کی جاتی جو عموماً سرخ ہوتا۔ رفتہ رفتہ وہ جگہ مقام تقدیس حاصل کر لیتی اور ایک کثیر مقاصد عبادت گاہ بن جاتی۔ بعض اوقات لق و دق صحرا میں اچانک نظر آنے والا شوخ رنگ ٹائیلوں سے شوخ سبز رنگ مقبرہ گلبرگہ مکلی (سندھ) کی یادگار کلاسیکی عمارتوں کے متضاد ہیں۔ مکلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک لاکھ پچیس ہزار اولیاء کے مزار ہیں۔ میر علی شیر قانع 1778ء میں لکھے گئے مکلی نامہ میں بیان کرتا ہے۔

ہر ماہ کے پہلے جمعہ کو یہاں لوگوں کا انبوہ کثیر ہوتا۔ کسی نے اس جگہ کے کسی باسی کو

غمگین یا پریشان حال نہیں دیکھا۔ یہ کم وبیش ہر دو پہر مطمئن رہتے ہیں اس لئے کہ یہ سماع اور دھمال کے اتنے شائق تھے کہ بقول ایک صوفی کے سماع ان کے لیے ذریعہ معراج ہے۔

بہت سی خانقاہوں میں جمعرات کی شبِ محافل سماع منعقد کی جاتی ہیں۔ سیون کے ملنگوں کی دھمال اور بھٹ شاہ کی میٹھی دھنیں آج بھی روحانی شفاء کا سبب خیال کی جاتی ہیں۔ دہلی میں نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی طرح بہت سے چشتی مزاروں پر موسیقار مستقلاً موجود رہتے ہیں۔ زائرین کو حمد و نعت اور صاحب مزار کی تعریف میں شاعرانہ کلام سناتے ہیں۔ پاکپتن جیسی کچھ درگاہوں پر موسیقی ممنوع قرار دی جاچکی ہے اور قوالوں کے بیٹھنے کی جگہ کو قرآن پاک کی تلاوت کے لیے مخصوص کرایا گیا ہے۔ یہ قدم صوفیاء کی درگاہوں کو غیر اسلامی افعال سے پاک کرنے کی کوششوں میں سے ایک یہ ہے۔

کچھ درگاہوں سے عجیب وغریب روایات وابستہ ہیں۔ کراچی میں منگھو پیر کی درگاہ پر مگرمچھوں کا تالاب ہے جنہیں لوگ راتب ڈالتے ہیں۔ ان جانوروں کی تعداد اب خاصی کم ہوگئی ہے۔ پچھلی صدی میں ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بعض انگریز نوجوان ان پر پاؤں رکھتے تالاب کے ایک سے دوسرے سرے تک چلے جاتے تھے۔ ان مگرمچھوں کی سربراہی مور صاحب کے پاس ہے۔ یہ سب سترہویں صدی کے ایک مگرمچھ کی اولاد ہیں جو دراصل پھول تھا۔ مگر پیر صاحب کی بددعا سے ماہیتِ قلبی ہوگئی۔ کلر کہار کی ایک درگاہ پر مور جمع رہتے ہیں۔ درگاہ پر لگے کتبے کے مطابق یہاں سید عبدالقادر جیلانیؒ کے صاحبزادے ہندوؤں کے ہاتھوں **1170**ء میں مارے گئے تھے۔ سلہٹ میں جلال الدینؒ کے مقبرے کے پاس تالاب میں خوب صورت مچھلیاں رکھی گئی ہیں۔ چٹاگانگ کے قریب ایک تالاب نویں صدی کے ایرانی صوفی بایزید سلطانی کے نام سے منسوب ہے۔ جہاں نرم خول والے سفیدی مائل کچھوے پالے گئے ہیں۔ اسی تالاب میں بچے نہلائے جاتے ہیں اور یہی پانی اشیائے خورد و نوش میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس درگاہ پر کپڑے کی کترن باندھنا خاص موثر خیال کیا جاتا ہے۔

بعض مقابر ایسے بھی ہیں جہاں خواتین کا داخلہ مزار کی حدود میں منع ہے۔ یہ ممانعت خصوصاً قادریہ سلسلہ میں زیادہ ہے۔ تاہم زیادہ مقامات پر وہ اندر داخل ہو کر تعویز کی جالی کو مس کرتے ہوئے فاتحہ خوانی کے بعد اپنی مراد کے لیے دعا مانگ سکتی ہیں۔ لاہور میں

داتا گنج بخش کے مزار پر حاضر ہونے والی مغربی خواتین لمبے سکرٹ پہنتی ہیں۔ خواتین اولیاء کے روضے کی سادہ سی عمارت یاد ہے۔ اس کی مجاور عورتیں بھی مزار کے باہر پھرنے والے بھکاریوں سے کم لالچی نہیں ہیں۔ خواتین اولیاء کی درگاہیں زیادہ تر سندھ' بلوچستان اور پنجاب میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں ستایا گیا تو زمین پھٹی اور وہ سما گئیں (بی بی پاکدامناں لاہور' ٹھٹھہ کی بلقت عفیفہ اور قلات کی بی بی نزہان اس کی مثالیں ہیں) ناموں سے پتہ چلتا ہے وہ بیشتر اوقات سات کی تعداد میں ظاہر ہوا کرتی تھیں کتا کاٹے کا علاج کرنے والی مائی سپواراں کی طرح دوسری خواتین اولیاء سے بھی معجزے منسوب ہیں۔

مزار پر حاضر ہونے کا عمل زیارت کہلاتا ہے۔ یہ لفظ خود مزار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر زائر مزار کی جالی پر کپڑے کی کترن باندھ دیتا ہے تاکہ صاحب مزار کو مراد کی یاددہانی ہوتی رہے۔ یہ رسم بہت سے دوسرے ممالک میں بھی رائج ہے۔ کچھ زائرین نہ صرف اس جالی کو مس کرتے ہیں بلکہ چومتے بھی ہیں۔ مقبرے پر جھاڑو دینا بابرکت خیال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر درگاہ پر جھاڑو کی منت مانی جاتی ہے۔ قبر کے تعویز پر پھولوں کی پتیاں اور ہار پھول چڑھتے ہیں اگر کوئی مہمان باوقعت ہے تو اسے سجادہ نشین کچھ خشک پھول تعویز پر سے اٹھا کر منہ میں رکھنے کے لیے دیتا ہے۔ یہ عمل بابرکت خیال کیا جاتا ہے قبر کے تعویز پر ریشمی چادریں چڑھانے کا رواج ہے جو نقرئی دھاگے سے کڑھی ہوتی ہیں۔ یہ چادریں بعد میں اتار لیجاتی ہیں اور خاص مہمانوں کو پیش کی جاتی ہیں۔ زائرین کو درگاہ سے چرواہوں کی مٹھائی بھی ملتی ہے۔ کئی خانقاہیں اپنے مخصوص تبرک کی وجہ سے بھی شہرت رکھتی ہیں۔ عموماً جمعرات کو مزاروں پر شمعیں بھی جلائی جاتی ہیں۔

سالار مسعود کے مزار پر جھنڈے چڑھائے جاتے ہیں۔ کچھ اولیاء کی نذر کے نام سفید مرغے اور بکرے خانقاہ پر چھوڑے جاتے ہیں۔ بہت سی ایسی درگاہیں بھی ہیں جہاں ملکی اور غیر ملکی سربراہوں نے سونے' چاندی کے دروازے' فانوس اور جالیاں چڑھائیں۔ اولیاء کی خدمت میں قرآن کے نسخے بھی پیش کئے جاتے۔ بدایونی نے اپنے مرشد کی خدمت میں قرآن کا ایک نسخہ پیش کیا۔ یہ نسخہ اس نے اپنے ہاتھ سے اس امید سے رقم کیا تھا کہ سنسکرت سے ترجمہ کرتے ہوئے ہاتھوں پر چڑھا کفر جائے۔

صاحب مزار کو زندہ اور صاحب تصوف خیال کیا جاتا ہے۔ مزار پر جانے والا عام طور پر کسی غرض سے جاتا ہے جو محض روحانی' سر فرازی بھی ہو سکتی ہے اور شیر شاہ سوری بھی شامل تھے۔ اکبر کئی بار پا پیادہ اس درگاہ پر حاضر ہوا۔

کسی مظلوم یا بیمار کی صورت میں حضرت معین کے دربار میں توسیع یا کوئی خاص نذرانہ پیش کرنے کی منت مانی جاتی ہے۔ لوگ یہاں لیٹ کر ننگے ہوئے پہنچنے کی منت بھی مانتے ہیں جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہوتے ہیں۔ تقسیم کے بعد بھی پاکستان سے زائرین کو لے کر ایک ٹرین صدر آباد اجمیر بیئے لائین پر جایا کرتی تھی جو بصورت دیگر بند رہتی ہے۔ ان کا عرس چھ رجب کو ہوتا ہے۔

درگاہیں اپنی اپنی خاص کرامات کے حوالے سے معروف ہیں۔ برہان الدین محمود کے معتولے کی خاک بچوں کو چاٹنے کو دی جاتی ہے تاکہ وہ روشن دماغ ہو جائیں۔ ٹھٹھہ کا ایک سکول ماسٹر ہر جمعرات کو اپنے طالب علم لے کر قاضی عبداللہ کے مزار پر سلکی آتا تاکہ ان کی ذہانت چمکے۔

ملتان کے شیر شاہ کی درگاہ نامراد عاشقوں کی دادرسی کے لئے معروف ہے۔ ساحلی علاقوں میں مچھیروں اور کھلے پانیوں میں جانے والوں کو بھی سرپرست پیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ آپ چناب اور سندھ کے مچھیروں کی حفاظت کرتے ہیں۔

مندربن کے لکڑہارے مبارک غازی کے ماننے والے تو جن کے فقیر گاواں میں رہتے ہیں۔ یہ جنگل کے کاٹے جانے والے علاقے کی نشان دہی کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے لکڑہارے جنگل سدھارنے سے پہلے اس ولی کی نذر چاول اور کیلے چڑھاتے تھے۔ یہ ولی ایک شیر پر سوار جنگل میں گھوما کرتے تھے۔

کچھ خانقاہوں پر بے اولاد عورتیں مراد مانگنے جاتی ہیں۔ ان کی ایک مثال فتح پور سیکری میں سلیم چشتی کی درگاہ ہے۔ کچھ ایسے مزار بھی ہیں جہاں حاضری سے بانجھ گائے ہری ہو جاتی ہے۔ جہلم کے شاہ سعید جزام اور کھانسی سے شفا دیتے ہیں۔ لاہور کے تیلیوں کا پیر تیلی ہے۔ جبکہ لوہاروں کا سرپرست شاہ موسیٰ ہے۔ مقدموں میں پھنسے ہوئے لوگ لکھنو کی ایک چھوٹی سی درگاہ شاہ مینا (متوفی 1470ء) پر حاضری دیتے تھے۔ کچھ درگاہیں زمینی سمندر

کے نزدیک مدفون ہیں۔ ان کی خصوصیت ہسٹیریا کا علاج ہے۔ جبکہ اچ کے اولیاء میں سے ایک احمد قتال (متوفی 631) کے مزار پر عورتیں چیت میں حاضری دیتی ہیں تاکہ بھوت یا آسیب وغیرہ ان کا پیچھا چھوڑ دے۔ مراد آباد میں ایک صوفی کے مزار پر زہنی امراض میں ہندو حاضری دیتے ہیں۔ ان میں سے مشہور ترین فیض آباد کے مشرق میں کچھوچھہ میں جہانگیر سمنانی کی خانقاہ ہے جو ایک آسیب زدہ جنگل میں واقع ہے۔ جہاں ذہنی عدم توازن کا شکار مرد عورتیں جمع رہتیں ہیں۔ مرد اوپر والی منزل پر اور عورتیں نیچے۔ بعض اوقات ان کے ساتھ بہت ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ جنگلوں سے اپنا سر ٹکراتے ہیں تاکہ آنے والا خود کو آسیب زدہ ماحول میں محسوس کرے۔

ایک اور عجب خانقاہ سہروردی صوفی شاہ دولہ (متوفی 1667ء) سے منسوب ہے۔ یہ پنجاب کے شہر گجرات میں ہے۔ یہ ولی نافرمانوں کی اولاد کو چھوٹے سر والے چوہوں میں بدل دیتے ہیں، جنہیں بعض اوقات اس درگاہ کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔

مدد صرف صوفیاء اور اولیاء ہی سے نہیں مانگی جاتی شیعہ حلقوں میں مومنین امام مہدی غائب سے رجوع کرتے ہیں۔

زندہ اور گزرے ہوئے صوفیاء اور اولیاء سے بے شمار رنگا رنگ کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ کرامات ان سے علیحدہ ہیں جن کا زائرین کو ان کی درگاہ پر تجربہ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو محض تقویٰ، عبادت اور پرہیزگاری کے اعمال ہیں۔ جنہیں مبالغہ آمیز شکل دے دی جاتی ہے۔ غیر معمولی لمبی مدت کا روزہ اور چلہ معکوس یعنی الٹا لٹک کر عبادت کرنا انہی میں سے ہیں۔ بھرپور گرمیوں میں آگ کے سامنے بیٹھ کر مراقبہ کرنا جو بذات خود جسمانی حرارت بڑھانے والا عمل ہے۔ یہ وہ راہبانہ عمل ہے جو یوگیوں کے زیر اثر اختیار کیا گیا ہے۔ ایک اور کرامت، جس کی تصدیق نہ صرف ہندوستان ہی میں بلکہ اور جگہ بھی کی جاتی ہے یہ ہے کہ ضعیف، عمر رسیدہ اور بستر علالت پر دراز صوفی اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوگیا یہ کہ وہ دھمال میں حصہ لینے لگا۔ صوفیاء کی طوالت عمری، جن کی ایسی روایات میں تصدیق کی جاتی ہے، بجائے خود کرامت ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ولی نماز کے لیے دوران وضو ہی حالت حضوری میں پہنچ جائے ایک معجزہ جو مجھے ہندوستان سے باہر کہیں نہیں ملا یہ ہے کہ کچھ صوفیاء کے اعضاء جسم سے علیحدہ

کئے جانے کے بعد بھی اپنی اپنی جگہ الگ الگ ذکر کرتے پائے گئے۔ تبلیغ اسلام کے حوالے سے بھی کئی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔ کیا خود آپؐ نے معین الدین چشتی کو بغرض تبلیغ ہندوستان جانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہندوؤں 'ڈاکوؤں یا جنوں وغیرہ سے لڑتے ہوئے شہادت پا جانے والے شہداء کے کئی مقابر پرانے دور میں اولیاء کے ہیرو انہ کردار کے گواہ ہیں۔ قبولِ اسلام کئی طرح سے ہوا۔ کسی ولی کی ایک ہی نگاہ سے کایا پلٹ گئی یا نورانی چہرے پر نظر پڑنے سے ہی کافر کلمہ گو بن گیا۔ چودھویں صدی کے اس ہندو طبیب کا کیا حصہ تھا جو ایک ولی کی دوا کی شیشی پر نظر پڑتے ہی مسلمان ہو گیا تھا۔ پیر بدر (متوفی 1440ء) جن کے دادا جلال بخاری کے شاگرد تھے' نے چلہ چٹاگانگ میں کیا جہاں وہ اڑتے ہوئے چٹان پر چڑھ گئے اور کئی ہندو مداحوں کو مسلمان کیا۔ اسی طرح کوہ نمک کے علاقے میں اولیاء نے میٹھے پانی کے چشمے بہائے اور ہندو آبادی کو متوجہ کیا۔

یہ فقرہ تقریباً ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ "اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر حال میں پورا ہوگا" کیونکہ اولیاء واقعات کو عالم مثال سے اس جہان میں لانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ کان میں کلمہ سنا کر بہروں کو شفا دے سکتے ہیں۔ پھونک مار کر علیل کو صحت مند کر سکتے ہیں۔ عوام الناس میں اس طرح کے واقعات مشہور ہیں کہ سو سالہ بے اولاد جوڑے کو تین بیٹے دیئے جو شکر گزار نہ ہونے کے باعث واپس لے لئے گئے۔ معجزاتی داستانیں خصوصاً جانوروں کے حوالے سے' دوسرے ممالک سے بھی لی گئیں۔ اگرچہ یہاں بھی ان کا بدھ اور ہندو ورثہ موجود تھا۔ جنوبی ہند کے ایک صوفی کا پالتو شیر ایک دوسرے صوفی کے غزال کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔ فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی رو میں حمید الدین کی طرح کے کچھ صوفیاء نے سبزی خوری اختیار کر لی۔ یہ رجحان مغربی تصوف کی تاریخ کے ابتدائی دور میں بھی ملتا ہے۔ جانوروں میں بلی کو خاص مقام حاصل ہے۔ اشرف جہانگی کی کافر اور مومن میں تمیز کرنے والی بلی صوفی کے لئے زندگی قربان کر دیتی ہے۔ ایسی ایک بلی ابتدائی فارسی ماخذ میں بھی ملتی ہے۔ لیکن گنتی کے چند مفروضے ملتے ہیں جن میں صوفی یا ولی اللہ بلی کے ساتھ دکھایا گیا ہو۔ عوام الناس کا شوق کرامات اپنی جگہ لیکن صوفیاء یقیناً سندھی پیر مراد (1500ء) کے ہم نوا رہے ہوں گے جس نے ایک برہمن کے مردہ چوہا زندہ کرنے پر کہا تھا کہ "تنِ مردہ کو جلا دینا بدعت ہے لیکن مردہ دلوں کو زندہ کرنا سنت ہے"

اگرچہ لوگ اولیاء کے مزاروں پر روحانی خیر و برکت کے لئے سال بعد حاضر ہوتے رہتے ہیں لیکن عرس اس حاضری کا خصوصی موقع ہے۔
یہ اس دن کی یاد میں منایا جاتا ہے جب ولی کی روح اپنے ازلی محبوب سے ملی' بڑی درگاہوں پر لاکھوں عقیدت مند اکٹھے ہوتے ہیں۔ کچھ تقاریب واقعی بین الاقوامی ہوتی ہیں کچھ زیارتوں پر عام برکات کے علاوہ خصوصی رسوم بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان میں بہشتی دروازہ ہے۔ اس میں سے گزرنے والا زائر بہشت میں اپنی جگہ مخصوص کروالیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بے اندازہ ہجوم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ بعد ازاں اہتمام کیا گیا کہ لوگ اس میں سے گزرنے کے لیے قطار بنائیں۔ یقیناً اب بہشتی دروازے سے گزرنا زیادہ آسان ہو گیا۔ لیکن اب یہ پہلا کا سا طاقتور عمل نہ رہ گیا۔ تجور میں قادر ولی صاحب کے عرس پر کھیر کے مٹکے ساحل سمندر پر توڑے جاتے اور لوگ اس کا ایک ایک قطرہ حاصل کرنے کے لیے دوڑے آتے۔ کئی جگہوں پر عرس کے دوران باقاعدہ میلہ لگتا جہاں پر پھول ہار تسبیح اور کڑے وغیرہ بیچنے والے آتے۔ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے جنہیں کسی بھی طور مناسب نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ سیون کا عرس اپنے جوش و خروش کے علاوہ غیر اخلاقی سرگرمیوں کے لیے بھی مشہور تھا۔ ظاہر ہے کہ شیولنگ کی پوجا کے ایک تسلسل کا اثر اسلام کے بعد بھی کہیں زیریں سطح پر موجود تھا۔ بعض مزاروں پر مستقل رقاصائیں رکھیں جاتیں تھیں۔ بنگلور میں لوح لانگر شاہ کا مزار ایسی ہی مثال ہے۔ اسلام آباد کی حدود میں واقع نور پور میں لگنے والا میلہ طوائفوں اور ہیجڑوں کا اجتماع بن جاتا تھا۔ یہی صورت بنگال کے شیخ سدو کی ہے لاہور میں حضرت میاں میر کے عرس پر بھی بدنام عورتیں حاضر ہوتی تھیں۔ نور پور کے بہلول شاہ' شاہ لطیف باری کے مرید تھے۔ جن سے عجیب و غریب کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ شاہ لطیف باری حیات النور دلی کے ہاتھ پر بیعت کر کے قادریہ سلسلہ میں شامل ہوئے تھے۔ سیون کی طرح نور پور بھی مختلف مذاہب کے مقدس مقام ہونے کی شہرت رکھتا ہے۔ قبل از مسیح زمانے میں یہاں پر اگنی کا مندر تھا۔ آج بھی اس کے نیچے ایک محراب دار غار میں چھوٹا سا شعلہ روشن ہے۔ گندھارا عہد میں اسے بدھوں کی عبادت گاہ بنا دیا گیا اور پھر' بالآخر اسے مسلمان کیا گیا۔ اس خانقاہ پر ہونے والی تقریبات میں ہیجان انگیز اور مدہوش کن سرگرمیوں پر ابھی حال ہی میں پابندی لگائی ہے۔

ایسے طور طریقوں کا تسلسل فقط پاک و ہند کا حصہ نہیں بلکہ ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم دو عظیم مذاہب کے پیروکاروں کی ایک ہی جگہ پر بے نظیر مثالیں صرف ہندوستان میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سندھ میں ایسی مسلم درگاہیں تھیں جہاں ہندو بھی حاضری دیتے تھے۔ سندھ میں تصوف کے مطالعہ میں ہندوؤں کے حصے سے ثقافتی اثرات اور ہندوؤں کی مسلمان پیروں سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کا شیخ طاہر ہندوؤں کا اوڈیرو لال ہے۔ سندھ میں مقبروں کی تصویری آرائش عام ہے جو ہندو اثرات کا نتیجہ ہے۔ ڈھاکہ میں ایک بڑا امام باڑہ بھی اسی طرح کی تصاویر سے مزین ہے۔ حضرت علیؓ کا سفید دلدل فطری شکل میں یا خطاطی میں جابجا نظر آتا ہے۔

ملتان میں شمس الدین تبریزی کا مقبرہ نیلی اور سفید ٹائیلوں کے جالیدار ڈیزائن سے بنایا گیا ہے۔ ان کے متعلق کہانیوں کا ایک دلچسپ ملغوبہ ملتا ہے۔ حالانکہ شمس چودھویں صدی کے اسماعیلی مبلغ تھے جن کا نام روایتاً جلال الدین رومی کے صوفیانہ محبوب سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ روایت کے مطابق یہ ہندوستان آئے تھے جہاں ملاؤں نے ان کی کھال اتروا دی۔ ان کی شہادت سندھی اور پنجابی لوک شاعری میں اکثر ایک ہیرو دانہ کارنامے کے طور پر بیان کی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ ملتان کی بہت زیادہ گرمی بھی شمس تبریز کی وجہ سے ہے۔ جب شہر کے ایک باشندے نے انہیں مچھلی بھون کر دینے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اس کام کے لیے سورج کو نیچے بلا لیا تھا۔ اس طبقے کے سب سے مشہور صوفی غازی میاں یا صالار مسعود ہیں۔ جن کا مقبرہ بہرائچ (یوپی) میں ہے۔ بقول برنی وہ محمود غزنوی کا بھتیجا تھا۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر میں فوجی مہمات کا آغاز کیا اور ایک 1033ء میں انیس سال کی عمر میں شہید ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں ان کا مقبرہ ہے کبھی سورج مندر ہوا کرتا تھا۔ غوری کی آمد سے پہلے علاقے کے مسلمان اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ناصر الدین نے 1250ء کے لگ بھگ ان کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ یہاں امیر خسرو نے قصیدہ پڑھا اور دو بڑے سلطان محمد اور فیروز شاہ یہاں حاضر ہوئے۔ داستان کے مطابق چونکہ یہ نوجوان ہیرو کنوارہ شہید ہوا تھا ان کے عرس کا ایک حصہ رودالی کی زہرہ بی بی سے ان کی شادی ہے یہ خاتون بھی ناکتخدا فوت ہوئیں اور اسی خانقاہ میں مدفون ہیں۔ یہاں پر مانی جانے والی منتیں منفرد ہیں جن میں سے ایک زہرہ بی بی کا جہیز بھی ہے جسے منت پوری ہونے پر سالار مسعود کے مزار پر چڑھایا جاتا ہے۔ سکندر

لودھی نے غیر اخلاق حرکات کے باعث جیٹھ میں ہونے والے اس عرس پر پابندی لگا دی اس نے مسعود کے نام پر نکلنے والے نیزوں کے جلوس پر بھی پابندی لگا دی۔ لیکن میو برادری میں یہ رواج جاری رہا پہلے پہل لوگوں کی ٹانگوں کی کوئی بیماری ٹھیک ہوتی تو وہ پیر کے شکرانے میں گندم کے آٹے سے بنا اور شیرے میں پکا ہوا گھوڑا چڑھا جاتے۔ پہلے وقتوں میں سالار مسعود کے عرس پر لاکھوں لوگ جمع ہوتے۔ شاہ ولی اللہ جیسے راسخ العقیدہ صوفیاء نے اس رواج کو مکمل کافرانہ قرار دیا۔ ہندو مسلم ہر دو سالار مسعود کے ساتھیوں کی قبروں پر حاضری دیتے۔ شہداء پر لوگوں کا ایمان اتنا مضبوط تھا کہ بدایونی جیسا تعقل پسند عالم بھی بچوں کو بعد از مرگ زندہ کرنے کی ان کی صلاحیت کے عقیدے کا دفاع کرتا ہے۔

ایک اور غیر معمولی ولی زندہ شاہ مدار ہیں۔ روایت کے مطابق یہ دراصل الیپو کے یہودی تھے جنہوں نے سری علوم امام مہدی سے نجف میں پڑھے۔ انہوں نے اپنے جائے تدفین مکن پور نزد کانپور سے جنات بے دخل کیے۔ ہندو انہیں رام کے بھائی لکشمن کا اوتار سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات 1050ء میں ہوئی۔ ان کے مداری درویش کالے کپڑے پہنتے اور تجرد کی زندگی گزارتے تھے۔ سانپ اور بچھو کے کاٹے کا علاج انہیں عطا کیا گیا تھا۔ بعد ازاں یہ مداری درویش شیر، ریچھ اور بندر سدھانے لگے اور آگ پر چلنے جیسے تماشے دکھانے لگے۔ اس دوران وہ دم مدار کا نعرہ لگاتے۔ ان کے نزدیک یہ ورد ان کے مرشد کی طوالتِ عمر، تقریباً چار سو سال کا، سبب بھی تھی۔ عورتوں کو اس ولی کے مزار پر آنے کی اجازت نہیں۔ بدایونی جیسا متقی مورخ بھی "یہاں حرص وہوا کا شکار ہو گیا تھا" لیکن اس نے اس گناہ سے عصمت بھی اسی دنیا میں حاصل کر لی تھی۔

ازمنہ وسطیٰ، اور کہیں کہیں جدید ہندوستان میں گھومتے پائے جانے والے درویشوں کے ٹولوں میں سے مداری صرف ایک تھے۔ اس دور میں رفاعیہ فرقہ ایسے فقیروں میں ڈھل گیا جو اپنی آنکھیں باہر نکال لیتے۔ زندہ سانپ نگل جاتے، خود کو زخم لگاتے اور اسے ٹھیک کر لیتے۔ انہی بے شرع دریشوں کا ایک ذیلی گروہ ملنگ ہیں۔ ملنگ وہ لوگ تھے جو بکثرت چرس پیتے، کپڑے کے نام کو صرف لنگوٹی باندھتے اور ہمیشہ آگ کی قربت میں رہتے۔ پاکستان میں یہ اصطلاح عام طور پر سیہون کے ملنگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس طرح کا ایک گروہ جلالیہ کہلاتا ہے۔ ان کا تعلق اُچ شریف کے مخدوم جہانیاں سے بیان کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ گلے میں اون کا ایک باریک دھاگہ پہنتے' کمر کے گرد کپڑا لپٹا ہوا اور ہاتھ میں ڈنڈا' یہ بھی بازاری بھکاری ہیں۔ یہ سر' مونچھیں اور داڑھی منڈواتے ہیں۔ صرف دائیں جانب ایک لٹ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ لوگ قلندروں سے مشابہت رکھتے ہیں جو تیرہویں صدی سے لے کر ملک بھر میں گھومتے رہے ہیں۔ یہ اکثر و بیشتر دو بڑے سلسلوں کے صوفیاء کی دل آزاری کا سبب بنتے تھے ان کے صوفیاء میں سے ایک نجم الدین مانڈو میں دفن ہے اور بعض دوسرے قلندروں کی طرح اس کی عمر بھی ناقابلِ حد تک طویل بیان کی جاتی ہے۔ قلندروں کا بڑا مرکز پانی پت میں بو علیؒ کی درگاہ تھا۔ ان کی ایک درگاہ کرنال میں بھی ہے۔

ایک اور عجیب صوفی جن کے ماننے والوں کو بے شرع کہا جاتا ہے' موسیٰ سہاگی ہیں۔ یہ پندرہویں صدی کے گجرات کے ایک صوفی جلال الدین سرخ بخاری کے ماننے والے تھے۔ اپنا مقام چھپانے کے لیے انہوں نے ہیجڑوں کے درمیان زندگی گزاری۔ وہ عورتوں کا لباس یہ بتانے کے لیے پہنتے کہ انہوں نے اپنا آپ خدا کے لیے اس طرح وقف کر دیا ہے جیسے ایک عورت اپنے خاوند کے لیے کرتی ہے۔ یہ خیال ہندوستانی اسلام کی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔

ملک بھر میں نو گزہ پیروں کا بھی احترام کیا جاتا تھا۔ ان کے نام اور کام سے کوئی واقف نہ تھا۔ بنگال کے کسی گاؤں میں کوئی پوچھتا کہ ان نو گزہ مزاروں میں مدفون شہید کا تعلق کس دور سے ہے تو جواب ملتا "بہت پہلے بہت پرانے' ہزاروں سال پرانے' ہمارے پیغمبر مقدس کی طرح" ان کی غرض برکت سے تھی نہ کہ ان کی تاریخ سے۔

مسلم اور ہندو مذہبی تصورات کے سنگم سے جہاں خارجی سطح پر بے شرع درویش وجود میں آئے وہاں روحانی بالیدگی عطا کرنے کے نئے ادارے بھی ابھرے۔ مثلاً پنج پیر پانچ اولیاء کا ایسا گروہ ہے جس کے عقیدت مند ہندوپاک کے دریائی میدانوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ بنگال کے سنار گاؤں کے علاقوں میں ان کے ساتھ پیر بدر کا نام لیا جاتا ہے۔ جبکہ پنجاب میں ان پیروں میں سے ایک کو خواجہ خضر کا نام دیا جاتا ہے۔ خواجہ خضر دراصل ایسے مقامات ولائت کے مجمع صنعات ہیں۔ یہ مسافروں کے لافانی رہنما اور پانی پر سفر کرنے والوں کے محافظ ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں دیئے روشن کر کے ان کے احترام میں دریا میں بہائے جاتے ہیں۔ ولی کے دھوبی ان کا سالانہ عرس منانے کے لیے گھاس کی کشتیاں دریا میں بہاتے

تھے۔ بنگال میں مرشد آباد کے علاقے میں قمری سال کی آخری جمعرات کو کاغذ کے بجرے گنگا میں بہائے جاتے۔ سندھ میں خواجہ خضر کا تعلق جزیرہ بھکر سے جوڑا جاتا ہے۔ اگلے وقتوں میں بذید' پلا مچھلی زیریں سندھ سے سال میں ایک مرتبہ الٹا تیرتی ہوئی یہاں خضر کے سلام کو حاضر ہوتی لیکن اب یہ ناممکن ہو چکا ہے کیونکہ زیریں سندھ اور خواجہ خضر کی درگاہ کے درمیان دو بیراج بن چکے ہیں۔ مارچ میں جب چھوٹے چھوٹے چکور چہچہاتے ہیں تو سندھی دیہاتی کہتے ہیں یہ پیر خضر' پیر خضر کہہ رہے ہیں۔

صوفیاء کی تعظیم آج بھی ہندوپاکستان کے عوامی اسلام کا اہم جزو ہے۔ بے شمار لوگ کسی نہ کسی طرح ان درگاہوں سے وابستہ ہیں لیکن اوقاف کے چھن جانے کے باعث ہندوستان کی کچھ عظیم درگاہیں جو بہت شاندار ہوا کرتی تھیں انحطاط کا شکار ہیں۔ پاکستان میں درگاہوں کو وقف جائیدادوں کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔ جو ان کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔ لیکن جو درگاہیں ابھی تک کسی خاندان کی تحویل میں ہیں ان کی اقتصادیات پر عرس کے موقع پر ہزاروں زائرین کو کھانے کھلانے سے خاصا بوجھ پڑتا ہے۔ آج بھی کسی گاؤں میں پیر کی آمد اہم واقعہ شمار کی جاتی ہے۔ ہر کوئی پاؤں چھونے کو بڑھتا ہے۔ پیر صاحب کو عمدہ سے عمدہ خوراک پیش کی جاتی ہے۔ بچا کھچا مریدین کے حصے میں آتا ہے۔ لوگوں کو خیر و برکت سے نواز کر پیر صاحب تحائف سے لدے پھندے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

چنانچہ اگر اقبال جیسے مصلحین عوم کو پیر پرستی سے نجات دلوانا چاہتے تھے تو کچھ تعجب نہیں۔ مریدین کی غربت اور درگاہوں پر دولت کے انبار کے پس منظر میں شاہکار کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں۔ کیا رسول اور ان کے اصحابہ فقر کو ترجیح نہیں دیتے تھے اور کیا اسلام کو کسی پروہت طبقے سے استغناء کا شرف حاصل نہیں ہے؟ یقیناً یہ سب درست ہے لیکن اس کے باوجود پیر پر اعتقاد اور درگاہ کی حاضری آج بھی بہت سے مفلوک الحالوں کے لئے روحانی آسودگی کا ذریعہ ہے جس سے ان کی زندگی ایک پراسرار طور پر بامعنی ہو جاتی ہے۔

اس آسودگی کا کچھ حصہ تو اس صوفیانہ کلام سے حاصل ہوتا ہے جو بر صغیر کے ہر حصے میں لکھا گیا جو کچھ دارا شکوہ نے ہندو مسلم قربت کے حوالے سے فلسفیانہ اصطلاحات اور اعلیٰ علمی زبان میں لکھا۔ تقریباً وہی کچھ صوفیاء نے علاقائی زبانوں میں بھی بیان کیا۔ صوفیاء کا واحد مقصد لوگوں میں خدا اور رسول کی محبت اجاگر کرنا تھا۔ اس لئے وہ الٰہیاتی تعریفوں اور

باریک فقہی مسائل میں نہیں الجھے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ صوفیاء کا مخاطب حلقہ خواص نہ تھا۔ وہ اگر ان مسائل پر کچھ جاننا چاہیں بھی تو وہ کسی روحانی مرشد کی سربراہی میں اپنے ایک بند حلقے میں ان عربی کی اصطلاحات اور ان کی مدد سے سے ہونے والی بحث سے اپنی تسلی کر سکتے تھے۔ بجائے اس کے صوفیاء کا مخاطب عوام الناس تھے جن کو عربی اور فارسی پر دسترس نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے دیسی زبان اور شاعرانہ اصناف کو استعمال کیا۔ کیونکہ یہ دیہات اور خصوصاً خواتین میں بخوبی سمجھے جاتے تھے۔

وسطی دور میں مسلمانوں کی لکھی پہلی بڑی ہندی تصنیف ایک مثنوی ہے جس میں چنداا ور لورکا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اسے 1370ء میں مولانا داؤد نے فیروز تغلق کے وزیر کے لئے مرتب کیا تھا۔

اوائل مغل دور میں بہت سے صوفیاء نے ہندی میں عشقیہ گیت لکھے اس ذیل میں کالپی کے مہدی ولی برہان الدین کے مرید ملک محمد جائسی اہم ہیں۔ جنہوں نے مقامی روایات پر مبنی ایک اور بڑی کتاب "پدماوتی" تصنیف کی۔ بدایونی نے سندھ سے تعلق رکھنے والے درویشوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے پر سوز آواز میں اسے ہندی گیت سنا کر متاثر کیا۔ سارے ہندوستان میں مقامی زبان میں شاعری سترہویں صدی میں شروع ہوئی۔ جوں جوں ہندوستان میں مرکز کمزور ہو گیا مقامی زبان میں شاعری مضبوط ہوتی گئی۔

گجرات اور بیجاپور میں کی جانے والی صوفیانہ شاعری میں روح کو ہجر میں مبتلا عورت کے روپ میں پیش کئے جانے کی روایت جاری رہی۔ عربی زبان میں لفظ نفس مونث ہے۔ اسے عربی اور ایرانی صوفی "روحِ اسفل" اور "بدی کی جبلت" کے معنی میں استعمال کرتے رہے۔ انہی خطوط پر انہوں نے نفس کو نافرمان عورت سے تشبیہ دی ہے جو خدا تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ہندوستانی تصوف میں نفس کی مختلف منازل اور مدارج (امارہ' سورہ مواعا 12/59 سورہ 75/2 اپنے اور مطمعنہ سورہ 89/27) ہندوؤں کی برہمن کے متماثل ہے جو ایسی زوج ہے۔ جو اپنے مالک اور محبوب سے جدا ہے اور اس سے ملن کو بے تاب ہے۔ اس لئے وہ اپنی مونث روح کی خدا اور رسول کے لئے تڑپ کو بیان کرنے کے لئے عورت کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ گھر گرہستی کی چیزوں کو بھی روحانی افعال کی علامتوں کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ گجرات اور بیجاپور میں چکی نامہ بکثرت لکھے گئے۔ ان کی اکثریت

بڑے صوفیاء کی بجائے ان کے مریدین نے سترہویں صدی کے بعد تحریر کرنا شروع کئے۔

چکی کے زیرِ گردش پتھر کا استعارہ عطار اور رومی نے بھی کئی حوالوں سے استعمال کیا ہے۔ یہ استعارہ سبک ہندی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن عوامی شاعری میں یہ محاورہ زیادہ گہرے وجودی معنی میں استعمال ہوا تھا۔ عورت سے وابستگی کے حوالے سے چکی یہاں زیادہ بلیغ استعارہ تھا۔ "چکی کا دستہ الف کی علامت ہے جس سے مراد اللہ ہے۔ جبکہ اس کا دھرہ محمد ہے" ہم چکی میں اناج ڈالتے ہیں جس کے گواہ ہمارے ہاتھ ہیں جبکہ شریعت کی تابعداری ہمارے سارے جسم کو تنظیم میں رکھتی ہے۔

اسی طرح بے شمار اشعار کاتنے اور بننے سے متعلق ہیں۔ بیجاپور میں صوفیاء نے چرخی نامہ لکھے پنجاب اور سندھ کے صوفیاء نے اپنے نفس کی روئی سے ایسا عمدہ دھاگہ کاتنے کو 'جو خدا کو پسند آئے اور وہ خرید لے' ایسی محتاط زندگی گزارنے سے تشبیہہ دی ہے جو حاصل حیات پر منتج ہو۔ اس لئے کہ خدا کو برا کاتا ہوا سوت خریدنے کی کیا حاجت ہے۔ انہیں چرخے کی آواز ذکر الٰہی سے متشابہ نظر آتی ہے۔

سندھ کے شاہ عبداللطیف نے اپنے رسالو کا مکمل باب چرخے کے قدیم گیت کپائتی کی دھن میں اس موضوع پر لکھا۔ ان کے ذرا بعد ایک پنجابی شاعر فرد فقیر (متوفی **1790ء**) نے کسب نامہ بافندگان لکھی جس میں وہ کاتنے کے عمل کی روحانی توجیہہ کرتا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ محنت کش جولاہے کا خون چوسنے والے طبقے کی شکائت بھی کرتا ہے' جسے بالآخر اس عمل کے باعث جہنم میں جانا ہے۔ عوامی شاعری کا بغور مطالعہ ہمیں سترہویں اور اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی معاشرتی زندگی کے متعلق قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے۔

دوسری طرف وادی سندھ اور پنجاب میں لوک کہانیوں کو روحانی رنگ دیا گیا تاکہ ان پر صوفیانہ نظموں کی بنیاد رکھی جا سکے۔ پنجاب میں ہیر رانجھا کی کہانی خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ اس کہانی کو درجنوں شعراء نے مختلف زبانوں میں لکھا ہیر روح کی علامت ہے جبکہ رانجھا معشوقِ ازلی۔ ان کہانیوں کا مرکزی کردار ہمیشہ عورت ہوتی ہے جو اپنے معشوق سے ملنے جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا گھڑا ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بھی ڈوب جاتی ہے۔ یہ سسی بھی ہو سکتی ہے جس نے خوابِ غفلت میں اپنا پنوں گنوایا اور پھر صحراؤں میں اس کے قافلے کا تعاقب کرتی اس سے اتصال پاتی اور مر جاتی ہے۔ یہ ساری عورتیں ایک روح کی علامت

ہیں۔ جنہیں اس رنگا رنگ دنیا میں لایا گیا لیکن وہ اپنے پہلے معشوق کی وفادار رہیں اور انہوں نے اپنے اصل مقام یعنی وصال الٰہی کے لئے جدوجہد میں اس فریبِ حیات سے نجات پائی۔

صوفیاء نے عوام سے قریب ہونے اور اپنی شاعری کو دل نشین بنانے کے لئے پہلے سے چلی آنے والی اصناف کو بھی استعمال کیا۔ ان میں سے ایک بارہ ماسہ ہے ان گیتوں میں سال کے بارہ مہینوں کی صفات بیان کی جاتی تھیں اور یہ پورے ہندوستان میں مقبول تھے۔ اس صنف کی ہیروئین بھی نسوانی روح ہے جو اپنے معشوق کی کج ادائیوں اور کم التفاتی کی شاکی ہے۔ ان نظموں میں اسلامی علامات کا بھرپور التزام کیا جاتا ہے اور قمری سال کے آخری یعنی حج کے مہینے میں اس کا اپنے معشوق سے وصال ہوتا ہے یہ صوفیانہ خیالات نیچے کی طرف سفر کرتے لوریوں تک پہنچ جاتے ہیں محبوب پیغمبرؐ کو ایک تاباں روحانی دولہا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس شاعری سے ناخواندہ دیہاتیوں کو احساس ہوا کہ وہ بھی ازلی سچائی تک رسائی رکھتے ہیں۔ پڑھے لکھے لیکن سخت دل ملا پر کیا جانے والا طنز نہ صرف مجذوب صوفی کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ان لوگوں کی ذہنی حالت کو بھی بیان کرتا ہے۔ جو مسائل فقہ کی باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے عوامی شاعری میں بار بار کہا جاتا ہے کہ "کنز" قدوری اور کفایہ بے سود ہیں۔ یہ تینوں کتب مذہبی مدارس کے نصاب میں شامل تھیں اور پڑھے لکھے لیکن تنگ دل ملاؤں کی علامت ہیں۔ لوک شاعری میں زور دیا جاتا ہے کہ اصل اہمیت صرف جلوہ محبوب کی ہے جو سینکڑوں ہزاروں کتابوں میں بھی نہیں سما سکتا۔

صوفیانہ لوک شاعری سندھ اور پنجاب میں کامیابی سے کی گئی۔ اس کی پہلی مثال سولہویں صدی میں ملتی ہے چشتی شاعر فرید ثانی نے سب سے پہلے پنجابی میں ابیات لکھے جن میں سے کچھ سکھوں کی مقدس کتاب آدی گرنتھ میں شامل ہو گئے۔ حکمرانوں کے جبرو استبداد کے ستائے ہوئے کچھ صوفی سندھ سے نکل کر برہان پور چلے گئے تھے۔ انہوں نے دوران سماع سندھی شاعری استعمال کی۔ کچھ ہی عرصے بعد سہیون کے قاضی قاداں کے کلام نے کلاسیکی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کے کلام کی جامعیت مقبولِ عام لوک کہانیوں کے استعارے استعمال کرنے کی وجہ سے تھی۔ وہ انہیں شاعری کے لئے فطری تخیلات کو بھی

استعمال کرتا ہے۔ ان کی شاعری زیادہ تر صوفیاء کے خلاف تعقل رویے کی نمائندہ ہے۔ ہالہ کے سہروردی مخدوم نور کی درگاہ سندھ کے تہذیبی مراکز میں سے ایک ہے انہوں نے اپنے فارسی ملفوظات میں کچھ سندھی شاعری بھی شامل کی ہے۔ ان کے معاصر بلاری کے عبدالکریم (متوفی 1623ء) نے بھی صوفیانہ شاعری کی۔ اس صوفی نے دوسرے جہان کی تلاش کو کسی کے کنائے میں بیان کیا۔

ایک اور سندھی شاعر میاں شاہ عنائت قادری ہیں۔ ہمیں پنجاب کے پہلے صوفی شاعر کا پتہ داراشکوہ کی کتاب "حسنات العارفین" سے چلتا ہے۔ ان کا نام مادھو لال حسین (متوفی 1593ء) ہے۔ ان کی مجذوبانہ سرستی نے موسیقی اور رقص میں اپنا اظہار پایا۔ مادھو ان کا ہندو محبوب تھا جو ان کے نام کا بھی حصہ بن گیا۔ دونوں کے مزار ساتھ ساتھ ہیں۔ سوہنی اور ہیر جیسے مقامی لوک کردار پہلی بار اپنی شاعری میں بطور علامت استعمال کیے۔ ان کے مقبرے سے متصل مسجد بعد میں پنجابی حکمران رنجیت سنگھ کی مسلمان بیوی نے 1839ء میں تعمیر کروائی۔ ایک صدی بعد جھنگ کے رہنے والے قادری صوفی سلطان باہو نے جن کا عربی اور فارسی میں فاضلانہ کام فراموش کیا جا چکا ہے' اپنی مشہور پنجابی سہ حرفی لکھی جس کا پہلا مصرع مرشد کے ذکر مسلسل کے اسرار کو نہایت خوب صورتی سے بیان کرتا ہے۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے مرشد من وچ لائی ہو

مطلب یہ کہ قادری ذکر نے میرے دل میں خدا کو یوں جاگزیں کیا ہے کہ "اس کی خوشبو مجھے اس کے اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہونے کا احساس دلاتی ہے"

اور واقعی سلطان باہو کے مزار کی دیواریں رنگ رنگ ٹائیلوں سے بنے گل و گلزار سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

سندھی صوفیانہ شاعری شاہ عبداللطیف (1752ء۔1689ء) کے زمانے میں اپنے عروج کو پہنچی۔ وہ کچھ عرصہ یوگیوں کے ہمراہ رہے اور قرآنی تصورات سے مزین اشعار میں ان کی روحانیت کی تعریف کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی شاعری نحوی تقطیع یا منطقی تشریح کی بجائے گانے اور سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے رسالوں میں راگوں کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ آج کے دن تک یہ مقبول ترین سندھی شاعری ہے حالانکہ اس میں بہت پیچیدہ

سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ شاہ عبد اللطیف کلاسیکی صوفیانہ ادب سے آگاہ تھے اور انہیں مولانا جلال الدین رومی بہت پسند تھے۔ ان کی ہیروئن کی محبوب حقیقی سے محبت اور فراق کی تڑپ نفسیاتی گہرائی کی حامل ہے۔ ان کی شاعری سندھ کے مزاج کی عکاس ہے۔ خشک درختوں، بگولوں اور خطرناک مگرمچھوں کا سندھ ان کی شاعری سے جھلکتا ہے۔ مچھیرے کی بیوی اپنے خاوند کی منتظر ہے کہ وہ کب سانس اور جسم کی ڈوری برقرار رکھنے کا سامان لے کر آتا ہے جھونپڑے میں لیٹی عورت محبوب حقیقی کی صفت ستاری پر آس لگائے بیٹھی ہے کہ وہ اسے ڈھانپ لے اور وہ موسم کے ستم سے بچ جائے۔ یہیں اناج کا ذخیرہ کرنے والوں پر تنقید ملتی ہے۔ گائے، بھینس اور مینڈک نظر آتے ہیں۔ دور افق پر کالے کالے بادل بھی نظر آتے ہیں جو بالآخر پیاسی زمین کو سرشار کرتے ہیں۔ اس مقام پر شاعر ایک بار پھر پیغمبرؐ سے رجوع کرتا ہے جسے رحمت العالمین بنا کر بھیجا گیا۔ شاعر پیغمبرؐ سے التماس کرتا کہ وہ روز حشر اپنی امت کی شفاعت فرمائیں۔ لیکن ساری شاعری میں سندھ کی سیاسی شکست و ریخت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جس کے کچھ حصے 1739ء میں محمد شاہ نے قبضے میں لئے تھے اور جسے احمد شاہ درانی کے حملے بھی برداشت کرنا پڑے تھے۔

انیسویں صدی سے سندھ کے ہندوستانی عالموں نے شاہ لطیف کی شاعری کی تشریح اس طرح کرنا شروع کی گویا یہ کام اصل میں ہندو تصوف کا ہے جس پر اتفاقاً ایک سطحی اسلامی رنگ چڑھ گیا ہے۔ یہی کچھ شاہ لطیف کے پنجابی معاصر بلھے شاہؒ (1680ء-1758ء) کے ساتھ بھی ہوا۔ بلھے شاہ نے بھی شاہ لطیف کی طرح بلند آہنگ لہجے میں محیط کل محبت کی بات کی۔ بلھے شاہ قصور سے تعلق رکھتے تھے اور نئی نئی مسلمان ہونے والی ارائیں برادری کے شاہ عنائت قادری کے مرید تھے۔ شاہ عنائت قادری کو ہندو رسم و رواج اور فلسفے پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے محمد غوث گوالیاری کی "جواہر خمسہ" پر حواشی بھی لکھے۔ انہوں نے گوشہ نشینی کی زندگی گزاری کیونکہ داراشکوہ کی سزائے موت کے بعد حالات قادریہ کے لئے سازگار نہ رہے تھے۔ لیکن بلھے شاہ 'جو تاعمر مجرد رہے' نے بڑے جرات مندانہ انداز میں وحدت کلی پر اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنے خیالات اور احساسات کافی کی صورت بیان کئے۔ اپنی غنایت کے باعث آج بھی مقبول ہیں۔ ان کے کلام میں کثرت اور وحدت کے قولِ محال پر بے شمار سوالات ملتے ہیں۔ اس حوالے سے بلھے شاہؒ

سندھ کے سچل سرمست (1739ء۔1826ء) کے بہت قریب ہیں۔ سچل سرمست نے بھی تجرد کی زندگی گزاری اور زیادہ تر بالائی سندھ کے علاقے درازان میں مقیم رہے۔ انہوں نے بلھے شاہ کی طرح کے سوالات بے اندازہ جرات اور بے باکی سے اٹھائے۔

اور آج سچل کا ایک جدید ایڈیٹر یہ دعویٰ کرتا ہے۔

"سندھی فطرت نے تصوف کے اثرات جس قدر قبول کیے آج پورے مشرق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ سرمست صرف مسلمانوں کے ہیرو نہ تھے سندھ کے ہندو بھی بڑے فخر سے انہیں اپنا روحانی رہنما مانتے تھے"

اسی قسم کی بات بلھے شاہ کی پنجابی شاعری کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے ان کی فاضل شارح لاجونتی راما کرشنا کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندو تصورات کے بیباک نمائندہ ہیں تاہم تصوف کے مورخین اس امر سے آگاہ ہیں کہ اس طرح کی صوفیانہ شاعری مختلف اوقات میں کئی جگہوں پر کی گئی اور یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ اس طرح کی مقبولِ عام شاعری کا مرکزی محور پیغمبرؐ اور شہدائے اسلام ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں وارث شاہ کی ہیر رانجھا کی داستان کو حتمی شکل دی گئی۔ جس کے بعد پنجابی صوفیانہ شاعری اتنی توانا نہ رہی۔ واحد استثناء ملتان کے خواجہ فرید ہیں جنہوں نے سرائیکی میں جدید لوک شاعری کی۔ لیکن سندھی لوک شاعری آج کے دن تک کی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ 1852ء میں اسے عربی حروفِ تہجی مل گئے۔ اور اس کی ادبی نشوونما جاری رہی جبکہ گورمکھی حروف تہجی میں لکھے جانے والے پنجابی سکھوں سے منسوب ہو کر رہ گئی۔ مسلمان اعلیٰ تعلیم زیادہ تر اردو میں حاصل کرنے لگے۔

مقامی زبانوں میں مذہبی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان میں صرف مستانہ وار صوفیانہ نغمات نہیں لکھے گئے۔ بلکہ کچھ شاعروں نے راسخ العقیدگی پر مبنی نظمیں بھی لکھیں جن میں مومن کے فرائض اور معجزات پیغمبرؐ بیان کیے گئے تھے۔ اس شاعری کا اصل مقصد زندیقانہ تصوف کے پرچار کا توڑ کرتا تھا۔ سندھ میں یہ رجحان اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں نقشبندی ردِ عمل کی صورت سامنے آیا۔ ٹھٹھہ کے مخدوم محمد ہاشم اور ان کے دوست نے سقر آن کے آخری حصے کی شرح لکھی جو بالآخر سندھی

کی ابتدائی مطبوعہ کتابوں میں شمار ہوئی۔ یہ 1857ء میں بمبئی سے چھپی۔ اس کتاب سے قرآن کے مکمل یا جزوی ترجموں کی ایک لمبی فہرست کا آغاز ہوا۔ مخدوم محمد ہاشم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز "قط العاشقین" سے کیا تھا۔ یہ منظوم سندھی کتاب شمائل نبیؐ پر ہے۔ انہوں نے اپنی عربی کتاب "فرائض الاسلام" 1292ء میں مذہبی و قانونی سوالوں پر بحث کی ہے وہ اس حد تک سنت کی پیروی کرتے تھے کہ داڑھی تراشنے کی بجائے کاٹتے تھے۔ جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔ جب انہیں کسی فقہی مسئلے پر مخالفت کا سامنا ہوتا تو رسولؐ بذات خود مدمقابل کے خواب میں آتے اور مخدوم کے نقطہ نظر کی حمایت کرتے۔ اپنے دور کے زیرِ اثر انہوں نے یوم عاشورہ پر ماتم اور تمباکو نوشی کی ممانعت پر رسالے لکھے۔ اس کے باوجود وصالِ حقیقی پا جانے والوں میں سے ایک اور بہت اچھے شاعر محمد زمان نے انہیں شجر خشک سے تشبیہ دی۔ عبدالرحیم گروہری نے قرآن کی کچھ سورتوں کی منظوم سندھی تفسیر لکھی۔ انہوں نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں خود خدا کو متکلم کے طور پر دکھایا ہے۔

اسلام کی راہ میں شہادت گروہری کا خواب تھی اس کی خواہش 1778ء میں پوری ہوئی اور وہ شیوا کابت گرانے کے جھگڑے میں 39 سال کی عمر میں مارا گیا۔

پنجاب اور سندھی دونوں کے لوک ادب میں صوفیاء اور اولیاء کی شان میں بہت سی نظمیں لکھی گئیں۔ عبدالقادر جیلانی سے لے کر فرید گنج شکر اور حال ہی میں سندھ کے پیر پگارو تک' ان ممدوحین کی فہرست کافی طویل ہے۔ بے شرع صوفیوں اور باشرع علماء ہر دو نے محبوب پیغمبرؐ کی نعتیں لکھیں۔ شہادت کربلا کا واقعہ بہت سی کتابوں میں لکھا اور بیان کیا گیا۔ پنجابی زبان میں کئی مراثی لکھے گئے۔ عبداللطیف کی رسالو کا ایک باب اس موضوع پر ہے۔ بلوچ اور پٹھان اپنی پہاڑی مجالس میں یہ واقعات کثرت سے اور رنگا رنگ انداز میں دھراتے ہیں۔ پاکستان میں محرم کی تقریبات کے حوالے سے کئی مراکز اپنی خاص شناخت پیدا کر چکے ہیں۔ ملتان' جھنگ اور لاہور ان مراکز میں سے چند ہیں۔ اس شاعری کا ایک فائدہ یہ تھا کہ میدانی علاقوں میں بسنے والے ناخواندہ دیہاتیوں کو اسلام کے چیدہ چیدہ اصولوں کا علم ہو جاتا تھا۔ پہاڑی علاقوں کے بارے میں بھی یہی بات زیادہ وثوق سے کہی جاسکتی ہے۔ پنجاب اور سندھ کی دیہاتی زندگی کی طرح انگریزوں نے 1901ء کی مردم شماری کے بعد بلوچستان کے قبائل کی مذہبیت پر منفی تاثرات کا اظہار کیا۔

بلوچی زبان میں مذہبی ادب بہت کم ہے۔ لیکن پیغمبرؐ اور اولیاء کے قصے پیغمبرؐ کی معراج کا ذکر یا علیؓ کی سخاوت کے واقعات کے بیانیہ سے ایک خلوص اور گرم جوشی جھلکتی ہے۔ انہی سے پتہ چلتا ہے کہ زم زم نامہ جیسی اسلامی کہانیاں بلوچ قبائل اور سندھی صوفیاء کے ہاں بھی معروف تھیں۔

پٹھان بجا طور پر اپنی شاعری کی لمبی روایات پر فخر کر سکتے ہیں۔ مذہبی شاعری کے حوالے سے پشتو کی پہلی نظمیں سندھی اور پنجابی شاعری سے بھی پہلے لکھی گئیں۔ پشتو شاعری کا آغاز پیر روشن اور ان کے راسخ العقیدہ مخالف اخوند رویدہ سے ہوتا ہے۔ پشتو شاعری اپنے مواد میں میدانی ادب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس میں بھی رسولؐ کی نعتیں اور عبدالقادر جیلانیؒ کی مدحت لکھی گئی۔

اٹھارہویں صدی میں پشتو شاعروں نے میلادِ رسولؐ اور معجزوں کے علاوہ جنگ نامے بھی تحریر کیے۔ جن میں کربلا کا واقعہ بھی شامل تھا۔ اکثر اوقات یہ عربی یا فارسی سے ترجمہ ہوتے۔ پشتو شاعری فخر کر سکتی ہے کہ اس میں بصیری (متوفی 1298ء) نے شان رسولؐ میں قصیدے لکھے۔ مشہور قصیدے بردہ کے دو ترجمے شامل ہیں۔ یہ قصیدہ زیرِ سطر اردو یا پنجابی ترجمے کے ساتھ لاہور اور دوسری جگہوں میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔

پشتو میں بلند پایہ صوفیانہ شاعری کی بھی کمی نہیں۔ پیر روشن کے ارشادات کو منظوم شکل میں سب سے پہلے مولا ارانی اور مکلیس نے پیش کیا۔ اس سلسلے کو ان کے ایک جانشین مرزا انصاری نے برقرار رکھا۔ جن کا انتقال شاہجہان یا اورنگ زیب کے عہد میں ہوا۔ ایک سے زیادہ پشتو شاعروں نے سچل اور بلھے شاہ کی سی بے باکی سے وحدت الوجودی وارداتِ وصل کو بیان کیا۔

صوفی پٹھان شاعروں میں سے سب سے اہم بلا شبہ عبدالرحمٰن ہیں جنہیں محبت سے رحمان بابا کہا جاتا ہے۔ آپ چشتی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عہد اورنگ زیب عالمگیر کا ہے۔ لیکن ان کی شاعری زیادہ تر صوفیانہ گائیکوں کے مقابلے میں کم وارفتہ ہے۔ ان کے رویہ میں ابتدائی صوفیوں کی سی گہرائی اور گیرائی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی پر یقین ہے لیکن انہیں احساس ہے کہ ہر فانی چیز اپنے خالق کی حمد و ثناء میں مصروف ہے۔

ان کے ہاں فارسی شاعری میں بکثرت استعمال ہونے والی تشبیہہ "ریگِ رواں"

دنیا کی بے ثباتی اور تلبیس کو بیان کرنے کے لیے اکثر استعمال ہوتی ہے۔ رحمان بابا کو صرف خدا کے حاکم اعلیٰ اور قادرِ مطلق ہونے پر یقین کامل ہے۔

پشتو کے بڑے شاعروں میں سے ایک شیدا ہیں جو جنگ آزادی کے مجاہد اور پر تخیل شاعر خوشحال خاں خٹک کی نسل سے ہیں۔ یہ افغان ریاست رامپور میں سکونت پذیر اور سرہند کے نقشبندیوں کے مرید تھے۔

پشتو کی صوفیانہ شاعری اپنے خصائص میں ہندوستانی کی نسبت فارسی شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ جبکہ برصغیر کے مشرقی ترین کونے یعنی بنگال کے صوفیاء نے مقامی روایات کا اتباع کیا۔ یہ امر بہرحال اپنی جگہ ہے کہ بنگال میں بھی ادب عالیہ اور حتیٰ کہ میلاد نامے بھی عربی اور فارسی میں لکھے جاتے رہے۔ بنگالی میں نعت لکھنے کا رواج تو ابھی حال ہی میں مقبول ہوا ہے۔ 1962ء میں میں نے بنگالی میں نعت لکھنے والے شاعر کے چھوٹے سے بیٹے کو اپنے باپ سے پوچھتے سنا "ابا کیا خدا بنگالی سمجھتا ہے" تاہم مسلم بنگالی ادب میں عام مذہبی داستانیں ایک مدت سے لکھی جارہی ہیں۔ معراج نامے اور کربلا نامے وغیرہ کافی عرصہ پہلے لکھے جانے لگے تھے۔ تاہم صوفیانہ وارداتوں اور احساسات کا اظہار چھوٹے چھوٹے گیتوں میں کیا جاتا ہے جنہیں مارسی فاطیس کہتے ہیں۔ ان گیتوں میں پیش کیے گئے جذبات اور خیالات وادی سندھ کی لوک شاعری سے ملتے جلتے ہیں۔ بنگالی صوفی ہندو روایت کے زیادہ قریب ہیں۔ چنانچہ اکثر اوقات کرشنا کی مرلی اور مولانا روم کی نے اکثر اوقات ایک دوسرے کی جگہ لے لیتی ہیں۔ بال فرقے نے اس اتصال کو عروج پر پہنچا دیا۔ دریاؤں پر زندہ رہنے والی معاشرت میں ناؤ اور کھیویا کے استعارے عین فطری ہیں۔ پیغمبر ﷺ کو اکثر ایسے کھیّویا کے طور پر پیش کرتے ہیں جو بے چین روح کو دوسرے کنارے لگاتا ہے۔ جہاں سندھی اور پنجابی شاعر اپنے دل کے چشمے کا ذکر کرتے ہیں وہاں بنگالی صوفی اپنے دل کی حالت ازل سے موجود پانی کے تلاطم میں بیان کرتے ہیں۔

برصغیر کی مقامی زبانوں میں کی گئی صوفیانہ شاعری کروڑوں ناخواندہ لوگوں کے احساسات کا عمدہ ترین بیان ہے جن کی زندگی کا انحصار پیغمبرؐ کی طرف سے روز حشر میں ان کی شفاعت اور ان پیروں پر ہے جو دونوں جہانوں میں انہیں کامیابی دلوا سکتے ہیں۔ اس شاعری نے لوگوں میں پروردگار کی حکمت پر ایمان بالغیب اور اس کے اظہار کے لئے ہر دور میں

لوگوں کی مدد کی ہے۔ صوفیاء نے انہیں بتایا کہ اگر انہیں منصور حلاج یا تو نواسہ رسول ﷺ کی طرح مشکلات سے بھی گزرنا پڑے تو انہیں رحم خداوندی کا یقین ہونا چاہیے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خدا اپنے محبوب لوگوں کو زیادہ بڑی آزمائشوں سے گزارتا ہے۔

پانچواں باب

ہندوستان۔ اورنگ زیب کے بعد

ہزل گو شاعر جعفر زٹلی سنجیدہ موضوعات پر کم ہی طبع آزمائی کرتا تھا اس نے 1707ء میں عالمگیر کی وفات کے بعد مغل دربار کی منتشر الحالی پر شاعری کی۔

اورنگ زیب نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔ اس دوران مغل شہنشاہیت اپنے عروج پر پہنچ گئی لیکن مختلف نسلوں اور مذہبوں کے پس منظر میں ہونے والی باغیانہ سرگرمیوں نے بادشاہت کو داخلی طور پر تباہ کرنا شروع کر دیا۔ مارچ 1707ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو مغل سلطنت کا سورج اپنے نصف النہار کے بعد روبہ زوال تھا۔ ڈیڑھ صدی کے دوران صرف چار بادشاہ گزرے تھے۔ اس کے بعد ایک کٹھ پتلی کی جگہ دوسری لینے لگی بلآخر اورنگ زیب کا سب سے بڑا زندہ بیٹا معظم جس کی عمر 64 سال تھی اپنے بھائیوں کو مغلوب کر کے بہادر شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اس کے دورِ حکومت میں سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کے قتل سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ کیونکہ اگلے گرو بندہ بیراگی اور اس کے پیروکاروں نے پنجاب میں ناقابلِ یقین مظالم ڈھائے۔ فروری 1712ء میں بہادر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا جہاندار شاہ تخت نشین ہوا۔ عیش و عشرت کا دلدادہ یہ بادشاہ گیارہ ماہ بعد بہادر شاہ کے پوتے فرخ سیر کے ہاتھوں پھانسی پر چڑھا۔ جس کی پشت پناہی سید برادران کر رہے تھے۔

سید عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کا تعلق بارہہ کے ایک شیعہ خاندان سے تھا جو

اکبر کے وقت سے لے کر سیاست میں دخیل تھے۔ اس دور میں حکومت عملی طور ان کے ہاتھ میں رہی ان کے مبنی بر شیعیت احکام کی وجہ سے آگرہ' لاہور اور کچھ دوسرے مقامات پر عوام الناس نے بے چینی کا اظہار کیا۔ انہوں نے 1709ء میں اذان کی شیعہ عبارت رائج کروادی جسے عوامی بے چینی کے باعث واپس لینا پڑا۔ 1719ء میں دربار کے تورانی امراء نے جہاندار شاہ کو معزول کر دیا اور سید برادران بالآخر گرفتار ہو گئے۔ فیروز شاہ تیزی سے آئے اور گزر گئے پھر 1719ء میں محمد شاہ رنگیلا کو تخت پر بٹھایا گیا۔ جس نے 1748ء تک حکومت کی۔ اس کے دورِ حکومت کی طوالت میں اس کی آئینِ جہانداری میں مہارت سے زیادہ رنگین مزاجی اور سیاست میں عدم دلچسپی کا حصہ ہے۔ یقیناً وہ شعر و شاعری کا شائق اور حسن نسواں کا مداح تھا لیکن اپنی سلطنت کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکا۔ 1717ء میں بنگال عملی طور پر خود مختار ہو گیا۔ محمد شاہ کا وزیر اعظم نظام الملک آصف جاہ (جس کا باپ غازی الدین جنگ حیدر آباد پر قبضہ کرنے والی اورنگ زیب کی فوجوں کا مدار المہام تھا) 1724ء میں دکن میں واقع اپنی جاگیر پر چلا گیا اور حیدر آبادی نظاموں کے سلسلہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ 1723ء میں ایرانی نژاد میر محمد امین المعروف سعادت خان جو سید برادران کے زیرِ اثر اودھ کا گورنر بن گیا تھا' خود مختار ہو گیا۔ اس کا بھتیجا صفدر جنگ بعد ازاں مغل حکمران کا وزیر مقرر ہوا۔ صدیوں پرانی تورانی ایرانی کشمکش نظام خاندان کی صفدر جنگ کے ساتھ چپقلش کی صورت جاری رہی اور سلطنت کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ ایک پٹھان قبیلے بنگش کے نوابین اپنے نئے دارالحکومت فرخ آباد میں ایک موثر سیاسی طبقہ بن کر ابھرے۔ رام پور کے شمال میں واقع روہیلکھنڈ کے پہاڑی علاقے میں روہیلہ افغانوں نے اپنی طاقت مجتمع کرنا شروع کر دی اور 1739ء کے بعد دلی میں جاری طاقت کے کھیل میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل ہو گئے۔ 1720ء تک دکن میں مرہٹے واضح طور پر چھا گئے تھے انہوں نے 1737ء میں دلی کی طرف پیش قدمی کی لیکن شہر کا محاصرہ نہ کیا۔ ان کی طاقت میں مسلسل اضافہ ہوا اور یہ 1761ء میں بنگال تک اثر انداز ہونے لگے۔ اٹھارویں صدی کی آخری دھائیوں میں انہوں نے دلی کی سیاست میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

1738-39ء میں ملک پر نادر شاہ کے حملے کی صورت میں ایک غیر متوقع مصیبت نازل ہوئی۔ قندھار' طویل عرصے سے مغلوں اور ایرانیوں کے درمیان فساد کی جڑ تھا' پر قبضے کے بعد نادر شاہ شمال مغربی ہندوستان میں داخل ہوا اور لاہور میں اپنا نمائندہ چھوڑ

کر آگے بڑھا۔ مارچ 1739ء میں اس نے کرنال کے نزدیک بد نظمی کا شکار مغل فوج کو کچل کر رکھ دیا۔ سر کردہ امراء کی باہمی چپقلش کی وجہ سے مغلوں کو ناقابلِ یقین حد تک زیادہ تاوانِ جنگ دینا پڑا۔ اودھ کے سعادت خان نے اس سارے ڈرامے میں المناک کردار ادا کیا۔ شہر پر قبضے کے بعد ایک دن میں تیس ہزار افراد قتل عام میں مارے گئے۔ عظیم الشان مغل شہنشاہیت کی باقیات میں سے صرف دلی کے کھنڈرات بچے تھے۔ تاہم یہ بھی کسی طالع آزما کے لئے پر کشش تھے۔

مغل بادشاہ محمد شاہ اپنے دارالحکومت کی تباہی بھی جھیل گیا۔ لیکن 1748ء کے بعد اس کے جانشینوں کو دوستوں اور دشمنوں کی نئی یلغاروں کا سامنا کرنا پڑا۔ نادر شاہ کے بعد حواریوں کی سازشوں میں آنے والے افغان احمد شاہ درانی ابدالی نے شمال مغربی علاقوں پر اپنے حملوں کا آغاز 1748ء میں کیا جو باقاعدگی اختیار کر گئے۔ کچھ عرصہ اس نے پنجاب کو اپنی مملکت میں شامل کئے رکھا۔ نظام کے نوجوان پوتے غازی الدین امداد الملک نے 'جو دلی کی سیاست میں بہت دخیل تھا' بادشاہ احمد شاہ کو اندھا کروادیا۔ ابھی دلی کے باشندے 1754ء کی جاٹ لوٹ مار سے پوری طرح سنبھلنے نہ پائے تھے کہ 1757ء میں ابدالی کے حملے نے انہیں ایک بار پھر مصائب سے دوچار کر دیا۔ جب ابدالی 1759ء میں ہندوستان پر دوبارہ حملہ آور ہوا تو ایک بادشاہ پہلے ہی سے قتل ہو چکا تھا اور تخت کے لئے کشمکش جاری تھی۔ ابدالی نے زیادہ تر روہیلہ اور ان کے قابل سردار نجیب الدولہ پر انحصار کیا اسے دلی کے مذہبی حلقے کی حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ باوجود ان پڑھ ہونے کے وہ اسلامی علوم کی سرپرستی کرتا تھا۔ ابدالی نے 1761ء میں مرہٹوں کو پانی پت کے نزدیک شکست دی لیکن اس سے مغلوں کی شیرازہ بندی میں کوئی مدد نہ ملی بلکہ گروہی کشمکش جاری رہی۔ دربار میں ایک گروہ نے 1759ء میں عالمگیر ثانی کے بیٹے علی گوہر عالم ثانی کو بطور جائز حکمران منتخب کیا تھا۔ لیکن اس نے پہلے لکھنو اور پھر الہ آباد میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ اس نے اپنے لئے بنگال کے کچھ حصوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن برطانوی دستوں نے 1763ء میں اسے بکسر کے مقام پر شکست دی۔ 1770ء نجیب الدولہ کی وفات کے بعد وہ دلی لوٹا اور بعد ازاں زیادہ تر مرہٹہ سردار سندھیا کے توسل میں زندگی گزاری جسے وارن ہیسٹنگز کی حمائت حاصل تھی۔ برطانوی فوج نے اودھ کے نواب کی مدد سے 1774ء میں روہیلوں کو کچل دیا۔ لیکن نجیب الدولہ کے

پوتے غلام قادر روہیلہ نے ان سے انتقام لیا: **1787**ء میں اس نے شاہ عالم ثانی کو دلی میں اندھا کر دیا یہ بادشاہ جو آفتاب تخلص کرتا تھا اپنی قسمت پر نوحہ کناں ہے۔

صر صر حادثہ برخاست پی خواری ما — داد برباد سر و برگ جهانداری ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودم — بر دور شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد — کہ چشم کہ کند غیر جهانداری ما

اگرچہ نابینائی کسی شخص کو شریعت میں مذکور حکمرانی کی ضروری شرائط کی رو سے حکومت کے لئے نااہل کر دیتی ہے (اسی لئے مسلم ہند میں اندھے کئے جانے کے بہت سے واقعات ملتے ہیں) تاہم شاہ عالم **1806**ء تک برطانوی حفاظت میں مغل سلطنت کے بادشاہ کے طور پر براجمان رہا۔ اس کے دو جانشینوں کی حیثیت کٹھ پتلیوں سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی اثناء میں نوابینِ اودھ ایک شاندار حکومت قائم کر چکے تھے جس میں شیعہ مسلک رائج تھا۔ دلی کی مکمل بربادی کے باعث سر پرستوں سے محروم ہو جانے والے شعراء اور دانشوروں نے لکھنو اور ایسی ہی دوسری جگہوں کا رخ کیا۔ اس "تباہ کن چپقلش اور بے مہار خواہشِ اقتدار" کو سودا جیسے بہت سے شعراء نے پر اثر طریقے سے بیان کیا ہے۔

ایران کا ایک متقی اور عالم شخص علی حزن (متوفی **1766**ء بنارس) ہندوستان میں کسی گوشہ عافیت کی تلاش میں وارد ہوا اور اسے سندھ، پنجاب اور دلی میں نئے نئے حملہ آوروں اور ان کے دستوں سے واسطہ پڑا۔ ان واقعات کا ذکر اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی کتاب "تذکرۃ الاحوال" میں کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دلی پر نادر شاہ کے حملے کے دوران یہاں کے مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں غالباً پہلی اور آخری دفعہ راجپوتی انداز میں جوہر شجاعت دکھانے یعنی اپنا آپ قربان کر دینے کے خیال پر غور کیا۔ لیکن "ان کے رہنماؤں میں سے ایک نے انہیں کربلا کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ جہاں نبیؐ کی آل اولاد نے باوجود عددی کمتری کے آخری دم تک بہادری اور عزم و حوصلے سے جنگ جاری رکھی" اس رہنما کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ اس ہمہ جہت ماہر الہیات کو علامہ اقبال نے پہلا مسلمان قرار دیا جسے "اسلام کی نئی تشریح و توضیح کی ضرورت کا احساس ہوا" اس نے بھی اپنے ایک عربی شعر میں **1739**ء کے سانحہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی جن کا اصل نام قطب الدین احمد ابو الفیاض تھا فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک ایک فقیہہ کے بیٹے تھے۔ 1703ء میں شاہ ولی اللہ کی پیدائش کے موقع پر ان کے باپ نے ہاتف غیبی کی آواز سنی تھی۔

انہوں نے اپنے باپ کے زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کی اور سولہ سال کی عمر مدرسہ رحیمیہ میں ان کے جانشین بن گئے۔ یہ ادارہ اِن کے دادا نے قائم کیا تھا۔ 1730ء میں وہ حج کے لئے مکہ گئے اور دونوں مقدس شہروں میں دو سال تک درسِ حدیث دیتے رہے۔ اِن کے اساتذہ میں کم وبیش وہی علماء شامل تھے جن کا شاگرد مصلح عرب عبدالوہاب تھا۔ ان علماء میں محمد حیات السندھی (متوفی 1750ء) کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اپنے استاد ابوالحسن السندھی کی طرح یہ بھی مدینہ کے قریب ایک مرکز دارالشفا میں درسِ حدیث دیا کرتے تھے۔ آبائی وطن لوٹنے کے بعد شاہ ولی اللہ نے عربی اور فارسی زبانوں میں کئی ایک کتابیں لکھیں۔ جن میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک مذہبی فلسفہ تشکیل دینے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ نے قرار دیا کہ مسلمانانِ ہند روحانی اضمحلال کا شکار ہیں اور انہیں زندگی کے متعلق ایک نئے زاویہ نگاہ کی ضرورت ہے۔ یوں انہوں نے اس مضمحل قوم کے لئے ایک علاج دریافت کرنے کی کوشش کی۔ صوفیاء کے مختلف سلسلوں اور مختلف فقہ کا اتباع کرنے والے گروہوں کے درمیان پائی جانے والی آویزش سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے تطبیق کی راہ اختیار کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مابعد الطبیاتی نظریات کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی کوشش بھی کی۔ وہ خود نقشبندیہ' قادریہ اور چشتیہ میں بیعت تھے۔ چشتیہ سلسلے کی نظامی شاخ کا احیاء انہیں دنوں پیر کلیم اللہ (1650-1729ء) نے کیا تھا۔ خود رسول اللہؐ نے انہیں مطلع کیا تھا کہ کسی ایک راہِ طریقت کو دوسری پر برتری نہیں۔ اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں۔

> "مجھے شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملنے والی نسبت لطیف اور خالص' خواجہ نقشبند سے ملنے والی زیادہ نفوذ پذیر اور غالب اور خواجہ معین الدین سے ملنے والی نسبت محبت کے زیادہ نزدیک ہے اور اثرات اسمائے الٰہی اور طہارت افکار کے حوالے سے زیادہ موزوں ہے" (التفہیمات الالٰہیہ)

فقہی امور پر از سر نو غور کرنے کے لئے شاہ ولی اللہ نے مالک ابن انس (متوفی

1795ء) کی موتہ سے رجوع کیا۔ اسلامی اصولِ قانون کی اس پہلی مکمل کتاب پر انہوں نے عربی اور فارسی میں حواشی بھی لکھے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے بہت سارے مطالعاتی حواصل کو قلم بند کیا تاکہ ثابت کر سکیں کہ مختلف مسالکِ فقہ یا مذاہب اسلام کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی حیثیت تاریخی تشکیلات سے کچھ زیادہ نہیں۔ اسی وجہ سے وہ اجتہاد کو ممکن سمجھتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کا سب سے بڑا حصہ قرآن کا فارسی ترجمہ (فتح الرحمان) ہے۔ ان کا دعویٰ ہے۔ خدا نے خود "اس کے معانی مجھے آسان لفظوں میں سمجھائے"۔ بجا طور پر ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان بجائے شرح اور تفسیر پر انحصار کرنے کے خود اصل متن پر غور کریں تو وہ اسے بہتر طور پر سمجھ کر اس کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں۔ اصولِ تفسیر پر ان کی کتاب کا نام "فوز الکبیر" ہے۔ عربی میں شاہ ولی اللہ کی بڑی تصنیف حجۃ البالغہ (جو آج کل الازہر کے نصاب میں شامل ہے) نادر شاہ کے دلی پر حملے کے بعد منصہ شہود پر آئی۔ خیال رہے کہ حجۃ اللہ کا نام مہدی کو دیا جاتا ہے اور در حقیقت دلی کے باشندے 1739ء میں ایک پیغمبری مصائب کے دور سے گزرے تھے۔

عجب اتفاق ہے کہ دلی کی تباہی کے چند ماہ بعد احمد سرہندی کے گھرانے کے چوتھے قیوم پیر محمد زبیر گزر گئے۔ اس کی کیفیت ان کے سب سے چہیتے اور وفادار مرید نصیر محمد عندلیب نے اپنی یادداشت نالہ عندلیب میں بیان کی۔ اس کام میں جو 1740ء میں مکمل ہوا اور جسے ان کے منجھلے بیٹے خواجہ میر درد نے قلمبند کیا' طریقہ محمدیہ کی بنیادیں رکھی گئیں۔ یہ کتاب اس موضوع کو پر پیچ اور الجھے ہوئے انداز میں تشبیہ واستعارہ کی زبان میں بیان کرتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر نالہ خواں بلبل یعنی مصنف عندلیب سید ہونے کے ناطے رسول اللہؐ سے اپنی نسبت کا انکشاف کرتا ہے۔ وہ خود کو فنافی الرسولؐ قرار دے کر روحانی مدارج میں سے بلند ترین پر متمکن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ انہیں چوتھے قیوم اور سعد اللہ گلشن (متوفی 1728ء) نے نقشبندیہ سلسلہ میں داخل کیا۔ موخر الذکر ایک شاعر اور اردو شاعری کے سرپرست تھے۔

لگ بھگ 1734ء میں پیغمبر اسلام کے نواسے امام حسنؓ نے عالم رویا میں انہیں طریقہ محمدیہؐ میں تعلیم دی۔ یہ سلسلہ اسلام کے بنیادی ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ اسے ان کے

بیٹے میر درد نے آگے بڑھایا۔ شاہ ولی اللہ کے جانشینوں نے اسے ایک اہم سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو ان تبدیلیوں کا ادراک تھا۔ "نالہ عندلیب" کی تکمیل کے فوراً بعد انہوں نے اپنی "حجتہ البالغہ" مکمل کی۔ ان کے افکار اور تعلیمات کا یہ مجموعہ ان کے اقتصادی' مذہبی' انسانی روح کی ترقی اور سیاسی فلسفے کے نظریات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے ملک کی تباہی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل وجوہات بیان کیں۔

(الف) مناسب طور پر کام کئے بغیر تنخواہ لینے والے افراد کی وجہ سے خزانے پر پڑنے والا بوجھ
(ب) بھاری محصولات

وہ اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے اس حد تک چلے گئے کہ
"ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص زمین کاشت کرتا ہے اس کا حق کسی بھی اور شخص کی نسبت زمین پر زیادہ ہے"

یہ نقطہ نظر بعد ازاں ان کے افکار کی اشتراکی تشریح و توضیح کا سبب بنا۔ حجتہ البالغہ کی اصل اہمیت بہت بعد میں سامنے آئی۔ شاہ ولی اللہ کی عملی الہیات کے مرکزی تصورات میں سب سے اہم' مصلح ہے جس کی بنیاد انسانی ترقی اور کائنات کی تخلیقی قوتوں کے باہمی تعلق پر ہے۔ ذرا گہری سطح پر دیکھا جائے تو ان کا نظریہ رسالت خاصا دلچسپ ہے۔ پیغمبر کسی بھی روپ میں نمودار ہو سکتا ہے۔ وہ رسول' خلیفہ' رئیس' عالم' زاہد اور مرشد کی شکل میں اپنا کام کر سکتا ہے۔ صرف محمدؐ کی ذات ایسی ہے جس میں یہ سب پہلو مجتمع ہیں۔

"خدا نے محمدؐ کو ایسی ذہانت سے نوازا تھا کہ صحت مند معاشرے' متمدن اقتصادی اور معاشرتی تعامل کے قیام کے مناسب طریقے وضع کر سکتے تھے"

انہیں سب سے زیادہ اعتراض اولیاء کی تقدیس اور قبر پرستی کے رجحان پر ہے۔

"محمدؐ میں خوب صورت آواز' جسمانی طاقت اور عصمت (یعنی گناہوں سے برأت) جیسی خصوصیات کا امتزاج بھی موجود ہے۔ پھر ان کی ذات اور مقدم فرشتوں کی مجلس یعنی الملاء الاعلیٰ کے درمیان ایک

رابطہ بھی موجود ہے جو ان کے فرائض کے حوالے سے ضروری بھی ہے"

پیغمبرؐ کا کام لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جانا اور ایک افادی معاشرہ کی تشکیل کرنا ہے۔ پیغمبروں (اور ذرا ازیریں درجے پر صوفیاء) کی تعلیمات کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس طرح کے لوگوں میں کام کر رہے ہیں۔ اگر لوگ سخت فطرت کے حامل ہیں تو روحانی رہنما کے قوانین بھی سخت ہوں گے تاکہ لوگوں کے اندر خفتہ صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ صیقل کیا جا سکے۔ کسی پیغمبر کی عظمت کا حقیقی اندازہ اس کی تشکیل کردہ قوم کی عظمت سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اس نظریے کی بازگشت مظہر جانِ جاناں کے شیعوں پر اعتراضات "جن کا غلطی پر ہونا بجائے خود ان کے سینوں کے مقابلے میں اقلیت میں ہونے سے ظاہر ہے" اور اقبال کے چھ لیکچروں میں بھی ملتی ہے۔

ان کی روح گزشتہ نسلوں کی داستانوں اور معاشرے کی مجموعی حالت پر تشویش کی عکاس ہے۔

بعض اوقات شاہ ولی اللہ نفسیاتی دلائل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انہوں نے معراج رسولؐ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"پیغمبر کی انسانی اکملیت محمدؐ کی لطافت جسمانی اور جسمانی اکملیت مجسم ہو کر براق بن گئی"

بعض اوقات وہ حیرت انگیز طور پر معجزات کی تشریح فطرت پسندوں کے انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً معجزہ شق القمر (سورۃ 54/1) پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہ فرض کرنا ضروری نہیں کہ چاند واقعی دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ممکن ہے کہ لوگوں نے جو نظارہ دیکھا چاند گرہن شہابیے کے ٹوٹنے یا فلکی دھوئیں کا ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ رسولِ خدا کی عربی نعتوں میں شق القمر اور دوسرے معجزات ضرور بیان کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اپنا ذکر بڑے بلند پایہ آہنگ لہجے میں کیا ہے۔ جس طرح احمد سرہندی نے قیوم کا تصور پیش کیا تھا جسے شاہ ولی اللہ نے اپنی لامعات میں دمِ کریم یا مہر اسمائے الٰہی قرار دیا۔ اسی طرح خود انہوں نے بھی محسوس کیا کہ خدا نے انہیں نائب رسول بنائے جانے کا سزاوار ٹھہرا لیا ہے۔ حتیٰ کہ فیوض الحرمین میں وہ ایک خواب کے بارے میں

بتاتے ہیں جس کی روح سے وہ قائم الزماں ہیں، یعنی اگر خدا کوئی خیر بھی لانا چاہتا ہے تو اپنا ارادہ میری وساطت سے بروئے کار لائے گا۔ شیعہ اسلام میں قائم الزماں مہدی کا لقب ہے۔ احمد سرہندی کی طرح انہیں بھی اپنے مجدد ہونے کا یقین تھا۔ کیونکہ ہر پیغمبر کو اپنے مذہب کو سرقہ بازوں سے بچانے کے لئے مجدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا کام مذہب کی تخلیص ہے اور جب ان پر دورہ حکمہ کی تکمیل کر دی گئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تجدید بلکہ حقانیہ یعنی حقیقت الہیہ سے آگہی کی خلعت سے سرفراز فرمایا۔

خدا اکثر ان سے مخاطب ہوا، ان کی زبان سے بات کی، انہیں نادر حکمت سے نوازا اور راہِ طریقت میں انہیں مختصر امراء سے مقامِ حقیقت پر پہنچایا۔ پیغمبرؐ خود تیرہ مرتبہ ان کے خواب میں آئے۔ انہیں بشارتیں دیں اور بتایا کہ انہیں اپنے گرد "امتِ مغفور" کا ایک چھوٹا سا گروہ اکٹھا کرنا چاہئے۔ انہوں نے پیغمبرؐ سے عالم خواب میں احادیث بھی سنیں۔ تاہم یہ احادیث صرف اس شخص کے لئے مخصوص ہیں جسے عالم خواب میں سنائی گئیں۔ ان کا باقی ملت سے کوئی تعلق نہیں۔

چنانچہ کوئی تعجب نہیں کہ فنا کی منزل کے گزر جانے کے بعد ولی اللہ سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں بغیر حساب کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ امام حسنؓ نے انہیں رسول اللہ کا قلم، جبکہ امام حسینؓ نے رسول اللہ کا چوغہ عطا کیا۔ چنانچہ "اس دن سے میری شرح صدر ہو گئی" (سورۃ 94/1) تاکہ فقہی مسائل پر کتابیں تصنیف کر سکوں۔ اسی لئے بھوپال کے نواب صدیق خان بیان کرتے ہیں کہ اگر شاہ ولی اللہ اسلام کے زمانہ اولیٰ میں ہوتے تو انہیں امام خیال کیا جاتا اور ان کا درجہ ابو حنیفہؒ یا ابو حامد الغزالیؒ کے ساتھ قابل تقابل ہوتا۔

شاہ ولی اللہ افہام و تفہیم میں جتنی دلچسپی رکھتے تھے اتنا ہی وہ اسلام کے عربی ہونے پر بھی زور دیتے تھے کہ رسول اللہ کی دو بڑی خصوصیات تھیں۔ ایک رسالت اور دوسرے ان کا قریش کو سرفراز کرنا۔ اسی لئے وہ اپنی وصائع میں لکھتے ہیں۔

"ہم اہلِ عرب ہیں جن کے اجداد ہندوستان کی بدیسی سرزمین پر آن بسے اور ہمارا فخر و مباہات عربی النسل ہونا اور عربی زبان ہیں"

اسی لئے وہ اپنی حجت میں لکھتے ہیں کہ اجنبی طور طریقوں کی جگہ عربوں کے رسم و رواج کو اپنانا چاہئے۔ اس لئے کہ عربوں کو باقی تمام مذہبی ملتوں پر برتری دی گئی۔ اسی طرح

کے دعووں کی وجہ سے جنہیں بعد میں بہت سے مسلمان مفکرین نے دھرایا' ہندو ہمیشہ مسلمانوں کو یہ الزام دیتے رہے کہ وہ انہوں نے کبھی بھی خود کو ہندوستان کا حقیقی شہری تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ اسلام کے گہوارے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور بجائے اپنے مقامی وطن کے اپنا تعلق مشرقِ وسطیٰ سے استوار کرتے ہیں۔

اپنے بلند آہنگ دعووں کے باوجود شاہ ولی اللہ نے ہمیشہ اپنے عہد کے صوفیاء پر شدید تنقید کی۔ اپنے عرلی دہلی ہم خیالوں کی طرح انہوں نے بھی ان صوفیاء کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جو غیر قرآنی اصطلاحات میں توحید کے مسئلے پر گفتگو کرتے تھے ان سے پہلے میر درد بھی خدا کو غیر قرآنی ناموں سے پکارنے کے وطیرے پر صوفیاء پر تنقید کر چکے تھے۔ شاہ ولی اللہ تو اس حد تک چلے گئے کہ "صوفیاء کی کتابیں چیدہ لوگوں کے لئے تو مفید ہو سکتی ہیں لیکن عوام الناس کے لئے یہ زہر سے زیادہ خطرناک ہیں"۔ اس بیان کی بازگشت اقبال کے ہاں بھی سنائی دیتی ہے جاہل صوفیاء اور وہ لوگ جنہوں نے تصوف کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے مذہب کے چور اور رہزن ہیں! ان کے ہم وطن میر درد نے انہیں خزید فطرت کا نام دیا ہوتا اور جب شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ان کے زمانے کے شیوخ سے بیعت نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ "معجزہ فروش" ہیں تو قاری کو میر درد کے "دکاندار شیوخ" یاد آجاتے ہیں دلی کے تیسرے صوفی مظہر جانِ جاناں نے اپنے خلیفہ پانی پتی کے سامنے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ مگر شاہ ولی اللہ کی تنقید کا نشانہ صرف نام نہاد صوفی ہی نہیں بنے۔ ان کے نزدیک قواعد زبان خطابت اور فلسفہ جیسے خارجی علوم پڑھنے والے بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ وہ کتوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ دو ہزار سال پرانی ہڈیاں چھوڑتے ہیں جبکہ حقیقی علم صرف کتابِ مقدس کی آیاتِ اور احادیث نبوی پر غور و فکر میں پنہاں ہیں۔ یہاں وہ بیشتر صوفیاء کے ہم خیال نظر آتے ہیں جو فلسفہ دانوں کو مسخرے قرار دیتے ہیں۔ سنائی اور رومی سے اقبال تک سبھی کسی نہ کسی حد تک اسی روایات کا تسلسل ہیں یہ سب خشک فلسفہ محض کے تلخ نقاد ہیں حالانکہ ولی اللہ کی طرح اقبال بھی بلند مرتبہ مذہبی فلسفہ دان تھے۔

شاہ ولی اللہ کی سرگرمیاں صرف تصنیف و تدریس تک محدود نہ تھیں۔ اپنی ایک آتشیں تقریر میں وہ مسلمانوں کے مختلف طبقات سے خطاب کرتے ہوئے ان کے گناہ گنواتے ہیں اخلاص سے عاری مبلغین' مسجدوں کے خادم' خانقاہ نشین' اپنے فرض یعنی اسلام

کے لئے جہاد سے غافل ہیں بادشاہ روپے کے لالچ میں اپنے علاقوں میں چکلے اور جوا خانے کھولنے کی اجازت دینے والے امراء عبادات اور شعائر اسلامی ترک کر کے زرق برق لباس پہننے والے سپاہی اور شاہ مدار اور سالار مسعود کے مزاروں پر حاضری دینے والے' مطربین اور شرابی و زانی کوئی ان کی زد سے نہیں بچتا۔ مزاروں پر زیارت کی غرض سے جانے والوں کے کے متعلق کہتے ہیں "ان کا یہ عمل کس قدر برا ہے"۔

ایک اچھے نقشبندی کی طرح انہوں نے شیعیت پر سخت حملے کئے۔ ان کی کتابوں میں سے ایک احمد سرہندی کے ایک رسالے کی راہِ باطل پر قوم کا ترجمہ و توضیح ہے۔ لیکن ان کا یہ رویہ اہلِ بیت سے عقیدت کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ لیکن عاشورہ کو اس طرح منایا جانا انہیں ایک احمقانہ فعل لگتا ہے کیونکہ "کوئی دن ایسا ہے جب موت کسی معشوق کو عاشق سے جدا نہیں کرتی"

لیکن مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے حوالے سے ان کی تشویش غیر ضروری نہیں تھی۔ کیونکہ شمال مغربی ہندوستان اور خصوصاً دارالحکومت کے باشندے متواتر مصائب اور ابتلا کا مسلسل سامنا کر رہے تھے۔ مسلم اور کافر' ہم مذہب اور غیر ملکی تاجر یکے بعد دیگر ملک میں گھس کر پاؤں جما رہے تھے۔ سب کچھ دیکھا تو سیاست میں دخیل ہوئے اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی حمایت کرنے لگے۔ اگرچہ ان کے سیاسی خطوط اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن بظاہر وہ انگریزوں کی صورت میں موجود خطرے سے آگاہ معلوم نہیں ہوتے۔ پنجاب پر اپنا تسلط جماتے سکھوں اور مرہٹوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کے لئے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے آنے کی دعوت شاہ ولی اللہ کے ذریعے دی گئی۔ انہوں نے افغان حکمران کو بتایا کہ اپنے مذہبوں کو تباہ ہونے سے بچانا اس کا انفرادی مذہبی فریضہ یعنی کہ فرضِ عین ہے۔ انہوں نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ کی فتح میں بھی اہم کردار ادا کیا لیکن انہیں اس افغان دوست کے ہاتھوں بدقسمت دارالحکومت کی لوٹ مار بھی دیکھنا پڑی۔ اس کا حال کلاسیکی اردو کے غزل گو شاعر میر نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔

اس کے ایک سال بعد **1762**ء میں شاہ ولی اللہ کا انتقال ہو گیا۔

وہ اٹھارویں صدی کی صوفیانہ روایات میں پرورش پانے والے مفکرین میں سے ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ وہ کئی حوالوں سے اپنے زمانے سے آگے تھے۔ صوفیانہ قیاس

آرائی، تعقل، پیامبرانہ توانائی اور عقل سلیم جیسی خصوصیات ایک عجب طریقے سے ان کی ذات میں باہم متحد ہو گئی تھی۔ ان کے اثرات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ رفتہ رفتہ ہو رہا ہے۔ انہی کے اثرات کے تحت ان کے خانوادے میں سے قرآن کے مترجمین پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کی اولاد میں سے کچھ نے انیسویں صدی میں چلنے والی سیاسی، مذہبی تحریکوں کے رہنماؤں کی مدد کی۔ شاہ ولی اللہ کے افکار سر سید احمد خان اور اقبال کے ہاں بھی ملتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی دہلی کی روحانی شخصیات کا شاہ ولی اللہ پر اختتام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقشبندی دوست مظہر جانِ جاناں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"طریقہ احمد سرہندی کس قائم، سنت کی راہ پر بلانے والے..... انوار خوبی سے منور جنہوں نے نوع انسان پر برکات کے کئی در کھولے"

مظہر 1699ء میں آگرے میں ایک درباری کے ہاں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں احمد سرہندی کے بیٹے میر معصوم کے مرید ہو گئے اور تیس برس کی عمر میں اس درویش کے گھر کی چوکھٹ پر جھاڑو دینے لگے۔ موسیقی اور سماع کے رجحانات سے تائب ہوئے اور نقشبندی نظریئے کے اصول سے رجوع کیا جو "قرآن و سنت پر مبنی ہے" اور اسی لئے ان دونوں کی طرح قابلِ عمل ہے۔ احادیث نبویؐ ان کے لئے خصوصاً اہم ہیں کیونکہ "اس علم کی برکات سے نور ایمان بڑھتا ہے اور کارِ خیر میں کامیابی اور عمدہ اخلاق کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں"۔ ولی اللہ کی طرح انہوں نے بھی کئی سلسلوں میں بیعت کی۔ (قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ) لیکن بالآخر نقشبندیہ میں شامل ہونے کے بعد "خلاف سنت چلنے کی تاب و توانائی نہ رہی" ان کا بڑا مقصد اپنے بے شمار مریدین کو ذکرِ خفی کے رموز سے آگاہ کرنا تھا۔ بشرطیکہ مریدین صوفیانہ طریقِ محبت اپنا چکے ہوں۔ انہوں نے بذریعہ خطوطِ بھی تعلیم دی جس سے ان کے اچھے استاد لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک کمزور بشر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ایک خوب صورت شاعر تاباں کی طرف صوفیانہ محبت کے رجحان کے بعد انہوں نے ایک ناقابلِ برداشت عورت سے شادی کر لی تاکہ اپنے نفسِ اسفل (نفسِ امارہ) کو تربیت دیں سکیں۔ انہیں امید تھی کہ وہ اس کی سرکشی کے ساتھ گزارہ کرنے کی راہ اختیار کر کے اپنی روح کی تطہیر کر لیں گے۔ تاہم کبھی کبھار ان کے خطوں میں ایک آہ سنائی دیتی ہے۔

دلی کے تین صوفیاء میں سے مظہر کو مابعد الطبیعاتی مسائل میں سب سے کم دلچسپی

تھی۔ انہیں توحید مطلق جیسے سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ قانون الٰہی اس سلسلے میں خاموش ہے' اس لئے وہ قیاس آرائیوں کو غیر ضروری خیال کرتے تھے' ان کا طرزِ زندگی صبر اور مسلسل عبادت کا تھا۔ وہ نماز کی ادائیگی پر خصوصاً زور دیتے تھے جو ان کے خیال میں "دوسری تمام مذہبی سرگرمیوں کے متنوع پہلوؤں پر محیط ہے" اس لئے وہ چوبیس گھنٹے میں ساٹھ رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ جہاں دوسرے اولیاء اپنے سلسلہ تدریس کو کم و بیش اپنے خاندان تک محدود رکھتے تھے مظہر نے بے شمار طالب علموں کو متوجہ کیا اور ان کے خلفاء کی تعداد انچاس سے کم نہیں تھی۔ آپ نے شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور ان کے مشہور ترین خلیفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (جو حدیث میں شاہ ولی کے شاگرد تھے) نے ان کی تصانیف شرحیں اور حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے مرشد کی اتباع میں قرآن کی ایک ضخیم تفسیر 'تفسیرِ مظہری' بھی لکھی۔ حنفی فقہ پر ان کی فارسی کتاب (Ma La Abbud) مالابد ہندوستان میں لمبے عرصے تک استعمال ہوتی رہی ہے۔ شاہ ولی اللہ اور مظہر دونوں کلاسیک عربی کے شوقین تھے۔ مشہور دعا شہدلی کی حزب البحر نے صدیوں بے شمار اولیاء کی حفاظت کی دونوں کو مرغوب تھی۔

ہندوستانی ماحول میں ماہرین الٰہیات کو ہندو رسوم توجیہات سے بھی نمٹنا پڑتا تھا۔ ناصر محمد عندلیب نے ہندو روایات سے کچھ خیالات مستعار لئے۔ خصوصاً وہ ہندوستانی موسیقی کے شوقین تھے۔ انہیں یوگا کے فلسفے پر کافی معلومات تھیں لیکن وہ ہندو معجزات کو جادو قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی مسلمان کی کم ترین کامیابی کسی یوگی کے ششدر کن مظاہرے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے یہاں ان کی سوچ نہایت روایتی ہے جبکہ دوسری طرف مظہر جانِ جاناں کا دعویٰ ہے کہ ہندوؤں کو کثیر خدائی خیال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بنیادی طور پر وہ موحد ہیں تاہم رسول اکرمؐ کے بعثت کے بعد ان کے مذہب کو منسوخ خیال کیا جانا چاہئے۔

مظہر اپنی تصنیف کلمہ طیبہ میں لکھتے ہیں

> "میں ایمان لایا ہوں خدا پر' اس کے رسول پر اور اس پر جو رسول پر نازل ہوا۔ مجھے خدا اور رسول سے محبت ہے اور اِن کے دشمن میرے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ میری نجات کو یہی کافی ہے" (قریشی'

یہ (مظہر) شخص الولائت الکبریٰ کے مقام تک پہنچا۔ زندگی میں اس کا مقصد قانونِ الٰہی
اور صوفیانہ طریقت کی ترویج کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسے معاصر نے سنی تراش کا نام دیا اردو
شاعر میر تقی میر انہیں "ولی' پاکباز' درویش' عالم کامل' شہرتِ بے مثل کا حامل اور معروف و
معزز" قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے بھی دشمن تھے جن کے خلاف یہ بے جگری سے لڑے۔
یہ دشمن شیعہ تھے۔ مظہر اتنے آگے نکل گئے کہ معاویہ کے دفاع میں ایک رسالہ تصنیف کر
ڈالا کیونکہ وہ ان کا حیثیتِ صحابی احترام کرتے تھے۔ شیعہ معاویہ سے شدید ترین نفرت کرتے
ہیں جب انہوں نے جنوری 1781ء میں (جب ان کی عمر 82 سال تھی) محرم کے ایک
تعزیہ کا مضحکہ اڑایا تو ایک جنونی شیعہ نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا اور وہ اپنے قاتل کا نام بتائے
بغیر انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک خاصا مستحکم سلسلہ مظہریہ شمسیہ چھوڑا جو
نقشبندیہ کا ایک ذیلی سلسلہ ہے اس کے علاوہ اردو اور فارسی شاعری میں ایک خاصی بڑی تعداد
ان کے شاگردوں کی بھی تھی حالانکہ میر کے خیال میں شاعری "ان کے بلند مرتبے سے
بہت نیچے کی چیز تھی۔ تاہم وہ اس کار لاحاصل کی طرف متوجہ ہوئے" سودا کے اس طنزیہ
تبصرے سے قطع نظر کہ "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" انہیں باوجود بہت تھوڑے سرمائے
کے اردو شاعری کے چار ستونوں میں سے ایک خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اردو کے عظیم ہجوگو
سودا کا یہ تبصرہ مذہبی منافرت کا نتیجہ ہے سودا راسخ العقیدہ شیعہ تھے اور ان کے کلام میں شہیدِ
کربلا کے اعزاز میں لکھے گئے سو سے زیادہ مرثیے شامل ہیں۔ وہ بعد ازاں اودھ میں آباد ہو گئے
جہاں ایرانی نژاد نواب سعادت کے خاندان نے طاقت پکڑ لی تھی۔

اٹھارویں صدی کے دلی کے تیسرے ممتاز صوفی اور اردو کے ایک اور ستون خواجہ
میر درد تھے۔ ادب میں انہیں یہ درجہ پہلی بار اردو کے جدید لہجہ اردوئے معلی میں صوفیانہ
کلام کہنے پر دیا گیا۔ اس کی پر درد شاعری کے بہت کم قارئین یہ بات جانتے ہیں کہ درد نے
اپنے باپ کی فارسی تعلیمات کے بہت تھوڑے حصے کو شاعری کی شکل میں پیش کیا۔ درد
1721ء میں پیدا ہوئے اور کبھی اپنے مولد سے باہر نہیں گئے۔ ابتدا میں وہ اپنے والد کے
مرید ہوئے اور نہایت ثابت قدمی اور وفاداری سے ان کا اتباع کرتے رہے اس کے بعد خود
انہیں بیعت لینے کی اجازت مل گئی۔ جس کے بعد ان پر روحانی واردات کا نزول ہونے لگا۔ اس

طریقے سے ان پر جن شعروں کا توارد ہوتا ان کی تشریح علم الکتاب 1770ء میں رقم کی۔ ایک سو گیارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب درد کے روحانی دعووں کا حقیقی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اگرچہ نقشبندی ہونے کے ناطے وہ ابن عربی کے وحدت الوجود کو مسترد کرتے تھے لیکن اپنے معاصرین کی طرح اس کی وضع کردہ اصطلاحات استعمال کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ (ان کے ایک شاعر دوست نے فصوص الحکم کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا) درد علم الکتاب کے ہر باب کا آغاز اپنے والد نصیر کی مدح سے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نالہ عندلیب کے اختتام پر ناصر محمد نے عندلیب یعنی اپنے آپ کو مثلِ پیغمبر قرار دیا تھا۔ ان کے بعد درد نے اس شناخت کو اپنا لیا اور اس کے گرد اپنے نظریات کی تعمیر کی۔ انہوں نے روایتی صوفیاء کی طرح سہ پہلو فنا کا نظریہ تشکیل دیا یعنی کہ فنافی الشیخ فنافی الرسول اور فنافی اللہ جس کے بعد سب سے بلند اور آخری یعنی بقاء کا درجہ آتا ہے۔ یہ درجہ ذات خدا میں بقاء کا درجہ ہے جس میں بقافی الرسول اور بقافی الشیخ دونوں شامل ہیں۔ ان کے نزدیک بقافی الشیخ کا مرتبہ باقی دونوں مراتب سے بلند ہے۔ کیونکہ یہ وہ درجہ ہے جس میں طالب کو سہ درجی نور گھیرے رکھتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقام خصوصاً انہیں دیا گیا کیونکہ اس کے والدین میں سے دونوں سید تھے اور ان کے والد نے امتی ہونے کے علاوہ رسول اللہ کی روح سے اتصال حاصل کیا تھا۔ میر درد کے ایسے بلند مقام پر پہنچ جانے کا دعویٰ جو بقول ان کے صرف انہی کے لئے مخصوص تھا اگر وہ دلی کے ہم عصر صوفیاء کی تنقید کا نشانہ بنا تو کچھ ایسی تعجب انگیز بات نہیں۔ کتاب کے فارسی متن میں کہیں کہیں انہوں نے عربی میں اس بھی بلند و بانگ دعویٰ کئے کہ کیسے خدا نے انہیں اس سے بھی بلند درجات عطا کئے اور انہیں ننانوے نام دیئے اور وہ خود کیسے عظیم ترین پیغمبروں کے لئے مخصوص مقامات پر ایک سے دوسرے درجے تک سفر کرتا رہا۔

آج کا قاری قدرے مضطرب ہو گا کہ ایک ہی وقت اور جگہ پر رسولؐ کے اتنے نائبین مختار کیسے موجود تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ درد نے اپنی کتاب میں اپنے ساتھیوں کے نام ظاہر نہیں کئے۔ لیکن وہ سب کے سب اتنے عقلمند ضرور تھے کہ انہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا یہ اور بات ہے کہ اپنے روحانی مقامات کے متعلق ان کے دعاوی جونپور کے

سید محمد جیسے شخص کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند آہنگ ہیں۔ ان کے زمانے کے شمال مغربی ہندوستان میں الہیاتی وارداتیں روز کا معمول تھیں۔

علم الکتاب درد کی واحد کتاب نہیں بلکہ ان کے اردو میں روزنامچے بھی وجود ہیں جس کا آغاز تحریر 1775ء میں ہوا اور ان کی موت کے دن (11 جنوری 1785ء) تک کے حالات ہمیں ان میں ملتے ہیں۔ ان کی آخری دعا محمدؐ کی روشنی کے لئے دعا تھی۔ جسے مسلمان نسل در نسل پڑھتے چلے آرہے ہیں جب میر درد نے اپنے باپ سے کامل مماثلت حاصل کر لی تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ بھی چھیاسٹھ قمری سال کی عمر میں مر جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ چھیاسٹھ کا ہندسہ لفظ اللہ کے اعداد ہیں۔ درد کے روزناچوں میں دہلی کے مصائب کی کوئی جھلک کم ہی ملتی ہے "جہاں جائے دریاؤں کے آنسو بہتے ہیں" اس ہولناک صورتحال کا ان کے نزدیک ایک ہی علاج تھا کہ لوگوں کا طریقہ محمدیہؐ میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔

درد کی ایک خصوصی وجہ شہرت سماع کی وہ محافل ہیں جن کا انعقاد' نقشبندیہ سلسلے کی سخت گیر روایات کے برعکس' وہ اپنے گھر پر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح کی ایک محفل میں شاہ عالم ثانی آفتاب نے بھی شرکت کی۔ کچھ متفرق و منتشر آثار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے صوفی ساتھیوں نے نقشبندیہ روایات انحراف پر برا مانا تو انہوں نے جواباً کہا کہ اگر کچھ موسیقار خود بخود چلے آتے تو میں کیا کروں۔ ان کا چلا آنا بھی خداوند کی مرضی سے ہو گا۔ اپنے اسلامی رجحانات کی شدت کے باوجود بہت سے ہندو دوست بنائے۔ خصوصاً ان کے شاگردوں میں ان کی تعداد کافی زیادہ تھی جو جائے تصوف کے اردو شاعری میں اصلاح لیا کرتے تھے۔ اگرچہ بعد کے تذکرہ نویسوں نے جنگ' بھوک اور وباء کے دنوں میں ان کی صبر و رضا اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا "کہ فرید گنج شکر بھی اپنی انگلیاں عالم حیرت میں گنے کی طرح چبا ڈالتے" لیکن درد ان چند صوفیاء میں سے ایک ہیں جنہوں نے کھل کر اعتراف کی کہ "میں اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت کرتا ہوں"۔

درد کی صوفیانہ اردو شاعری شیریں اور یاس انگیز ہے۔ اس میں کسی منی ایچر کی سی صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث "انسان سویا ہوا ہوتا ہے جب وہ مرتا ہے تو جاگتا ہے" کو انہوں نے اپنے ایک شعر میں یوں باندھا ہے۔

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں کثرتِ مظاہر کے پسِ پردہ موجود وحدت نظر آنے لگی تھی۔

جب کوئی اٹھارہویں صدی کے شمال مغربی ہندوستان میں ہونے والی خوفناک تباہی کے متعلق پڑھتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذمہ دار نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی ہیں تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے اپنی الہامی نظم جاوید نامہ میں ان دونوں کو جنت کے ایک خاص مقام پر متمکن کیوں دکھایا ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ خصوصاً احمد شاہ ابدالی ان کے نزدیک کفار کے خلاف جہاد کی روح کے نمائندے اور جہد مسلسل کی تجسیم ہیں جو اس کے خیال میں تکمیل ذات کی جدوجہد کے تقاضے ہیں۔ ٹیپو سلطان اور ان کا ذکر کرنے سے کچھ دیر پہلے وہ اپنے قاری کو کرہ زحل پر خون کے ایک سمندر پر لے جاتا ہے (لمبے عرصے تک یہ سیارہ بد قسمتی کی علامت رہا ہے اور اسے فارسی کی شاعرانہ زبان میں ہندو افلاک کہا جاتا رہا ہے) یہاں ہم اس کی قوم کے دو غدار بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق اور روحِ ہندوستان کو دیکھتے ہیں جو مسلم تاریخ میں ان کا کردار یاد کر کے ماتم کناں ہیں۔

اٹھارہویں صدی کی تاریخ میں جعفر کا کردار در حقیقت بڑا گھناؤنا تھا۔ بنگال پر حکومت کرنا ہمیشہ سے مشکل رہی تھی یہ صوبہ بار بار دلی کی مرکزی حکومت سے علیحدہ ہو جاتا۔ اکبر کے دور میں یہ مغل شہنشاہیت کا صوبہ بنا۔ سترہویں صدی میں اس پر شاہجہان کا دوسرا بیٹا شاہ شجاع حکومت کر رہا تھا۔ اس شیعہ حکمران نے **1642**ء میں وسیع و عریض حسینی دالان بنوایا۔ اورنگ زیب کی وفات پر علیحدگی کی ایک نئی تحریک چلی۔ مرشد قلی خان' جو برہمن سے مسلمان ہوا تھا بنگال کا صوبیدار تھا۔ اس نے ایک مضبوط انتظامیہ کی تشکیل کی اور باگیرتی دریا کے کنارے مرشد آباد میں اپنی رہائش گاہ تعمیر کروائی۔ کلکتہ جہاں **1688**ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا مستقر تعمیر کر لیا تھا' ایک اہم تجارتی مرکز بن کر ابھرا۔ یہاں بہت سے برطانوی پرچم بردار غیر ملکی بحری جہاز کمپنی کی مراعات سے استفادہ کے لئے آیا کرتے تھے۔ مرشد قلی خاں کے بعد علی وردی خاں حکمران بنا۔ ترک عرب مخلوط نسل سے تعلق رکھنے والا یہ شخص ایک اچھا منتظم تھا۔ اس کے ہندو ساہوکاروں سے مراسم بہت اچھے

تھے۔ اس کے پوتے نواب سراج الدولہ نے بعض انتظامی اقدامات سے اس اہم طبقے کو ناراض کر دیا۔ سراج الدولہ جو ایک متقی مسلمان تھا' نے مرشد آباد میں ایک بہت بڑا امام باڑہ بنوایا جس کی پاکیزگی برقرار رکھنے کے خیال سے ہندوؤں کو تعمیر میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس عمارت کا مرکزی حصہ مدینہ کہلواتا تھا۔ جہاں مکہ سے لائی مقدس مٹی کی چھ فٹ موٹی تہہ بچھائی گئی تھی۔ ابھی تک موجود اس عمارت میں سینکڑوں تعزیے' علم' براق کی شبیہیں اور دوسری اشیاء موجود ہیں۔

سراج الدولہ کے افسروں میں سے ایک میر جعفر ایک مہم جو شخص تھا اور بہت سے دوسروں کی طرح طالع آزمائی کے لئے دربار سے وابستہ ہوا تھا۔ اسے بخشی کے عہدے پر فائز کیا گیا لیکن 1752ء میں ہٹا دیا گیا۔ اگلے ایک سال میں وہ انگریزوں تک رسائی حاصل کر کے لارڈ کلائیو کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ 1757ء کی جنگ پلاسی میں اس نے غداری کرتے ہوئے سرج الدولہ کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا اور یوں ایک لاکھ بیس ہزار بنگالی سپاہی صرف تین ہزار یورپیوں سے شکست کھا گئے۔ اس کے چند دن بعد سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا۔ انگریزوں نے انعام کے طور پر اس کی جگہ جعفر کو نواب بنا دیا۔ میر جعفر کے داماد میر قاسم نے 1760ء میں اس کے خلاف انگریزوں کے ساتھ سازباز کی۔

پلاسی میں انگریزوں کو پہلی فتح ملی۔ اس فتح سے ان کا اثر ورسوخ بہار تک پھیل گیا۔ 1764ء میں ہندوستان کے تین شمالی صوبوں کے محصولات اکٹھا کرنے کا اختیار ان کے پاس تھا۔ اور انہیں قانونی حیثیت حاصل تھی۔ شاہ عالم ثانی' جو بہار میں مفروری کی زندگی گزار رہا تھا' نے کمپنی کو پچیس لاکھ روپیہ سالانہ کے عوضانے میں ان صوبوں سے محصولات اکٹھا کرنے کا مجاز بنا دیا۔ یہ معاہدہ 1765ء میں کلائیو نے الٰہ آباد کے مقام پر کیا اور جب وارن ہیسٹنگز نے عہدہ سنبھالا تو کمپنی کا اثر ورسوخ ہر جگہ مزید مضبوط ہو گیا۔ میر جعفر کا نام جسے پلاسی کے المیے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے' وطن پرست مسلمان کے نزدیک آج بھی ایک لعنت کی حیثیت رکھتا ہے۔

بنگال کی صورتِ حال بالکل دکن جیسی تھی وہاں مرہٹے شیواجی (متوفی 1680ء) کے دنوں سے مسلسل اپنی طاقت میں اضافہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اثر ورسوخ کا دائرہ بنگال کی سرحدوں تک بڑھا لیا تھا اور وہ دکن کے لئے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ نظام الملک آصف

جاہ ایک موثر سیاستدان تھا۔ اس کا تعلق صوفیانہ رجحان کی حامل ایک تورانی خاندان سے تھا۔ اس نے دلی دربار کی بدامنی اور انتشار سے تنگ آکر جنوب میں اپنا تسلط جمانے کا فیصلہ کیا۔ دہلی میں اس کے حامی گروہ اور اودھ کے شیعہ نواب وزیروں کی کشمکش سلطنت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ادھر دکن میں بھی نظام نہ صرف مرہٹوں بلکہ برطانیہ اور فرانس دونوں کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانیہ نے 1611ء سے ماسولی پٹم میں ایک فیکٹری قائم کر رکھی تھی۔ فرانسیسیوں نے پانڈی چری میں اپنا پہلا اڈا 1671ء میں قائم کیا تھا۔ یہ بندرگاہ انہیں 1750ء میں تفویض کی گئی تھی یہ بندرگاہ انہوں نے 1750ء میں حاصل کی تھی۔ 1748ء میں آصف جاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اس کی جگہ لی۔ جسے فرانسیسیوں نے قتل کروادیا اس پر 1750ء میں مرہٹوں نے دکن کی سیاست میں مداخلت کی۔ حیدر آباد کو اپنے کچھ علاقوں سے ان کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔

نظام کے دربار کا مورخ اور وزیر صمصام الدولہ بھی اقتدار کی چپقلش میں شامل تھا۔ اس نے اپنی کتاب "مآثر الامراء" میں ستارہویں اور اٹھارہویں صدی کے دکن کی سیاست کا تذکرہ کیا ہے جو اس وقت کے حالات جاننے میں بہت معاون ہے۔ جب فرانسیسی سپاہیوں نے 1758ء میں اسے قتل کر کے اس کا گھر لوٹا تو اس کے وفادار دوست آزاد بلگرامی نے اس قیمتی تذکرے کے مندرجات بچا لئے اور بعد ازاں اسے مکمل کیا۔ یہ آزاد حسینی الواسطی بلگرامی "خدا اس کے غزالِ مراد اس کے نزدیک تر کردے اور اس پر شجر رحمت کا سایہ کرے" اٹھارہویں صدی کے ممتاز ترین ہندوستانی علماء میں سے ایک تھا۔ وہ 1704ء میں ایک سید عالم فاضل گھرانے میں پیدا ہوئے اور نادر شاہ کے حملے سے ذرا پہلے 1738ء میں حج کے لیے مکہ گئے۔ وہاں محمد حیات السندھی سے درس حدیث لیا جو شاہ ولی اللہ کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ 1740ء میں ہندوستان واپسی پر اورنگ زیب آباد میں مقیم ہو گئے اور تصنیف تالیف کا شغل اختیار کیا۔ انہوں نے نہایت رواں عربی میں رسول اللہ کی شان میں نعتیں لکھیں جس پر انہیں "حسان الہند" کا لقب دیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں احادیث کی تشریح، سوانحی کتب اور فارسی شاعری بھی شامل ہے۔ اس کی دلچسپ ترین تصنیف "سبحۃ المرجان" ہے عربی میں لکھی گئی اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان حدیثِ نبوی کا اصل وطن ہے اور اس دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں کہ ہندی علماء کو اپنے

عربی ورثے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ آزاد نے اسلامی تاریخ میں ہندوستان کے اہم کردار کو قلمبند کرنے کے لئے کافی محنت کی ہے۔ کیا آدمؑ نے اپنی زندگی کے پہلے سراندیب (سیلون) میں نہیں گزارے تھے جو ہندوستان کا ایک حصہ ہے ؟ کتاب میں اہم ہندوستانی مسلمان علماء کے سوانحی خاکے دیئے گئے ہیں اور عربی اور سنسکرت کے فن خطابت اور شاعری کے درمیان تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی ہندوستانیت کرنے کی یہ کوشش ہمیں متاثر کیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کے علاوہ بلگرام کے ایک عالم اور شاہ ولی اللہ کے شاگرد سید مرتضٰی کا ذکر بھی ضروری ہے وہ ہندوستان کے مایوس کن انتشار سے تنگ آ کر ترکِ وطن کر گئے۔ انہوں نے بطور شارح اور ماہر لسانیات عرب دنیا میں شہرت پائی۔ ہندوستان سے باہر ان کا پہلا قیام زلبد میں ہوا۔ اس لئے انہیں سید مرتضٰی الزلبدی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے عربی زبان کی عظیم نعت "تاج العروس" مرتب کی اور غزالی کی "احیائے علوم الدین" کی ایک مفصل شرح بھی لکھی۔

آزاد بلگرامی کا **1784**ء میں انتقال ہوا تو نظام کی حکومت انگریزوں کے ساتھ دوستی کا تعلق مضبوط کر رہی تھی جن کے ساتھ یہ ایک معاہدہ پر **1766**ء میں دستخط کر چکے تھے۔ بعد میں انہوں نے فرانسیسیوں کے ساتھ بھی اپنے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جب **1798**ء کے معاہدے کے تحت حیدر آباد میں ایک انگریزی ریذیڈنٹ کے تقرر کے بعد انہیں یہ کوششیں ترک کرنا پڑیں۔ غدر کے دوران بھی یہ ریاست انگریزوں کی حلیف رہی۔ نظاموں کے اس انگریز نواز رویے نے جنوبی ہندوستانی میں صورتِ حال پیچیدہ کر دی جہاں مسلم بالادستی کے لئے جدوجہد کے ساتھ میسور کے حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کا نام وابستہ ہے۔ حیدر علی ایک طالع آزما سپاہی تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ قریشی کی نسل سے ہے۔ اس کا باپ **1727**ء میں گول کنڈہ میں وارد ہوا اور ایک نویت تاجر کی بیٹی سے شادی کی۔ نویت ان عربوں سے تعلق رکھتے تھے جو پہلے کن کان اور پھر کرناٹک میں آباد ہوئے۔ ان دنوں کرناٹک پر اسی گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ حکومت کر رہے تھے۔ حیدر علی اس فوج میں شامل تھا۔ جس نے حیدر آباد میں جاری تخت نشینی کی جنگ میں مداخلت کی۔ ناصر جنگ کے قتل کے بعد اس کا خزانہ فرانسیسیوں اور ان کے افسر حیدر علی کے ہاتھ لگ گیا۔ آتشی ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت اور فرانسیسی طریقہ جنگ سے واقفیت نے اس

کی مستقبل کی فوجی کامیابیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ میسور کی ریاست اورنگ زیب کی سلطنت کا حصہ تھی لیکن عملی طور پر یہاں دو برہمن بھائیوں کی حکومت تھی۔ یہ ریاست نظام اور مرہٹوں کے درمیان وجہ نزاع بن گئی۔ حیدر علی نے میسور کے حکمرانوں کا ساتھ دیا اور مرہٹوں سے بنگلور اور دوسرے مقامات واگزار کروا لئے۔ 1761ء کے سال جب احمد شاہ نے مرہٹوں کو پانی پت میں شکست دی حیدر علی نے سرنگاپٹم فتح کر لیا۔ حیدر علی کی مالابار پر 1767ء کی یلغار کو نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں نے روکا۔ مالابار کے زمورین جس کے اجداد نے دو صدیاں قبل پرتگیزیوں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا' نے حیدر علی کے دستوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کرتے ہوئے خود کو کالی کٹ میں واقع اپنے گھر میں نذر آتش کر دیا اس دور میں کالی کٹ کپڑے کی برآمد کا اہم پرتگیزی اڈا بن چکا تھا۔ فرانسیسیوں نے حیدر علی کو اسلحہ فراہم کیا۔ لیکن کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ' قادریہ سلسلہ سے تعلق رکھنے والا ایک متقی انسان اور علومِ اسلامی کا فراخ دل سرپرست کی انگریز نواز حکمتِ عملی نے اس کے لئے صورتِ حال کو مشکل بنا دیا۔ مدراس بہر حال 1640ء یعنی سینٹ جارج فورٹ کی تعمیر سے لے کر کمپنی کا اہم مرکز رہا تھا یہاں انگریزوں نے اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کی وفاداریاں حاصل کرنے کے لئے ایک عربی مدرسہ کھولا تھا۔ یہاں انہوں ان ے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا جہاں سے 1785ء میں پہلا ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا۔ مقامی طاقتوں نے 1779ء میں انگریزوں کے خلاف ایک اتحاد بنایا جو زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اس اتحاد کے ٹوٹنے کے جلد بعد 1782ء میں حیدر علی کینسر کے ہاتھوں چل بسا۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود وہ بہت اچھا منتظم تھا۔ اس نے اپنی حکومت سادہ اور عملی خطوط پر استوار کی لیکن وہ اول و آخر ایک جری سپاہی تھا۔

اسی طرح کا اس کا بیٹا ٹیپو سلطان بھی تھا جو 1750ء میں پیدا ہوا اور اس کا نام کاٹ کے ایک بزرگ کے نام پر رکھا گیا۔ اس نے اپنے بچپن میں کچھ تعلیم بھی حاصل کی۔ اس نے تقریباً چھیانوے غزلیں لکھیں جنہیں سکول کے بچوں کو گانا پڑتا تھا۔ ان میں سے ایک میں وہ دعویٰ کرتا ہے۔

"مرہٹہ سلطان کی فوج کو دیکھتے ہیں تو فاختاؤں کی طرح اڑن چھو ہو جاتے ہیں"

آخری مصرعہ امن کے بادشاہ' کے خاص معادیاتی دعویٰ کو بیان کرتا ہے۔

اپنے باپ کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے دکن میں ایک ٹھوس مسلم حکومت کے قیام کی کوشش کی۔ جس میں اسے انگریزوں' مرہٹوں اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ بہت سی لڑائیوں میں ملوث ہونا پڑا۔ بیرونِ ملک سے امداد حاصل کرنے کے لئے بھی اس نے بہت سے خط لکھے لیکن فرانس کے لوئی ہشتم کا ہندوستان کے معاملات میں الجھنے سے گریز قابل فہم ہے۔ اس نے ترکی کے سلطان خلیفہ عبدالمجید اول کے پاس بھی ایک ایلچی بھیجا۔ جس نے اسے ایک آزاد حکمران کے طور پر تسلیم کیا۔ بعد ازاں ٹیپو نے ایک سفارت سلیم سوئم کی طرف بھیجی۔ جو اس انتباہ کے ساتھ لوٹی کہ سلطنت کو فرانسیسیوں پر انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ ٹیپو کو فرانسیسیوں پر انحصار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نپولین نے مسلمانوں سے دشمنی کرتے ہوئے مصر پر چڑھائی کر دی ہے۔ اپنے انگریز دشمن رویے کی وجہ سے ٹیپو سلطان نے فرانسیسی انقلاب کی کامیابیوں کا اعتراف کیا اور **1798**ء میں خود کو "سٹیزن ٹیپو" کہا۔ **1792**ء میں پہلی بار انگریزوں نے دریا کاویری پر واقع اس کے دارالحکومت سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر یہ شہر **1799**ء میں فتح ہو گیا اور ٹیپو لڑتا ہوا اپنے دستوں کے ساتھ شہید ہو گیا۔

ٹیپو سلطان پر لکھنے والوں نے اس کے بارے میں متضاد آراء کا اظہار کیا ہے۔ انگریز اسے ہٹ دھرم قرار دے کر اس کی مزاحمت کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے۔ ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ اپنے باپ کی طرح نفاذ اسلام کے جوش میں اس نے ہندوؤں پر ختنہ بزور نافذ کئے جبکہ مسلمان مصنفین جن کا سربراہ اقبال ہے' اسے شہید سلطان کے طور پر دیکھتے ہیں جو جنوبی ہندوستان کو اسلام کے لئے انگریزوں سے محفوظ رکھنے کی لڑائی تقریباً تنہا لڑا۔ ٹیپو سلطان نے اپنے نظامِ حکومت کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کے لئے بہت سی اصلاحات کی کوششیں کیں وہ چاہتا تھا کہ اس کی فوج اور عوام قرآن و حدیث میں بتائے گئے قوانین پر عمل کریں۔ اس کے نزدیک وہ اور اس کی فوج مسلسل حالت جہاد میں تھے۔ اسی لئے اس کے فوجی ہدایت نامہ کا عنوان "فتح المجاہدین" اور فارسی منظوم "خطبات" کا عنوان "موئید المجاہدین" ہے۔ اس نے صنعت و تجارت کے تنظیم و نو کی طرف بھی توجہ دی۔ بہت سے نئے کارخانے لگوائے اور ریشم کی صنعت کو ترقی دی وہ ان چند ہندوستانی حکمرانوں میں سے تھا جنہیں سمندری فوجی طاقت کا احساس تھا۔

سلطان ٹیپو کے ذہن میں عجیب و غریب خیال آیا کرتے تھے۔ کیلنڈر تبدیل کرنے کا خیال بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس نے جو نیا کیلنڈر مولود محمدی کے عنوان سے رائج کیا ہے اس میں شمار کا آغاز ولادت نبی کی بجائے بعثہ نبوت یعنی 609 سے ہوتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کا ساٹھ سال کے چکر اور مہینے کو ابجد اور کے حساب سے نام دے کر استعمال کیا۔ یہ نام مذہبی معنویت رکھتے ہیں۔ اس کے سکوں کے نام خلفاء (مثلاً آدھی طلائی مہر صدیقی اور چاندی کا سب سے بڑا سکہ حیدری) اور شیعہ ائمہ کے نام پر رکھے گئے۔ اپنی یادداشتوں، جس کا نسخہ اب انڈیا آفس لائبریری میں ہے، میں اس نے "پختہ خط شکستہ" میں اپنے اکتیس خواب تحریر کئے ہیں جو اس نے 1785ء سے 1789ء تک دیکھے۔ یہ خواب زیادہ تر جنگ، فتح اور انگریزوں کے اخراج پر ہیں کچھ خواب مذہبی (جیسے حج) سعدی اور جامی جیسے عظیم اسلامی شعراء سے ملاقات یا صوفیاء (زیادہ تر نقشبندی) سے ملاقات پر ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خواب حضرت خواجہ گیسودراز کے حوالے سے ہے جن سے اس خاندان کی مدت سے ارادت مندی تھی۔

شوال 1218ھ "میں نے دو معمر بزرگ صورت کو آتے دیکھا جو آپس میں بھائی تھے اور ان کے پاس کچھ ساز و سامان بھی تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ حضرت بندہ نواز کے حکم پر آتے ہیں جنہوں نے کچھ تبرکات بھجوائے ہیں پھر انہوں نے مجھے غلاف کعبہ، مدینہ منورہ اور روضہ حضرت بندہ نواز کے ٹکڑے، قرآن کا ایک نسخہ اور کچھ مٹھائی دی۔ میں نے تبرکات لئے اور انہیں اپنے سر تک لے گیا۔ پھر میں نے قرآن کھولا اور دیکھا کہ نہایت خوش خط لکھا گیا ہے۔ قرآن کے ہر صفحہ پر اسکے کاتب کا نام لکھا ہوا ہے۔ کچھ صفحوں پر میں نے حضرت بندہ نواز اور دوسرے خدا رسیدہ بزرگوں کے نام بھی لکھے دیکھے۔ دونوں خدا رسیدہ اشخاص نے مجھے بتایا کہ قرآن کا نسخہ کئی اولیاء اور کاتبوں نے مل کر لکھا ہے اور حضرت بند نواز بھی اسی سے تلاوت کیا کرتے تھے۔ مزید فرمانے لگے کہ حضرت بندہ نواز نے یہ نسخہ آپ کو بھجوا کر بڑی عنائت کی ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ وہ حضرت بندہ نواز کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت بندہ نواز کے مزار پر فاتحہ پڑھنا اور قربانی دینا ان کا معمول ہے۔ پھر میں نے وہ آیات (قرآنی) پڑھیں جو نہایت خوش خط لکھی گئی تھیں تب میں جاگ گیا اسی سہ پہر میں نے حضرت بندہ نواز کے نام کی فاتحہ دلوائی۔

ان خوابوں سے ٹیپو پختہ کا مسلم رویہ جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ خواب میں تین کافر، انگریز، مرہٹہ اور خود اپنے ہم مذہب نظام کو دیکھتا ہے جو کفار کا ساتھ دے کر دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کے خواب پر کوئی تعجب نہیں ہوتا جس میں نبیؐ حضرت علیؓ کے ہاتھ پیغام بھیجتے ہیں کہ وہ اس کے بغیر جنت میں قدم نہیں رکھیں گے۔ اگرچہ اقبال کو ٹیپو کے ان خوابوں کا علم نہ تھا وہ جاوید نامہ میں اس کے قول "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے" کی بنیاد پر ایک عمدہ منظر تخلیق کرتے ہیں۔ 1799ء میں ٹیپو کی وفات پر دکن میں برطانیہ کی برتری قائم ہو گئی۔ مشرق سے وہ دہلی کی طرف بڑھے اور برصغیر میں اسلام کے قدیم مراکز پنجاب اور سندھ میں مداخلت کرنے لگے۔

پنجاب اور سندھ کو دوسرے صوبوں کی نسبت افغان کوہساروں سے ہونے والی یلغار سے زیادہ نقصان ہوا۔ وادی سندھ کے زیریں حصے اور پنجاب کے کافی علاقے پر احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ نے قبضہ کر لیا۔ پنجاب میں برتری کے لئے سکھ اور مرہٹہ بھی امیدوار تھے۔ کچھ جزئیات کی تفصیل اس وقت کی وادی سندھ کے روحانی ماحول کا جائزہ لینے میں معاون ہو سکتی ہیں۔

پرتگیزیوں نے برصغیر کے جن علاقوں کو سب سے پہلے نشانہ بنایا، ان میں سندھ بھی شامل تھا۔ تب یہاں مقامی حکمرانوں اور پھر 1520ء کے بعد ترک ارغونوں کی حکومت رہی۔ پرتگیزوں کے 1555ء کے حملے میں دارالحکومت ٹھٹھہ تقریباً تباہ ہو گیا۔ 1592ء میں خانخاناں عبدالرحیم نے اسے مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن جب ارغونوں کے بعد تارخن آئے تو سندھ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ دہلی کو صرف بوقت ضرورت مطلع کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سندھ انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس کی وجہ ایک مذہبی تحریک تھی جو چھوٹی ہونے کے باوجود صوفی ازم کے ایک خاص رجحان کی عکاس تھی۔ اس کا تعلق شاہ عنائت شہید (1718-1655ء) سے تھا جو "راہِ تصوف کے آہوئے ریگزار، ساقی مئے وحدت اور رہبر اقلیم بے خودی" تھے۔ ان کا تعلق جھوک سے تھا جو کبھی مہدیوں کا مرکز تھا۔ اوچ کے سہروردی سلسلے کے ارکان سے ان کی رشتہ داری تھی۔ انہوں نے صوفیانہ تعلیم دکن میں برہان پور مکتب فکر سے حاصل کی۔ وہ براستہ دہلی ٹھٹھہ واپس آئے انہوں نے اپنے مریدین کو اپنے حضور سجدہ تعظیم کی اجازت دے کر نقشبندیہ والوں کو برواختہ کر دیا۔

انہوں نے جھوک شاہ عنائت میں سکونت اختیار کی جہاں ان کے گرد بہت سے بانٹنے والے جمع ہو گئے جن میں درویشوں کے علاوہ غریب کسان بھی شامل تھے۔ قریبی قصبے بلیری (Bularri) کے سادات نے مریدین اور مزدوروں کے نقصان پر مشتعل ہو کر جھوک عنائت پر 1715ء میں حملہ کر دیا اور شاہ عنائت کے چند مریدان نے "بڑی شان سے جام شہادت نوش کیا"۔ اسے بلری کے سادات نے کچھ زمین عطا کی (یا اس نے بزور بازو لی) جسے اس نے اپنے غریب مریدین میں بانٹ دیا۔ جدید ذہن کے لوگ اس عمل کی وجہ سے شاہ عنائت کو اشتراکی زمینی اصلاحات کا نقیب مانتے ہیں۔ غیر معمولی رویہ کی وجہ سے دہلی میں شاہ عنائت کو غلط رنگ میں پیش کرنا مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ 1717ء میں ایک بھاری فوج نے جھوک کا محاصرہ کر لیا اور یہ کام زیادہ تر کلہوڑوں کے اکسائے جانے پر ہوا۔ یہ قبیلہ' جو عباسیوں کی نسل سے بیان کیا جاتا تھا' شمالی سندھ سے آیا تھا۔ ان کے ایک مورث اعلیٰ آدم کو' جو خود بھی صوفی تھا' ملتان کے گورنر نے اس کے مذہبی خیالات کی وجہ سے 1553ء میں قتل کر دیا تھا۔ محاصرے کے دوران ایک رات ایک درویش لڑکھڑ لیا تو پکارا اللہ۔ اس کا جواب درویشوں نے یوں دیا جیسے مجلس ذکر ہو رہی ہو۔ یوں ان کے ٹھکانوں کا پتہ چل گیا اور فوج نے "انہیں عدم آباد کو روانہ کر دیا۔ مغل گورنر سے بحث مباحثے کے بعد شاہ عنائت کو قتل کر دیا گیا۔ اس مباحثے میں شاہ عنائت نے صوفیانہ روایت کے اپناد فاع دیوان حافظ کے حوالے دے کر کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستانی صوفیاء کے نزدیک قرآن اور مثنوی مولانا روم کے بعد سب سے اہم کتاب دیوان حافظ رہی ہے۔ شاہ عنائت کے مرید میر جان اللہ' جو ایک شاعر اور سہروردی صوفی تھے' نے ان کی شان میں پر شکوہ الفاظ سے مزین ایک قصیدہ لکھا۔ میر جان اللہ کا روہڑی میں مقبرہ نفیس چوب کاری سے سجا ہوا ہے۔ شاہ عنائت کے بعد میں مریدوں میں بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی' شاہ عنائت بطور صوفی مفکر کے زیادہ اہم نہیں لیکن وہ "مذہبی اشتراکیت" کی دلچسپ مثال ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ ان کی جدوجہد سیدوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف تھی جو مذہبی رہنمائی کو رفتہ رفتہ طاقتور جاگیر داری میں بدل رہے تھے۔

کلہوڑوں نے مغلوں کی مزاحمت 1658ء میں شروع کی تھی۔ 1701ء سے ان کا اقتدار سندھ پر قائم ہو گیا تھا۔ انہیں دریائے سندھ کا مغربی کنارہ نادر شاہ کے حوالے کرنا

پڑا۔ بعد ازاں دہلی کے محمد شاہ کو اس علاقے سے احمد شاہ ابدالی کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔
کلہوڑوں کے عہد حکومت میں ہی عبداللطیف بھٹائی جیسے مجذوب اور مخدوم محمد ہاشم جیسے
فرزانہ مبلغ ہر دو کو عظیم الشان کامیابی ملی۔ کلہوڑوں کے علاقے کے ایک اور خاندان داؤد
پوترا کو بھی عباسیوں کی اولاد ہونے کا دعویٰ تھا۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اثر ورسوخ ملتان تک بڑھا
لیا اور ایک ریاست قائم کی جو بعد ازاں ریاست بہاولپور کہلائی اور 1947ء میں پاکستان میں
شامل ہوئی۔

کلہوڑوں نے سیاسی میدان کے ساتھ ساتھ مذہبی قیادت بھی حاصل کرنے کی
کوشش کی۔ بلوچوں کی تالپور برادری جو عام بلوچوں کے برعکس شیعہ تھے' ان کی حلقہ ارادت
میں تھے۔ کلہوڑوں کے آخری کاموں میں سے ایک 1768ء میں حیدر آباد شہر کی تعمیر تھی۔
ایک لمبی جنگ کے بعد ان کے مرید تالپوروں نے 1783ء میں ان کی حکومت ختم کر دی۔
کلہوڑہ شہزادہ سرفراز خاں (متوفی 1775ء) کی وجہ شہرت ایک پر تاثیر نعت رسولؐ ہے۔ جو
اس نے قید میں لکھی۔ تالپوروں کے عہد میں سندھ کے دروازے انگریزوں کے لئے آہستہ
آہستہ کھل گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1843ء میں تالپوروں پر فیصلہ کن فتح حاصل کی اور
سندھ کو مدغم کر لیا۔ "کمپنی نے افغان جنگ میں سندھ کو اپنے محفوظ پشتے کے طور پر استعمال
کیا" (Glacis) تالپور گھرانے کی تین شاخیں بیک وقت حکومت کر رہی تھیں۔ ان میں
سے برطانیہ نواز میر علی مراد اور اس کا خاندان 1947ء تک ایک چھوٹے سے علاقے خیر پور
پر حکومت کرتا رہا۔ سندھ' خصوصاً حیدر آباد کا علاقہ' ان دو خاندانوں کے مزاروں سے بھرا پڑا
ہے۔ ٹائل کا کام تالپوروں کے مقبروں پر زیادہ بہتر ہے۔ کچھ مزاروں پر لگی ریلنگ سنگ مرمر
کی ہے جس پر کوفی خط میں آیات کھدائی سے ابھاری گئی ہیں۔

اس دور کا ایک اہم واقعہ جو دور رس اثرات کا حامل ثابت ہوا آغا خاں کی 1840ء
میں سندھ آمد تھی۔ قاچار حکمران فتح علی شاہ کے مقربین میں سے ایک حسن علی شاہ' جو بادشاہ
کا داماد بھی تھا 1938ء میں ایران سے نکل کر سندھ میں آباد ہو گیا۔ جہاں اس نے برطانوی
کمانڈر سر چارلس نیپئر کو قابل قدر خدمات فراہم کیں پھر وہ بمبئے چلا گیا اور کئی مقدمات کے بعد
سر جوزی آرنلڈ نے فیصلہ ان کے حق میں دے دیا۔ اس فیصلے کی بنیاد پر ان کے جانشینوں کو
برصغیر اور خصوصاً سندھ گجرات میں صدیوں میں آباد خوجہ اسماعیلیوں کی فلاح و بہبود کے

لئے کام کا حق اور ان میں اثر ورسوخ پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ سندھ کے برطانوی ہند میں مدغم ہونے پر 1849ء میں بمبئے ریذیڈنسی کا حصہ بن گیا جلد ہی صوبے میں علمی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ لیکن مختلف سلسلوں کے تحت چلنے والی مذہبی زندگی بیسویں صدی میں بھی بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہی۔ پنجاب میں مسلمانوں کی حالت مختلف تھی۔ مرہٹے لاہور 1758ء میں پہنچے اور انہوں نے پنجاب پر بالادستی کی کوششیں کیں۔ لیکن دوسری طرف کافی سارے علاقے پر پنجابی بولنے والے سکھ قابض ہو گئے۔ اگرچہ احمد شاہ ابدالی 1761ء میں مرہٹوں کو شکست دے چکا تھا۔ لیکن آنے والے سالوں میں بھی یہ سکھوں سے جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ افغان بھی گاہے بگاہے مداخلت کرتے رہے۔ بالآخر 1798ء میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان خاں نے لاہور سکھ سردار رنجیت سنگھ کو دے دیا۔ جس نے بعد ازاں 1802ء میں سکھوں کا مقدس شہر امرتسر بھی فتح کر لیا۔ ایک سال بعد لارڈ لیک کے ہاتھوں مرہٹوں کی شکست سے سکھوں کے لئے اپنی ریاست کی توسیع اور بھی آسان ہو گئی جس میں فرانسیسی جنرل ایلارڈ کے تعاون کا بھی ہاتھ ہے۔ جلد ہی وہ رنجیت سنگھ پنجاب کے بیشتر علاقے پر قابض ہو گیا۔ لیکن وہ اتنا عقلمند ضرور تھا کہ انگریزوں سے نہیں الجھا۔ سکھوں اور برطانیہ کے زیر تسلط علاقوں کو دریائے ستلج جدا کرتا تھا۔ 1839ء میں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد وہی معمول کی لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ اور بالآخر انگریزوں نے 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ اودھ میں واقعات کی ترتیب اور نوعیت قدرے مختلف تھی لیکن نتیجہ وہی' یعنی برطانوی برتری کی صورت نکلا۔ دہلی کے شمال میں یہ صوبہ ایرانیوں اور افغانوں کی دسترس سے بچ نکلنے کے باعث ایک مخصوص تمدن کا گہوارہ بن گیا۔ اودھ میں اسلام کا رنگ خاصا پرانا ہے۔ سالار مسعود کا مقبرہ مذہب اسلام کی کامیابی کی قدیم ترین نشانی ہے۔ قطب الدین ایبک سے محمد تغلق تک یہ سلطنت دہلی کا حصہ تھا۔ چودھویں صدی کے شرقی حکمرانوں نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لودھیوں کے عہد میں دوبارہ دہلی سے وابستہ ہو گیا۔ سوری عبوری عہد میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ جب نیشاپور کا سعادت خاں یہاں نواب وزیر بنا تو اسے مسلم روایت میسر تھی۔ ان روایات کا ایک حصہ عالمی افتخار تھا۔ 1691ء میں اورنگ زیب نے مولانا نظام الدین (متوفی 1748ء) کو فرنگی محل

نامی عمارت عطیہ کے طور پر دی تھی۔ ان کا تعلق ایک معروف علمی خانوادے سے تھا جو ہرات کے عبداللہ انصاری کی اولاد سے ہونے کے دعویدار تھے۔ مولانا نظام الدین نے اس عمارت میں ایک دارالعلوم قائم کیا اور ایک نیا نصاب تعلیم بھی متعارف کروایا جو صدیوں سے جاری وسطی دور کے نصاب کے مقابلے میں لچکدار تھا۔

دہلی کے مدرسوں کے برعکس جو پہلے عبدالحق محدث اور پھر شاہ ولی اللہ کے زیر اثر حدیث کے مخزن بن چکے تھے' فرنگی محل نے اپنا جھکاؤ کلام' فقہ اور فلسفہ جیسے نظری علوم کی طرف رکھا۔ فارسی ذریعہ تعلیم کی وجہ سے ہندوستانی فارسی کلام کا مطالعہ مقبول ہوا۔ جو تقریباً سب کے سب انتہائی دقیق زبان اور پیچیدہ انداز میں شاعری کرتے تھے۔ یہ حقیقت لکھنو کی وجہ شہرت یعنی کہ نہایت نفیس تمدن کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ نوابین اودھ کے عہد میں فرنگی محل بعض اعلیٰ پائے کے عالم نکلے جن میں سے نظام الدین کے صاحبزادے عبدالعلی زیادہ مشہور ہوئے۔ بہت جلد بحر العلوم کے لقب سے مشہور ہونے والے یہ عالم لکھنو میں **1731**ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے مولد وطن سے نکل کر وہ کچھ عرصہ رام پور میں واقع حافظ احمد خاں کے مدرسے میں پڑھاتے رہے اور پھر بالآخر **1789**ء (مبینہ طور پر **600** عالموں کے ہمراہ) مدراس میں آباد ہو گئے۔ کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ' جس کی انگریز نواز سیاست نے ٹیپو سلطان کی سیاست کو متاثر کیا تھا نے انہیں مدرسہ کلاں میں پروفیسر مقرر کر دیا اور ماہانہ **1000** روپے تنخواہ مقرر کی جو اس زمانے میں کثیر دولت تھی۔ علماء کے اس شاہ کا **1810**ء میں مدراس میں انتقال ہوا۔ ان کی ایک وجہ شہرت ان کی تحریر کردہ منطق' فلسفہ اور فقہ کی بے شمار شرحیں اور حواشی ہیں۔ دوسری وجہ شہرت صوفیانہ تحریریں ہیں جن میں سے شرح مثنوی مولانا روم نہایت ممتاز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ میں ہر چیز کی شرح ابن عربی کی روشنی میں کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں انہیں عربی کی فصوص اور فتوح پر مکمل اعتماد ہے۔ لکھنے والوں میں سے اپنی طرز کے وہ آخری مصنف تھے۔

بحر العلوم نے لکھنو بڑھتے ہوئے شیعہ سنی تناؤ کے باعث چھوڑا۔ کیونکہ نوابوں کا اثر و رسوخ بڑھنے سے شیعہ اودھ کا غالب طبقہ بن چکے تھے۔ بعد ازاں امجد علی (متوفی **1847**ء) نے پورے صوبے میں شیعہ فقہ کے نفاذ کی غرض سے ایک شیعہ مفتی کا تقرر

کیا۔ معاملہ اگر دو سنیوں یا ایک ہندو اور ایک سنی کے درمیان ہوتا تو فیصلہ شیعہ فقہ کے مطابق نہیں کیا جاتا تھا۔

سعادت خاں نے اپنے صوبے کا بہت اچھا انتظام کیا اس نے لکھنو کی تزئین میں کئی اہم عمارتیں بنوا کر حصہ لیا۔ ان میں مچھلی بھون بھی شامل تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اس پر مچھلی کا نشان تھا۔ جو بعد میں جلد ہی 'ریاست کا سرکاری نشان بن گیا۔ نادر شاہ کے حملے کے دوران نواب کا رویہ مسلمانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس نے نادر شاہ کے لالچ کو ابھارا اور یوں وہ انجانے میں دہلی کی تباہی میں حصہ دار بن گیا اس کی موت اچانک اور پر اسرار حالات میں ہوئی۔ اس کے بھانجے صفدر جنگ نے دہلی کے دربار میں بطور وزیر ملازمت جاری رکھی۔ اس کا بیٹا اور وارث شجاع الدولہ 1765ء میں فیض آباد چلا گیا۔ اس کا نام روہیلہ جنگ سے وابستہ ملتا ہے۔

1740ء کے لگ بھگ پٹھانوں کے ایک قبیلے روہیلہ نے رام پور کے شمال میں روہیلکھنڈ کے علاقے میں پٹھانوں کی مخصوص فوجی مہارت سے اپنی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ صفدر جنگ نے انہیں ممکنہ خطرہ خیال کرتے ہوئے ان کے خلاف مرہٹوں سے مدد طلب کی۔ لیکن کچھ شرفاء جن کی سربراہی شاہ ولی اللہ کر رہے تھے 'کو روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی صورت میں ایسا شخص نظر آرہا تھا جس پر مرہٹوں سکھوں اور دوسرے گروہوں کے خلاف بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نے احمد شاہ ابدالی سے تعاون بھی کیا۔ اس کی 1770ء میں وفات کے بعد ہی شاہ عالم ثانی کو الہ آباد میں جلاوطنی ختم کر کے واپس دہلی آنے کا حوصلہ ہوا۔ نوابین اودھ کی روہیلوں سے طویل مخاصمت (جو شیعہ سنی مخالفت کا بھی ایک اظہار تھی) اور مرہٹوں کے روہیلکھنڈ پر دعویٰ کا نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلا جس میں انگریزوں نے نوابین کا ساتھ دیا۔

1774ء میں روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں 'جس کی شرافت مشہور تھی' جنگ میں مارا گیا۔ یہ متقی شخص شریعت کا پابند تھا۔ رمضان میں اعتکاف کا اور محرم میں شربت اور کھانے کی تقسیم کا اہتمام کرتا اسی مہینے میں وہ کچھ سادات کو مدعو کرتا اور خود ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ اسی طرح ربیع الاول کے پہلے بارہ دن بھی نبیؐ کے وصال کی یاد میں کھانا تقسیم کرتا۔ حافظ رحمت نے اپنے گرد بہت سے عالم اور شاعر اکٹھے کر لئے تھے جن میں بحر العلوم

بھی شامل تھے۔ اس کی وفات کے بعد نادر فارسی اور پشتو نسخوں پر مشتمل اسکی لائبریری لکھنو لائی گئی۔ اس کی اولاد میں بیشتر نے خود کو اردو اور پشتو شاعری سے وابستہ کر لیا۔ اس کے افراد خانہ میں سے ایک کو رام پور بطور تعلقہ ملا جو علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصب میں نوابین رام پور شیعہ ہو گئے۔

شجاع الدولہ نے غیر ملکیوں پر اپنی ریاست کے دروازے کھول دیئے۔ اس نے فرانسیسی فوجی ملازم رکھے فرانسیسی مصور ٹلی کیٹل 1772ء میں فیض آباد پہنچا۔ اس نے نواب اور یورپین کالونی کے کچھ باشندوں کی قابلِ قدر تصاویر بنائیں۔ بیوائیں یعنی بیگمات اودھ' جنھوں نے ایک بڑا امام باڑہ تعمیر کروایا تھا' قانونی مقدمات میں الجھ گئیں جن میں برطانیہ نے مداخلت کی۔ شجاع الدولہ کا بیٹا آصف الدولہ (1797-1775ء) بالآخر اپنا دارالحکومت تیزی سے بڑھتے ہوئے شہر فیض آباد سے دوبارہ لکھنو لے گیا۔

آصف الدولہ نے عظیم معمار اور شاعروں اور مصوروں کے سرپرست کے طور پر شہرت پائی۔ کیونکہ وہ لکھنو کو حیدر آباد سے زیادہ پرشکوہ بنانا چاہتا تھا۔ تعمیر میں اس کا بڑا کارنامہ ایک عظیم امام باڑہ ہے جو اس نے 1784ء میں بنوایا۔ اس کی تعمیر کا ایک مقصد ان غربت زدہ لوگوں کو کام فراہم کرنا بھی تھا جنہیں ایک طویل عرصے کی قحط سالی کے باعث بے روزگاری کا سامنا تھا' پینسٹھ میٹر لمبی اور اٹھارہ میٹر چوڑی اس عمارت کے چاروں طرف رہائشی کمرے اور برآمدے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں محرم کی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہاں سونے' چاندی اور بلور کے بنے ہوئے سینکڑوں بڑے چھوٹے تعزیے جمع ہو گئے تھے۔ یہاں اس ہلال مقدس کی تعریف میں بھی کلام پڑھے جاتے تھے جسے زیارات کی سعادت حاصل کرنے والوں میں سے کوئی کربلا کی مقدس مٹی سے کھود لایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آصف الدولہ نے صرف ایک محرم پر چھ لاکھ روپیہ خرچ کر دیا۔ اس کے جانشین اس داد و دہش میں آگے نہ نکلے تو اسے جاری بہر حال رکھا۔ اب کے لیے ایک طرف محرم اور دوسری طرف عیش و عشرت عطر حیات تھا۔

> "احمقوں کی جنت لکھنو اور بنگال پکے ہوئے آم کی طرح درخت سے ٹپک پڑنے کو تیار تھا۔ بے تاب اور بھوکے برطانوی ہاتھ پھیلائے منتظر تھے"

انہوں نے 1773ء سے لکھنو میں اپنا ایک ریذیڈنٹ مستقلاً تعینات کر دیا تھا اور ابتری کا شکار مالی حالات سے فائدہ اٹھاتے رہے 1861ء میں نواب سعادت علی خاں اپنے نصف علاقے سے انگریزوں کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ انگریزوں نے عملی معاملات میں نواب کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے بالآخر اپناد خل مستقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے (1819ء) میں سعادت علی کے بیٹے غازی الدین حیدر کو اودھ کا بادشاہ بنادیا۔ اس طرح وہ دہلی میں مغل شہنشاہ کے "کھوکھلے پن" کا تدارک کرنا چاہ رہے تھے۔

غازی الدین حیدر باہمت حکمران تھا۔ اس نے لکھنو میں ایک اور امام باڑہ بنوایا۔ خوش قسمتی سے اسے ایک نقش پائے رسولؐ مل گیا۔ جس کے لئے اس نے ایک علیحدہ عمارت بنوائی۔ اس نے بارہ آئمہ کی شان میں منظوم مدحتیں لکھیں جن کے بارے میں اودھ کی لائبریری کی فہرست مرتب کرنے کا ذمہ آسٹرین ایلائز سپرینگر طنزیہ لکھتا ہے کہ یہ شاعری "اتنی بری ہے کہ واقعی کسی بادشاہ ہی کی ہو سکتی ہے" غازی الدین حیدر ہی نے ہندوستان کا پہلا عربی چھاپہ خانہ قائم کیا اس میں سب سے پہلے نہایت خوب صورت ٹائپو گرافی میں عربی اور فارسی کی کتب چھاپی گئیں۔ یہاں پہلی کتاب "مناقب الحیدریہ" چھاپی گئی۔ عربی تصنیف کے انداز میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا انتساب مصنف احمد ابن محمد اسیمنی نے بادشاہ کے نام کیا۔ اس کتاب میں مصنف محرم کے جلوس کا آنکھوں دیکھا حال نہایت شگفتہ انداز میں بیان کرتا ہے جس میں باشادہ کا ہاتھی بھی شریک تھا۔ یہ تقریبات جن کا نہایت مفصل اور دلچسپ ذکر بیگم میر حسن علی نے اپنی قابلِ قدر یادداشتوں میں لکھا ہے۔ دس محرم کو ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن بسااوقات یہ دس صفر تک چلتی تھیں تاکہ سوگ کو چالیس دن تک سرکاری طور پر سنایا جاسکے۔ لوگ سال بھر مجالس میں اکٹھے ہوتے اور شہادتِ کربلا کے تذکرے اور مرثیے اور نوحے سنتے۔ جنہیں بعض اوقات حقیقی ڈرامے کی شکل دی گئی ہوتی۔ ان کا تقابل ایران کے تعزیہ ڈراموں سے کیا جاسکتا تھا۔ لکھنو کے بعض شیعہ ربیع الثانی میں حضرت عائشہؓ اور حضرت عمرؓ کے خلاف صحبت منعقد کرتے۔ جنہوں نے حضرت علیؓ کو پہلا خلیفہ بننے سے روک کر ان کی حق تلفی کی تھی۔ ان دونوں کی کاغذ کی بنی ہوئی شبیہیں بھی جلائی جاتیں لیکن ثقہ حضرات ایسی رسوم کی مناہی کرتے تھے کہ ان سے فساد کا اندیشہ ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ کے دشمنوں کی مذمت میں ہجوگوئی طنزیہ شاعری اور حتیٰ کہ نثر بھی لکھی

گئی۔ ان اوصاف کے پیرائیں لطیف کی وجہ سے اردو تحریر میں ایک قسم کا نکھار آیا۔ سنی اور شیعہ علماء میں عالمانہ اختلاف کی وجہ سے اپنے اپنے نقطہ نظر کو بیان کرنے کے سلسلے میں بے شمار کتابیں اور رسالے تصنیف کئے گئے۔ اس سلسلے میں مولانا حیدر علی فیض آبادی کی کتاب "منتہا القرآن" شیعہ اصول کا بہترین مفصل بیان خیال کی جاتی ہے۔

اہلِ بیت سے شدید ترین محبت کا سب سے عجیب اظہار نسوانی حکمران نصیر الدین کے عہد میں ملتا ہے۔

بلاشبہ مذہبی عقیدت کے اظہار کا یہ طریقہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہمیں اسی سے سنی علماء کے شیعہ مخالف رویہ کی وجہ سمجھ آتی ہے۔ برطانوی اس موقع سے فائدے اٹھا کر اپنے مفادات کو آگے بڑھا رہے تھے۔ خیالی بچوں کو جنم دینے میں مصروف بادشاہ سیاسی مسائل کی کس طرح پرواہ کر سکتا ہے۔ بد قسمتی سے نصیر الدین اور اس کے جانشینوں کو آصف الدولہ کے اکٹھے کئے ہوئے خزانوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ یہ لائبریری جو کبھی حیرت انگیز شان و شوکت کی مالک تھی جس ابتری کا شکار ہوئی اسے اٹھارہ سو پچاس میں فہرست مرتب کرتے ہوئے سپرنگر (Springer) نے بیان کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنو کے آخری بادشاہ تمدنی سرگرمیوں سے کس قدر افسوس ناک حد تک غفلت برت رہے تھے۔ طرب و نشاط کے شیدا آخری بادشاہ واجد شاہ نے اپنے جذبات کو عشقیہ شاعری اور مذہبی نظموں کی شکل دی۔

لکھنو کی مذہبی زندگی کا ایک پہلو ہندوستانی مسلمانوں کے تمدن کے لئے اہم ثابت ہوا۔ یہ پہلو مرثیے کی تشکیل ہے یعنی ذکرِ غم حسینؓ یا نوحہ۔ اردو مرثیہ دکن میں ایجاد ہوا۔ اٹھارویں صدی کی دلی کے نامور طنز نگار اور ہجو گو شاعر سودا نے شہید کربلا کے سو سے زیادہ مرثیے لکھے۔

سودا بعد ازاں لکھنو میں آباد ہو گئے۔ یہ فن مرثیہ گوئی انیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں پروان چڑھا اور انیس اور دبیر کے کلام میں اپنے بلوغت کو پہنچا جو ساٹھ سال تک اس صنف کے غیر متنازعہ استاد رہے۔ ان دو میں سے دبیر بادشاہ عالم فاضل تھے۔ اس متقی اور خدا رسیدہ شاعر نے اپنے مرثیے بلند پایہ خطابت سے تراشے خیالی پیکروں اور جزئیات پر مبنی تفصیلات سے سجائے۔ انیس نے مرثیہ پڑھنے کا ایک منفرد مترنم انداز وضع کیا۔ ان کے

مرثیے دبیر کی نسبت زیادہ مترنم اور سبک ہیں۔

سودا کے بعد مرثیہ زیادہ تر چھ مصرعوں کے قطعے کی صورت لکھا گیا۔ جس میں اندازبیان تقریباً نیم ڈرامائی شکل اختیار کر گیا جس میں جذباتی اور مذہبی مشمولات کی بھرمار ہوئی تھی۔ کچھ دہائیوں کے بعد تعلیمی نظمیں لکھنے والے مسلمان شاعروں کا اس صنف سے رجوع کرنا عین فطری تھا کیونکہ اس کا رفع روایتی تعلق تھا۔ مرثیہ گو شعراء پر الزام لگانا جیسا کہ سالوں میں ہوا تھا کہ انہوں نے ساتویں صدی کے عرب کو انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمان کی زندگی کی تشبیہوں میں بیان کیا ہے۔ اتنا ہی غیر منصفانہ ہے جتنا کسی فلیمش (ہالینڈ کے زیریں علاقے کے لوگ) مصور کی ولادت مسیح میں برف زار کے پس منظر پر۔ عظیم مرثیہ گو سامعین اور مصائب اور آزمائش میں مبتلا ہیروں کے مابین ایک حقیقی تعلق پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ غیر ملکی حکومت کی اذیت میں مبتلا لوگ جہاں اہلِ بیت کے مصائب یاد کر کے دلاسہ محسوس کرتے تھے۔ وہاں ایک قدیم شیعہ مقولے کے مطابق 'غم حسین میں آنسو بہا کر جنت میں جگہ بھی بنا لیتے تھے۔ اس دور میں مرثیے نے دو اہم معاشرتی اور سیاسی ضرورتیں پوری کیں۔ یزید کی ظالم فوج کا تقابل خواہ لاشعوری طور پر سہی ان کافروں سے کیا جا سکتا تھا جو امت محمدیہ پر حکومت کر رہے تھے۔

ہندوستان میں 1757ء کے بعد ہونے والی تبدیلیوں کو ملک میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی موجودگی کے رد عمل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ موجودگی قانونی میدان میں زیادہ واضح تھی۔ کیونکہ انہوں نے اسلامی ہندوستان میں ہمیشہ سے رائج شرعی قوانین میں برطانوی ضابطہ فوجداری کی صورت مداخلت شروع کر دی تھی۔ کمپنی نے کلکتہ کو اپنا انتظامی مرکز بنایا۔ 1781ء میں وارن ہیسٹنگز نے "کلکتہ مدرسہ" ایک نئے تعلیمی ادارے کے طور پر قائم کیا۔ تین سال بعد بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی جس میں چھ ہزار سے زیادہ عربی اور فارسی مخطوطے ہیں۔ فورٹ ولیم (تعمیر 1696ء) میں سر ولیم جونز (Sir William Jones) جیسے علماء اور ان کے ساتھی مشرقی ادب کے خزانوں میں منہمک ہو گئے۔

انہوں نے فارسی اور سنسکرت کے ادب پارے انگریزی میں منتقل کیے اور یوں اہل مغرب کو مشرق کے عظیم ورثے سے روشناس کروایا۔ لیکن ہندوؤں کی تاریخ پر جونز کے طرز

کار نے مسلمانان ہند کی تاریخ پر دور رس اثرات مرتب کیے۔اس کے کام کے مضمرات میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہندو تہذیب کے زوال کو مسلمانوں کی فتح کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے اور یوں کہ ہندوستانی تہذیب میں مسلمانوں کے منفی کردار کی غلط فہمی پر مبنی تصور کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ دوسرے لوگوں نے اس فورٹ ولیم میں سادہ اور رواں اردو وضع کی۔ جو درباری شاعروں کی مقدس اور بھاری بھر کم زبان کے مقابلے میں 'انگریز انتظامیہ کے لئے زیادہ مفید ہو سکتی تھی۔ کچھ مسلمان مصنفین نے بھی ''حقیقتہائے ہندوستان'' (شفیق اونگ آبادی) تصنیف کر کے آقاؤں کے مذموم مقاصد کی تکمیل میں تعاون کیا۔ پہلی نسلوں میں کمپنی کے بہترین ارکان ہندوستانی اشیاء میں حقیقی دلچسپی رکھتے تھے جو انگریزوں کی لکھی تاریخ ہند کی کتب سے بھی منعکس ہوتی ہے۔ لیکن بعد ازاں یہ صورت حال ہندوستان کے لئے بد تر ہوتی گئی کیونکہ اسے ''افادی طور مسیحی مذہبی آنکھوں سے'' دیکھا جانے لگا۔ ان دونوں کا مقصد افسوسناک حد تک کم ترقی یافتہ دیسی لوگوں کی زندگی میں انقلابی تبدیلی لاتا تھا۔ جن کے قدرے بہتر ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا یعنی عیسائی تعلیم سے فیض یابی۔ برطانوی انتظامیہ نے مسلمانوں کی معاشرتی صورت حال کو خاص طور پر متاثر کیا۔ 1793ء میں دوامی بندوبست کے نام سے بنگال کے کسانوں اور زمینداروں پر مسلط ہو گئے۔ مالگزاری نظام نے ''مسلمانوں کاشتکار کو خانہ زاد غلام بنا دیا'' عملی اہمیت کے اقدامات سامنے آنے لگے۔ 1835ء میں میکالے کی تعلیمی اصلاحات میں فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ روایتی اسلامی تمدن کے نمائندوں کو اس کے بعد اگلا دھچکہ وقفہ املاک کی منسوخی سے لگا۔ اس سے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور بھی دگرگوں ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے سکول' مدرسے اور خانقاہوں کا پورا نظام اپنی وسیع مذہبی سرگرمیوں کے اخراجات کے لئے کارِ خیر کے ان اداروں پر انحصار کرتا تھا۔ ڈبلیو' ڈبلیو' ہنٹر جو یقیناً مسلمانوں کا کچھ زیادہ خیر خواہ نہ تھا' کمپنی کی نئی مالیاتی حکمت عملی سے پیدا ہونے والی صورت حال کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو'
> جس کا انحصار ان عطیات پر تھا' کاری ضرب لگی''

مسلمان اشرافیہ کی بہت سی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور پھر مسلمان اتنے متفکر اور

مغرور تھے کہ دلیسیوں کے مخصوص ملازمتیں کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور چونکہ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے ان کے پاس ملازمت کے مقرر کردہ معیار حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہ بچا تھا۔ اس مختلف معاشرتی نظام نے کاشتکاروں کو تباہ کر دیا۔ اس سے پہلے کاشتکار اور مہاجن کے درمیان تعلقات کی بنیاد باہمی تعلق اور مفاد پر تھی۔ برطانوی انتظامیہ نے یہ صورتِ حال تلپٹ کر کے رکھ دی۔ اب مہاجن کے پاس اپنے مقروض پر مکمل حاوی ہونے کے لئے نالش کا راستہ کھلا تھا۔ ایک جدید سندھی مصنف تو یہاں تک لکھتا ہے کہ "ہندو مہاجنوں کے بہی کھاتوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں ایک آزاد ریاست کی ضرورت کے احساس کو جنم دیا جہاں وہ ہندو ساہوکاروں کے رحم و کرم پر نہ ہوں" کچھ علاقوں میں ریلوے لائن کی تعمیر نے ویسی ہی معاشرتی تبدیلیاں کیں جیسی کچھ دہائیوں بعد بیراجوں کی تعمیر لانے والی تھی۔ کاریگروں کی زیادہ تر تباہی کی ذمہ داری برطانیہ کی درآمدی حکمتِ عملی پر عائد ہوتی ہے۔ انگلینڈ میں مشینی کھڈی کے متعارف ہونے سے برصغیر کی کپڑے کی مشہور صنعت تباہ ہو گئی۔ مذہبی علماء نے شہری سکولوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر بے چینی کا اظہار کیا۔ یہ سکول کمپنی نے ہندوستانیوں کے اخلاق سنوارنے کے لئے قائم کئے تھے۔ کمپنی کے اس طرزِ عمل سے پیدا ہونے والے اندیشے کلکتے میں ایک بشپ کے تقرر سے پختہ ہو گئے۔

چونکہ مسلمانوں کا ایک اہم طبقہ نئی حکومت میں مشکلات کا شکار تھا اس لئے انہیں "کافر" حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا آسان تھا اسی وجہ سے برصغیر میں مختلف مذہبی سیاسی تحریکیں تقریباً بیک وقت پھوٹ پڑیں۔ ایک تحریک کا آغاز بنگال میں حاجی شریعت اللہ (1781ء۔1840ء) نے کیا۔ حاجی شریعت اللہ 1799ء میں حج پر گئے اور مکہ میں کوئی بیس سال گزارنے کے بعد 1818ء میں بنگال لوٹے۔ ان کی تحریک کو فرائضی کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں پر فرائض کی ادائیگی کے لئے خصوصی زور دیتے تھے۔ نقشبندی مصلح، قرب الفرائض یعنی فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کو اصل شرعی راستہ خیال کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ شریعت اللہ کا عرب میں وہابی تحریک کے ارکان سے بھی تعلق رہا ہو۔ اپنے پہلے کے شاہ ولی اللہ اور بعد میں اقبال کی طرح، اگرچہ کم عالمانہ سطح پر، شریعت اللہ نے بھی خالص عربی اسلام اور مخلوط ہندوستانی اسلام کے درمیان فرق کو اجاگر

کیا۔ ان کی جنگ زیادہ تر ہندو رواج سے متاثرہ رسوم کے خلاف تھی اور "جب انہوں نے بنگال میں پاؤں رکھا تو سارا شرک اور بدعت سرنگوں ہو گیا"

بنگال کی مٹی اس حوالے سے خصوصاً زرخیز تھی کیونکہ بنگالی اسلامی کی خصوصیات میں مقامی پیروں' فقیروں اور عقائد سے محبت اور مختلف مذاہب کی روایات کا ملغوبہ بنا لینے کا رجحان اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ حقیقت اعلیٰ درجے کے ادب اور عوام الناس کے مذہب ہر دو سطح پر یکساں شدت کے ساتھ موجود ہے۔ موخر الذکر سطح پر اس کا اظہار صوفیانہ کلام میں ہوتا ہے۔ بنگال میں راسخ العقیدگی پر مبنی سنی مذہبی تحریروں کی شدید کمی تھی۔ قرآن کا پہلا ترجمہ کہیں 1886ء میں جا کر ایک ہندو نے کیا۔ جبکہ نئے عہد نامہ کا پہلا بنگالی ترجمہ 1801ء میں چھپ چکا تھا۔ حاجی شریعت اللہ صوفیانہ رویے میں شامل خطرے سے آگاہ تھا کیونکہ اس سے نہ صرف اسلام دور ہندو مت کے درمیان خطِ امتیاز دھندلا جاتا تھا بلکہ اسے پیری مریدی میں ہندو مت کے گرو چیلا تعلق کی جھلک نظر آتی تھی۔ دلی کے مصلحین کی طرح وہ بھی برطانوی ہندوستان کو دارالحرب سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ جمعہ اور عید کی اجتماعی عبادات کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے غریب کاشتکاروں کے درمیان زندگی گزاری جن میں سے بہت سے اس کے اخلاق کے باعث قائل ہو گئے۔ بعد ازاں اس کے اکلوتے بیٹے محمد محسن جسے عرفِ عام میں دودھو میاں کہا جاتا تھا' نے باپ کی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش تھی کہ مسلمان دیہاتیوں کو اپنے مسلک میں شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے بنگال کے مختلف اضلاع میں اپنے مبلغین بھیجے۔ کچھ تعجب نہیں کہ یہ تحریک زمیندار مخالف رخ اختیار کر گئی' جو زیادہ تر ہندو تھے۔ اس لئے فرائضی تحریک کو محض طبقاتی کشمکش بھی خیال کیا جاتا رہا ہے۔ دودھو میاں (1819-1862ء) نے کچہریوں میں گھسیٹے گئے غریب کاشتکاروں کی مدد کے لئے بھی ایک نظام قائم کیا۔ اس نے انہیں کہا کہ وہ صرف سرکاری مالیہ ادا کریں۔ اس نے انہیں زمینداروں کے عائد کردہ درجنوں ٹیکس ادا کرنے سے منع کر دیا۔ زمیندار اور نیل کے جنگل اگانے والے تشدد پر اتر آئے اور انہوں نے ایذا دہی کے خاص طریقے ایجاد کئے۔ دودھو میاں کو غیر مقلد ثابت کرنے ان کے لئے بہت آسان تھا۔ وہ خود بھی تعاون نہ کرنے والے مسلمانوں کو دائرے سے خارج کر دیتا تھا۔ چونکہ سنیوں کی اکثریت نے فرائضیہ کو قبول نہیں کیا تھا' دائرہ دین سے خارج قرار دیئے جانے والوں کی

1834

تعداد کافی زیادہ تھی۔ 1938ء میں ہیجان انگیزی اتنی بڑھ گئی کہ انگریزوں کو بغاوت کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ جب بھی دودھو میاں کو گرفتار کیا گیا مقدمہ چلانے کے لئے گواہ ڈھونڈنا ناممکن ہو گیا۔ اسے جیل میں ڈالنے سے فرائضی تحریک بظاہر ختم ہو گئی لیکن اس نے ایک بنگالیوں میں ہلچل مچادی تھی۔ یہ صوبہ بے چینی کا مرکز بنا رہا۔

بہت تھوڑا عرصہ چلنے والی ایک بغاوت تیتو میر کی سرکردگی میں 1830ء بھڑکی۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر تیتو میر پر پیشہ ور پہلوان اور داداگیر ہونے کا ٹھپہ لگاتا ہے۔ اس کا احمد شہید سے بھی تعلق رہا اور یہ دیہاتیوں سے مل کر زمینداروں کے خلاف لڑتا رہا۔ جس میں وہ گائے کشی سے انہیں مشتعل کر دیا کرتا تھا۔

بنگال میں احمد شہید کی تحریک کا پروپیگنڈہ کرنے والوں میں سے مولانا کرامت علی جونپوری (متوفی 1873ء) اہم ترین ہیں۔ اگرچہ وہ بھی خالص اسلام سے رجوع کا حامی تھا تاہم اس کا ذہن دوسرے مصلحین کی نسبت زیادہ صوفیانہ تھا۔ اس نے فرائضیہ کے خلاف رسالوں کے ساتھ ساتھ عالمانہ تصنیفات بھی قلمبند کیں۔ سنجیدہ تصنیفات میں ماخذ العلماء' خاصی اہم ہے۔ یہ تحریر 1865ء میں ایک تحریری مقابلہ کے لئے لکھی گئی اس مضمون میں بیان کیا گیا خیال بعد ازاں سر سید اور خصوصاً اقبال کے ہاں خاصا مقبول نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ علم یونانیوں سے عربوں کو اور ان سے براستہ سپین یورپ گیا۔ اس لئے مسلمانوں کو یورپی اقوام سے تعلقات بنا کر علمی فائدہ اٹھانا چاہئے کیونکہ اس طریقے سے وہ دراصل اپنی میراث بھی واپس لیں گے۔ بطور ایک مصلح کے کرامت علی نے انتھک کام کیا۔

کرامت علی اوائل انیسویں صدی میں شاہ ولی اللہ اور میر درد کی طریقہ محمدیہؒ کے مکاتب فکر سے منسلک اصلاحی تحریک کا اہم نمائندہ تھا۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹوں شاہ رفیع الدین (1750-1818) اور شاہ عبدالقادر (1754-1815) دونوں نے ملد تیخ القرآن (مادہ تاریخ 1791-1205) کے کچھ حصے بطور نمونہ خوب صورت انداز نگارش کی وجہ سے گارساں دتاسی نے اپنے (Chrsetomathie Hndoustany) (مطبوعہ 1847) میں شامل کئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دلی کے علماء عیسائی مشنریوں کی بائبل کے اردو ترجمے کی کوششوں سے واقف ہوں۔ جرمن مشنری بنجمن شلز (Benjman Schultz) نے 1730ء میں سام اور عہدِ نامہ جدید کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا۔ بعد ازاں

اوائل انیسویں صدی میں اس طرح کی کوششیں برطانوی حکمت عملی کا اہم حصہ بن گئیں۔ شاہ رفیع الدین کی عربی اور فارسی تصانیف میں سے قیامت نامے کا کئی بار اردو بلکہ پشتو ترجمہ بھی چھپا۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹوں میں سے سرگرم ترین ان کے سب سے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز (1746-1824) تھے۔ یہ اپنے باپ کی طرح مدرسہ رحیمیہ میں درس دیتے تھے جہاں انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو بھی تعلیم دی۔ اپنے بے شمار طالب علموں کے ذریعے انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں علم حدیث پھیلا دیا۔ اپنے باپ کی طرح یہ عملی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے 1803ء میں ایک فتویٰ جاری کیا۔ اور انگریزوں کی عمل داری میں آنے والے سارے ہندوستانی علاقوں کو دارالحرب قرار دیا۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کا زیادہ تر علاقہ مرہٹوں کے زیرِ تسلط تھا۔ لیکن انہوں نے اسلامی قوانین میں مداخلت نہ کی کیونکہ وہ مغل بادشاہ کے وجود کا ڈھونگ برقرار رکھنا چاہئے تھے۔ لیکن جب 1803ء میں لارڈ لیک کے ہاتھوں مرہٹہ لیڈر سندھیا جی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو صورتِ حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ اس لئے شاہ عبدالعزیز برطانوی دارالحکومت کلکتہ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں۔

> "اس شہر میں امام المسلمین کو اقتدار حاصل نہیں بلکہ حقیقی طاقت مسیحی عمالوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان پر کوئی قدغن نہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ عنان مکمل طور پر کفر کے ہاتھ میں ہے...... وہ بلا رکاوٹ مسجدیں منہدم کروا دیتے ہیں۔ کوئی مسلم یا زمی بغیر ان کی اجازت شہر میں داخل نہیں ہو سکتا"

اس مذہبی مدرسہ سے انیسویں صدی کی اہم ترین جہادی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس کے بانی رائے بریلی کے سید احمد تھے۔ وہ اپنے آپ کو حسنی سید کہتے تھے یہ اور بات ہے کہ برطانوی انہیں لٹیرا اور رہزن خیال کرتے رہے۔ احمد 1786ء میں بریلی میں پیدا ہوئے اور براستہ لکھنو 1804ء میں دہلی پہنچے۔ یہاں انہوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن کوئی دانشورانہ کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ کچھ سال راجپوتانہ کے پنڈاری سردار کی معیت میں گزارنے کے بعد 1817ء میں دلی لوٹ آئے۔ ان کی شخصیت یقیناً کرشماتی رہی ہو گی کیونکہ عبدالعزیز کے داماد مولوی عبدالحی کا شمار ان کے

قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔ بہت سے مسلمانوں کو حیرت ہوئی کہ دلی کے علماء ایک غیر معروف اور کم تعلیم یافتہ شخص کو ایک نئی تحریک کا بانی بننے میں کیوں مدد دے رہے ہیں۔ سید احمد نے 1821ء میں حج کیا واپسی پر انہوں نے پنجاب میں سکھوں کی حکومت ختم کرنے کے ارادے سے جہاد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب وہ ہندوستان میں گھومتے پھرتے شمال مغربی سرحد کی طرف بڑھ رہے تھے ان کی بیعت کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ 1826ء میں اصل جہادی تحریک شروع ہوئی۔ سندھ کے پیر پگارو صبغت اللہ (متوفی 1831ء) جن کے خاندان نے 'سندھی تمدن اور سیاست میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا' نے اپنے جانثار درویشوں کی ایک جماعت ساتھ کر دی۔ درویشوں کے اس گروہ کو ایک صدی کے بعد انگریزوں کے لئے خاصی مشکل پیدا کرنا تھی۔ سید احمد کی فوج بالآخر پشاور کے علاقے میں پہنچی تو شہر میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا کچھ ابتدائی کامیابیوں کے بعد یہ پٹھانوں کی حمایت سے ہاتھ دھو بیٹھے کیونکہ انہوں نے قبائلی معاشرتی نظام میں مداخلت کرتے ہوئے زکوۃ وصول کرنے کی کوشش کی تھی۔ جبکہ قبائلی علاقے کسی قسم کا ٹیکس ادا کرنے کے عادی نہ تھے سید احمد اور محمد اسماعیل کی شہادت کے بعد 1831ء میں جہادی تحریک ختم ہو گئی۔ ان کی لاش کو جلا دیا گیا تھا۔ لاش نہ ملنے کی وجہ سے اخفائے جسمانی کی داستان نے جنم لیا۔ تیس سال کے بعد بھی مولانا یحییٰ علی میر درد کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے احمد شہید کے دوبارہ نمودار ہونے کی امید کا اظہار کرتا ہے۔

اسماعیل شہید نے اپنی کئی تحریروں میں تحریک مجاہدین کی مبادیات کی وضاحت کی ہے۔ "صراط المستقیم" ان کے اقوال کی تشریحات پر ممکن ہے۔ اردو کتاب "تقویۃ الایمان" میں طریقہ محمدیہؐ کے خیالات و نظریات قلمبند کئے گئے ہیں اس میں اسماعیل کے دادا کے خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ مکمل توحید بشمول مناہی شرک و پیر پرستی اور شب برات پر آتش بازی وغیرہ جیسی رسوم سے بچنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ پر فضول خرچی اور رنگ و نسل یا ذات پات کی بنیاد پر فرقہ واریت کی مذمت بھی گئی ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر بنگالی دیہات میں اس عقیدے کے مبلغین کی آمد اور دیہاتیوں کے سامنے ان کی تبلیغ کا حال تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

طریقہ محمدیہؐ کے پہلے خلیفہ میر درد کی طرح احمد شہید بھی متصوفانہ رنگ کے

راسخ العقیدہ اسلام کے نمائندہ ہیں اور وہ شاہ ولی اللہ اور دوسرے تعقل پسندوں کی طرح' جنھوں نے طریقہ ولائت اور زیادہ بلند طریقہ نبوت میں فرق کیا تھا' حب عشقی یعنی متصوفانہ جذب اور حبِ ایمانی یعنی اتباعِ شریعت میں فرق کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک متصوفانہ مثنوی "سلک النور" کے نام سے لکھی جو 1852ء میں لکھنو سے چھپی۔ ان کی "عباقات" سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے دادا ولی اللہ کی پیچیدہ اصلاحات پر مکمل عبور حاصل ہے۔ دونوں مصلحین نے مسلمانوں کو اعمالِ صالح یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ دونوں جہانوں میں سرخرو ہو سکیں۔

کسی طور پر بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ 1931ء میں ہونے والی بالاکوٹ کی شکست کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ اس برعکس محمدی ہلالیوں نام جو ہنٹر ان کے لئے استعمال کرتا ہے پہلے اپنا مستقر سوات اور پھر پٹنہ میں بنایا۔ مجاہدین آزادی جنہیں عربی تحریک سے مبینہ وابستگی کے باعث اکثر وہابی کہا جاتا تھا' کی سرگرمیاں نہ صرف سکھوں بلکہ انگریزوں کے خلاف بھی کئی دہائیوں تک جاری رہیں۔ ان لوگوں نے جنہیں ہنٹر بار بار جنونی سپاہ کا غول کے ہول ناک نام سے پکارتا ہے' خود اپنا ادب پیدا کیا جس میں اسماعیل شہید کی سی نظری تحریروں سے لے کر سیدھی سادی اردو میں لکھے گئے عملی رسالے اور منظوم پیش گوئیوں تک سب کچھ شامل تھا۔ حتیٰ کہ ایک رزمیہ نظم دورِ وسطیٰ کے شیعہ ولی شاہ نعمت اللہ سے بھی منسوب کی جاتی ہے جس میں مجاہدین کی بالآخر فتح کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی وسیع عوامی پیمانے کی پہلی تنظیم جماعت المجاہدین تھی اسے مسلمان معاشرے کے تمام مسالک کی حمائت حاصل تھی۔ کافر' انتظامیہ سے مکمل طور پر آزاد رہنے کے لئے انہوں نے اپنا بیت المال اور عدالتیں تشکیل دی تھیں۔ 1831ء کی ناکامی کے بعد کچھ مجاہد مکہ چلے گئے۔ ہجرت کسی مومن کے لئے تقریباً واحد کھلا رستہ تھا۔ کیونکہ کافروں کے ملک میں موجودگی اپنے پیغمبرؐ کی ناراضگی کو مول لینے کے مترادف تھا۔ ہندوستان میں یہ تحریک رفتہ رفتہ بعض ارفع مقاصد کھو بیٹھی۔ 1864ء میں وہابیوں کا ایک بڑا محاکمہ انبالہ میں منعقد کیا گیا اور 1870ء میں سنی شیعہ دونوں نے وہابی' تحریک سے کنارہ کر لیا۔ تاہم سیاسی وجوہات کی بناء پر ان سے متنفر' جن میں انگریزی زیادہ نمایاں تھے بھی ایک طرح ان کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

1831ء کے بعد مکہ ہجرت کر جانے والوں میں شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولانا محمد اسحاق (1864-1778) بھی شامل تھے۔ ان کٹر حنفی عالم کا شمار ان علمائے میں ہوتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے سلطان ترکی سے اتحاد کی بات کی تھی۔ جو بالآخر مکہ اور مدینہ کا حاکم اور بحیثیت خلیفہ مسلمانوں کا روحانی سربراہ خیال کیا جاتا تھا۔ عثمانی خلیفہ سے وابستہ یہ امید بعد ازاں ایک اہم سیاسی مسلہ بن گئی۔

مولانا محمد اسحاق کے بے شمار مریدین اور شاگرد تھے جنہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی زندگی کی نشوونما اور تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک مولانا مملوک علی (متوفی 1850) تھے۔ انہوں نے ایک ایسے ادارے میں تدریسی خدمات سرانجام دیں جس کا مقصد تھا کہ مسلمان اپنے تمدنی ورثے کو نظر انداز کئے بغیر مغربی علم تک رسائی حاصل کر سکیں یہ ادارہ دہلی کالج تھا۔ اس ادارے کو 1827ء سے انگریزوں کی مالی امانت حاصل تھی۔ اس کا پرنسپل ہمیشہ انگریز ہوا کرتا تھا۔ یہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا لیکن انگریزی بطور معاون زبان پڑھائی جاتی تھی۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مناسب کتابیں مہیا کرنے کی غرض سے ترجمے کی اولین کوششیں فیلکس بوتراس (1910-1732) نے خاص کردار ادا کیا۔ اگرچہ انہوں نے اردو پر گارساں دتاسی کے کچھ کام کا ترجمہ ترجمہ کیا لیکن ان کا ریاضیاتی موضوعات پر ترجمے کا کام نہایت اعلیٰ ہے۔ 1841ء مقامی زبانوں کی وساطت سے ہندوستان میں علم کی ترویج و ترقی کے لئے سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج میں مسلم نوجوانوں پر دہلی کالج کے اثرات قلمبند کئے ہیں۔ ادب کی بجائے سائنس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور طالب علم نہایت جوش و خروش سے تحصیل علم کرتے تھے۔ پانی پت کے انتھک مولوی کریم الدین نے سالوں کالج میں خدمات سرانجام دیں۔ بے شمار تصنیفات کا اردو ترجمہ کیا اور مولوی ذکاء اللہ کی طرح تعلیم نسواں کی حمایت کرتے رہے۔ پرانی وضع کے کلاسیکی ادب کے فاضل مولانا امام بخش صہبائی فارسی کے پروفیسر تھے۔ آسٹریا کے عالم ایلوکر سپرینگر نے بھی کچھ عرصہ اس کالج میں پڑھایا۔ انہوں نے مغرب و مشرق کے خود آئند اور خوب صورت ملاپ کو سامنے لانے کے لئے 1845ء میں ایک جریدے "قرآن السعدین" (خوش بختی کے دو ستاروں کا ملاپ) کی بنیاد پر رکھی۔ بہت جلد اس پہلے اردو جریدے کا تتبع کیا جانے لگا۔ اردو اور فارسی میں کئی اخبار نکلنے لگے۔

حالانکہ اسلامی روایات پر سپرینگر کی طرف فکر خاصی ناقدانہ تھی لیکن اس نے بھی پر صحافت کے کردار کو جوش و خروش سے سراہا کہ یوں ہندوستانی مسلمانوں پر ان کے ماضی کے خزینے عیاں ہوئے اور وہ اپنی روحانی دولت کی میراث سے باخبر ہوئے۔

دہلی جو کمپنی کے لئے ابھی مقبوضات کے دور افتادہ مرکز سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بوڑھے فرماں رواں بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ایک بار پھر علم و ثقافت کا مرکز بنتی نظر آنے لگی اور ایک طرف بنیاد پرست مجاہدین کے زیر اثر علاقوں اور دوسری طرف لکھنو میں کھل کھیلتے شیعہ دربار کے مقابلے میں ڈٹ گئی۔ بلا شبہ مغل بادشاہ کا کردار کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ غریب' اور سینکڑوں غریب تر متعلقین میں گھیر اسلاطین بہادر شاہ کم از کم' بلند آہنگ خطابات و القابات کا مسالک ضرور تھا۔ اور چونکہ انگریزوں نے اس کی شاہی حیثیت کا افسانہ بر قرار رکھا۔ ہوا تھا اس کے درباری شاعر پر شکوہ قصیدے پڑھا کرتے تھے کہ وہ دنیا کا مرکز ہے۔ بادشاہ کی مدح سے لکھے گئے چودہ قصائد سے ایک میں غالب یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

مرزا غالب (1869-1797ء) دہلی کے سب سے اہم شاعر تھے۔ اس کے بہت سے اردو اشعار آج بھی بر صغیر میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے زہد و پارسائی کا دعویٰ نہ تھا بلکہ وہ نیم مسلمان کہلوانے کو تیار تھا کیونکہ وہ مے نوش تھا۔ تاہم اس نے مدحت رسولؐ میں کچھ فن پارے اور بحیثیت شیعہ' آئمہ کی شان میں بلند پایہ قصائد لکھے ہیں۔ اس نے اسماعیل شہید اور مولوی فضل حق خیر آبادی کے درمیان ہونے والی علمی بحث میں بھی حصہ لیا۔ موخر الذکر عالم نے منطق' فلسفہ اور کلام کی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی تھی۔ ان والد فضل امام (متوفی 1829) کمپنی کی ماتحتی میں مفتی اور صدر الصدور کا عہدہ قبول کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ ان کی وفات پر مادہ تاریخ غالب نے نکالا تھا۔ اسماعیل شہید کا نقطہ نظر تھا کہ اگرچہ محمدؐ ہی خاتم النبین ہیں (یعنی آخری نبی ہیں) لیکن خدا چاہتا تو ایک اور محمدؐ بنا سکتا تھا۔ یعنی کہ یہ امر بنیادی طور پر ممکن' یا ممکن بہ رہتا تھا۔ لیکن خدا دنیا پر اس کا ظہور نہیں کرے گا کیونکہ یہ بجائے خود تضاد ہو گا جبکہ مولوی فضل حق خیر آبادی کا خیال تھا کہ خاتم النبین ممتنع النظیر ہیں۔ یعنی کہ ان کا مثل ناممکن ہے غالب سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے اپنی رائے ایک فارسی مثنوی میں بیان کی۔

کیونکہ خدا کو ایک اور محمدؐ پیدا کرنے پر قادر نہ سمجھنا خدائے غالب و قادر کی قدرت

کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا اس دوسرے خاتم النبین کا تعلق ہماری دنیا کی بجائے کسی اور جہان سے ہو گا۔ اس لئے کہ اگر خدا ایک اور دنیا تخلیق کرتا ہے تو رسالت کی ضرورت وہاں بھی ہو گی۔

اقبال کے "جاوید نامہ" میں فلکِ مشتری کے مقام پر غالب ایک بڑے زندیق کے طور پر نمودار ہوتا ہے یہاں اقبال نے غالب کے اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ یہاں زندیق سے مراد وہ لوگ ہیں جو فلاح اور بابی شہید قرۃالعین کی طرح فرطِ محبت میں کفر سے قریب ہو جاتے ہیں۔ غالب کو کبھی ایک مذہبی شاعر خیال نہیں کیا گیا لیکن اس کی متخیلہ میں صوفیانہ خیالات کا معتد بہ حصہ ہے وہ بعض اوقات وحدت پرست مصلحین کے خلاف بھی ہو جاتا ہے جو اولیاء سے عقیدت کو بد عقیدگی کی علامت سمجھتے ہیں۔ بطور شاعر وہ شر اور علامات کی ضرورت سے واقف ہے۔ ان توحید پرستوں سے اس کا سوال ہے۔

"آخر کو گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں" کہنے والا یہ شخص روایتی رسوم کی خوب صورتی پر بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے۔

1850ء میں ہندوستان کی صورت حال کافی پر سکون نظر آتی ہے۔ اس عرصے میں کسی بڑی سیاسی یا مذہبی بے چینی کا سراغ نہیں ملتا۔ دلی اٹھارہویں صدی کے ہلا دینے والے جھٹکوں سے سنبھل گئی تھی۔ بہادر شاہ مشہور درگاہوں پر حاضری دیتا اور ایک طرح سے پیر بن کر اپنے مریدین سے بیعت لیتا۔ تیمور کے گھرانے کی روایات میں اس نے شاعری بھی کی جس کا شمار انیسویں صدی کی عظیم ترین نہ سہی لیکن عمدہ ترین شاعری میں ہوتا ہے۔ کرناٹک کا نواب غلام غوث خاں بہادر اتنا روشن خیال تھا کہ اس نے مدراس میں 1851ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ جس میں روایتی مسلم زبانوں کے علاوہ انگلش، تامل اور تیلگو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی لیکن یہ ادارہ صرف چند برس چل سکا۔ کیونکہ قدامت پسند رہنما نے یہ کہہ کر تعاون کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ایسے کام کی حمایت نہیں کر سکتا جس کا مقصد رعائت دین کی بجائے روزی کمانا ہو۔ اسی طرح کے نقطہ نگاہ سے سر سید احمد کاں کو بھی چند سال کے بعد واسطہ پڑا۔ 1855ء میں کرناٹک کے حکمران کا انتقال ہوا تو انگریزوں نے اس نیم خود مختار نوابیت کا سلسلہ بر قرارر کھنے سے انکار کر دیا۔ اب اس کے جانشین محض شہزادہ کہلاتا تھا ایک سال کے بعد 1856ء میں انگریزوں نے بالآخر اودھ کی بادشاہت بھی ختم کر دی اور آخری

بادشاہ واجد علی شاہ کو جلاوطن کر کے کلکتہ بھجوا دیا جہاں وہ 1887ء میں اپنی موت تک عشقیہ اور مذہبی شاعری اور اپنی بیگمات اور چڑیا گھر کی دیکھ بھال کرتا رہا۔

لیکن بظاہر پرسکون حالات کی زیرِ سطح انگریز راج کے خلاف جمع ہونے والی نفرت اور اس کے مضمرات زور پکڑتے جا رہے تھے۔ فروری 1857ء سے بغاوت کے آثار نے فوج میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ 11 مئی 1857ء کو میرٹھ کے فوجی دستوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کی فوری وجہ بظاہر ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ ایک افواہ اڑی تھی کہ نئی رائفل میں استعمال ہونے والے کارتوس جنہیں استعمال کرنے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا' پر گائے اور سور کی چربی لگی ہوئی اس طرح یہ کارتوس ہندو مسلمان دونوں کے لئے ناپاک ہو گیا تھا۔ چند دن کے بعد ہندوستانی سپاہیوں نے یورپی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ دلی' میرٹھ اور لکھنو اور ارد گرد کے ملحقہ علاقوں میں لڑائی 20 ستمبر تک جاری رہی۔ لڑاکا دستوں نے بہادر شاہ ظفر کو دعوت دی کہ وہ مغل سلطنت کا از سر نو اعلان کر دے۔

بالآخر انگریز دستوں نے صورتِ حال پر قابو پا لیا اور بغاوت کا بے رحمی سے انتقام لیا جس کا زیادہ تر الزام مسلمانوں پر تھا۔ غالب نے اپنی فارسی کتاب "دستنبو" میں "غدر" کے ہولناک واقعات بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کو بنیادی طور پر ملکہ وکٹوریہ کے ملاحظے کے لئے ایک موقع کے طور پر تیار کیا گیا تھا جو 1858ء سے ہندوستان کی ملکہ بھی بن گئی۔

کئی ہفتوں تک دلی کی آبادی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ فوجیوں نے بڑی مساجد پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کو جامع مسجد پانچ سال کے بعد واپس کی گئی۔ بہادر شاہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے کچھ بیٹوں کو قتل کرنے کے بعد فروری 1858ء میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور بالآخر جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ فضلِ حق خیر آبادی جنہوں نے بغاوت میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جزائر انڈمان بھیج دیئے گئے جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنی ایک چھوٹی سی عربی کتاب "الرسالۃ العذریہ یا الصورۃ الہندیہ" میں انہوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس سانحے کی ذمہ داری انگریزوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے ہندوستانیوں پر حق دبا دینے والی غربت مسلط کرنے اور ہندوستان سے مسلم علوم کے خاتمے کی کوشش کی۔ جلد ہی اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی سامنے آ گیا۔

دلی ایک بار پھر کھنڈر بن گئی۔ صدیوں تک مسلم برتری کی اس تجسیم پر کئی نوحے لکھے گئے۔ حیدر آباد میں پناہ لینے والے داغ نے یہ شہر آشوب لکھا۔

چھٹا باب

اصلاحی تحریکوں کا دور

1857ء کی ناکام فوجی بغاوت ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا اہم موڑ بن گئی۔ اب ایک صدی پہلے کی نسبت انہیں اپنے تشخص کی تلاش یقیناً زیادہ تھی۔ تب دہلی دشمنوں اور اپنے ہم مذہبوں کے حملوں تلے سسک رہی تھی۔ انگریزوں کے اہم فوجی اور قانونی اہمیت کی جگہوں پر رفتہ رفتہ چھا جانے کے عمل نے ہندوستانی مسلمانوں میں جن مختلف رویوں کو جنم دیا تھا ان میں سے ایک کافروں سے عدمِ تعاون اور دوسرا ان کی طرزِ زندگی کو ایک خاص حد تک اختیار کر لینے کا رویہ تھا۔ لیکن 1857ء کے بعد معاملات مکمل طور پر بدل گئے اب حکمران ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارکان نہیں بلکہ تاج برطانیہ تھا۔ اب بھی کئی دیسی ریاستیں موجود تھیں ان میں سے کچھ اب اسلامی علوم کا مرکز بن گئیں۔ جن میں بھوپال' حیدر آباد اور رام پور کی ریاستیں شامل تھیں۔ سیاسی یا مذہبی وجوہات کی بناء پر دہلی چھوڑنے والے علماء اور شعراء کے لئے ان ریاستوں کے دربار دوسرا گھر ثابت ہوئے۔

چونکہ بغاوت کی زیادہ تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی گئی تھی اس لیے ان کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ مسلمانوں کے مابین اس حوالے سے سوال وجواب ہونے لگے کہ اس صدمے' یا زیادہ عمومی سطح پر بات کی جائے تو برطانوی تسلط اور برتری پر کیا ردعمل اختیار کیا جائے جن لوگوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیمی نظام میں شامل ہو کر اپنی حالت بہتر بنانے پر آمادہ کیا ان میں سر سید احمد کا نام نمایاں ہے۔

احمد خاں 1817ء میں اشرافِ دلی کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ

اجداد شاہجہان کے دور میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے نانا اور باپ دونوں کی دربار سے قریبی وابستگی تھی۔ چنانچہ احمد خاں نے عظیم مغلوں کے دورِ عروج کی ایک نشانی کے طور پر پرورش پائی جسے کسی طور خبر نہ تھی کہ ایک دن اسے نئی قومیت کا پہلا پیغمبر کہا جائے گا۔ بہت کم محققین سراغ لگا پائے ہیں کہ سرسید کی ابتدائی زندگی پر صوفیانہ 'بلکہ یوں کہنا چاہیے' نقشبندیہ اثرات موجود تھے۔ تاہم اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں۔ ایک تو ان کے نانا تصوف کی طرف مائل تھے جس کا اثر ان کی والدہ پر بھی پڑا اور دوسرے اپنے والد کے واسطے سے سرسید کا نصب میر درد سے ملتا ہے۔ اس کا ثبوت نہ صرف ان کی ابتدائی شیعہ مخالف تحریروں بلکہ ایک رسالہ 'جو تصور شیخ پر ہے' سے بھی ملتا ہے تصور شیخ نقشبندیہ سلسلے کی مخصوص ریاضت ہے اس رسالے میں نوجوان احمد خان بیان کرتے ہیں کہ مرشد پر ارتکاز کرنے سے مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ سید احمد کی اولین تصانیف پر طریقہ محمدیہؐ کی روایت میں لکھی گئی تحریروں کے اثرات واضح ہیں۔ اس حوالے سے اسماعیل شہید خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ 1841ء میں انہوں نے پیغمبر اسلام پر ایک کتاب "جلاء القلوب" لکھی یہ دراصل ایک نئی طرز میں لکھا گیا "اصلاح یافتہ" مولود ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو پیغمبر کی تعظیم کا حصہ بن جانے والے معجزات کی دھند سے نکال کر واپس پیغمبرِ اسلام کی زندگی کے خالص منابع کی روشنی میں لانا تھا۔ ان کا یہ رویہ نقشبندی مجددی مکتب فکر سے ملتا جلتا ہے۔ ان کی ولی کی تعریف بھی ان پر نقشبندیہ اثرات کی تصدیق کرتی ہے ان کے نزدیک ولی کی ولائت کا انحصار اتباعِ شریعت میں ہے نہ کہ معجزوں کے سرزد ہونے میں۔ 1838ء میں والد کی وفات کے بعد سید احمد نے 1838ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی اور بتدریج صدر امین کے عہدے تک پہنچے یہ عہدہ سب جج کے مترادف ہے اس نوجوان کو اپنے آبائی شہر کی تاریخ گہری دلچسپی تھی۔ اس لئے ان کی پہلی بڑی تصنیف "آثار الصنادید" اردو زبان میں دلی کی تاریخ پر پہلی کتاب ہے جس میں مصنف نے بہت سی عمارات کے بے شمار خاکے دیئے ہیں۔ بعد ازاں اس نے "آئین اکبری" اور برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی تدوین بھی کی۔ یہ کام "ببلیو تھیکا انڈیکا" کے لئے کیے گئے تھے۔ لیکن مسلم ہند تاریخ میں اپنی تمام تر دلچسپی کے باوجود وہ انگریزوں کے وفادار رہے۔ حتیٰ کہ 1857ء کی بغاوت میں انہوں نے بجنور میں ایک یورپین کالونی کی حفاظت بھی کی۔ شمالی ہندوستان کے زیادہ تر مسلمانوں کی طرح یہ

بغاوت، جس نے ان کی ہر محبوب چیز تباہ کر دی، ان کے لئے ایک "فیصلہ کا لمحہ" بن گیا ہو گا جس نے انہیں ایک نیا اندازِ فکر عطا کیا۔ اب احمد خاں نے ہندوستانی بغاوت کے اسباب (اسبابِ بغاوتِ ہند) سامنے لانے کی کوشش کی اور ہر دو فریقین کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ سر سید کے خیال میں جہاں حکومت نے اپنی رعایا کے حالات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہاں لوگوں نے بھی انگریزی راج کو غلط سمجھا تھا۔ چونکہ اس المیے کی جڑ باہمی غلط فہمی تھی اس لئے سید احمد خاں نے مصالحانہ کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ کلکتہ کے نواب عبداللطیف کی طرح جس نے **1863**ء میں اپنے ہم وطنوں کو انگریزی سے متعارف کروانے کے لئے ایک لٹریری سوسائٹی قائم کی، سید احمد خاں نے بھی غازی پور میں ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ جہاں وہ بطور صدر الصدور تعینات تھے انہوں نے ایک سکول بھی قائم کیا جس میں سنسکرت سمیت پانچ زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ انہوں نے انگلش کتابوں کے ترجمے میں خود بھی حصہ لیا۔ ترجمہ شدہ کتابوں میں طب اور ریاضی کے کام بھی شامل تھے۔ ان کا خاندان ریاضیات اور اس سے متعلقہ علوم میں دلچسپی کے لئے مشہور تھا۔ وہ اس امر کے قائل تھے کہ مسلمانوں کو حکمرانوں کے مذہب کو جاننا چاہئے۔ اس لئے انہوں نے بائبل کی تشریح لکھنے کا آغاز کیا۔ عیسائیت کے دعوؤں کو سنجیدگی سے لینے کی یہ پہلی کوشش تھی لیکن پروان نہ چڑھ سکی۔ یہ کتاب سی، جی فانڈر (**C G Fander**) جیسے مشنریوں کی سرگرمیوں کا منطقی رد عمل تھا۔ اسے رام موہن رائے کی "**The Percepts of Jesus**" (**1834**ء) جیسی کوشش خیال کیا جا سکتا ہے۔ ڈبلیو ولیم میور کی کتاب "حیات محمد" (**Life of Muham-mad**) پر سر سید نے بحث کی اور زیادہ تر اس کا استرداد کیا۔ تنبیہ ۔۔ سترد۔ revocation

1869-70ء کے دوران انگلینڈ میں چھ ماہ کے قیام نے سر سید کو قائل کر دیا کہ انگریزوں کی ہر چیز برتر ہے۔ انہوں نے برطانیہ کے کم ترین طبقے کی بھی اتنی زیادہ مدح رسائی کی کہ قدامت پسند مسلمان ان کے خلاف ہو گئے۔ ان کے ہم خیال لوگوں کی انگریز پرستی پر بعد ازاں اکبر الہ آبادی نے منظوم طنز کیا۔ اکبر سر سید پر وہ شعر چست کرنے سے نہیں ہچکچاتا جو حلاج کی روایت میں شیطان سے منسوب ہے جس کے مطابق وہ آدم کو سجدہ سے انکار کر کے خدا کے ارادہ اور حکم کے درمیان پھنس جاتا ہے۔

قدامت پسند مسلمانوں نے اسلام اور مغربی تعلیم کے ملاپ سے نئی راہ نکالنے کی

کوشش کرنے والے شخص سے یہ سلوک کیا لیکن وہ متزلزل نہیں ہوا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ

"اگر بہ رضائے خداوندی ہم پر کسی ایسی قوم کا غلبہ ہو جائے جو ہمیں مذہبی آزادی دے، ہم پر عدل وانصاف سے حکومت کرے، ملک میں امن وامان قائم کرے، ہماری عزت نفس اور جان و مال کی حفاظت کرے جیسا کہ انگریز کر رہے ہیں، تو ہمیں ان کا وفادار رہنا چاہئے۔"

اس کے پڑھنے والوں کو جوزف یاد آ جاتا ہے جو پوٹی فار (Potiphar) کی خدمت کرتا ہے حالانکہ وہ اس کا ہم مذہب بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ احمد خاں کو اسلام کے کچھ اصول غیر ضروری طور پر سخت محسوس ہوئے تھے۔ اپنی کتاب "احکام اطعام اہلِ کتاب (1668ء) میں وہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اور عیسائی اکٹھے کھانا کھا سکتے ہیں چاہے اس میں غیر مذبوحہ پرندہ ہی کیوں نہ شامل ہو۔ اس رویہ کے باعث سر سید احمد خاں کو 'ہماری ہندوستانی سلطنت کا ایک روشن خیال اور وفادار شہری' کا خطاب دیا گیا۔

لیکن ان کی زیادہ تر دلچسپی تعلیمی معاملات میں تھی۔ انہیں مسلم تمدن کی گہرائی پر بنیادی اعتماد تھا اور یہی ان کی قوتِ محرکہ بھی تھی۔ مسلمانوں کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو وہ انگریزی تعلیمی نظام میں حصہ لے کر کھو دیں گے۔ اس کے برعکس اگر وہ جدید سائنس کے کٹ کر رہیں گے تو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ انگریزی نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ تھی چنانچہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر حیران ہو کر لکھتا ہے۔

"جن تبدیلیوں کو ہندو خوشدلی سے قبول کر لیتے ہیں، مسلمان گناہ خیال کرتے ہیں"

مدرسوں اور مکتبوں میں اب بھی قرونِ وسطیٰ کا نصاب پڑھایا جا رہا تھا۔ ہندو آغاز ہی سے دنیاوی تعلیم حاصل کرنے لگتے تھے جبکہ مسلمانوں کو اس پہلے کئی سال تک بنیادی اسلامی تعلیم حاصل کرنا پڑتی تھی۔ عیسائی حکمرانوں کے قائم کردہ سکولوں میں صلیب یا کسی اور مذہبی علامت کی موجودگی مسلمان طالب علموں کے لئے تکلیف دہ ہوتی تھی جبکہ ہندو اس کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ وجوہات تھیں جن کی بناء پر مسلمان انگریزوں

کے سکولوں میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ "معزز مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں میں بھیجنا باعث عار تصور کرتے تھے کیونکہ وہاں انہیں عام لوگوں کے گھلنا ملنا پڑتا تھا"

1866ء میں علی گڑھ میں تعینات ہونے کے بعد سرسید نے مسلمانوں کو رسالوں اور تصانیف کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور آخر میں تہذیب الاخلاق نکالا جو 1871ء سے 1882ء تک نکلتا رہا۔ یہ رسالہ جسے محمڈن سوشل ریفارمر بھی کیا جاتا ہے' ایک ماہوار رسالہ تھا جس کا نام دورِ وسطیٰ کے فلسفہ دان ابن مشکواۃ سے لیا گیا تھا لیکن یہ اصطلاح نقشبندیہ سلسلے سے وابستہ ہے۔ جس میں تہذیب الاخلاق سے مراد اخلاقی صفات کو جلا بخشنا ہے۔ نقشبندیوں کا خیال ہے کہ اس عمل سے کشفِ عقلی تک رسائی ہوتی ہے یہی وہ نور تھا جس سے مدیر نئے ابھرتے ہوئے متوسط مسلمان طبقے کو منور کرنا چاہتا تھا وہ لکھتے ہیں :

> "مسلمانوں میں تہذیبوں میں سے بہترین سے روشناس ہونے کی خواہش بیدار کرنا تاکہ مہذب لوگ اِن سے نفرت کا رویہ ترک کر دیں اور اِن کا شمار بجائے خود مہذب اقوام میں ہونے لگے"

سید احمد خان کے خیال میں تعلیم باقی ہر چیز کی بنیاد ہے جس کی عدم موجودگی میں لوگوں کی فلاح کے لئے ہر منصوبہ بندی بے کار ہے۔ اس لئے اس نے اینگلو انڈین کالج قائم کرنے پر ممکن کوشش کی اور بالآخر 1875ء میں کامیاب ہو گیا۔ اس کالج کی بنیاد علی گڑھ میں 8 جنوری 1877ء کو لارڈ لٹن نے رکھی تدریسی سرگرمیوں کا آغاز ایک سال کے بعد ہوا یہ کالج برطانوی اصولوں پر قائم کیا گیا تھا۔ اعلیٰ جماعتوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ سکول کے طور پر قائم ہونے والا یہ ادارہ بعد ازاں کالج بن گیا۔ اس ادارے نے ممتاز مستشرقین کو اپنی طرف کھینچا۔ ان میں ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ' جے یھوروونز' اے ٹریٹن اور سپیز شامل تھے۔ 1920ء میں اس کالج کو یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ جو جلد ہی مسلم قومیت پرستی کا مرکز بن گئی۔ اس میں آج نئے نئے شعبے شامل کئے جا رہے ہیں۔ قدامت پسندوں نے مولوی علی بخش کی قیادت میں شدید ردعمل کا اظہار کیا اور علی گڑھ کے خلاف فتاویٰ دیئے۔ اس طرح کے فتاویٰ مکہ مدینہ نے مکہ مدینہ سے بھی جمع کئے۔ انہوں نے احمد خان پر ہر قسم بد عقیدگی کے الزام لگائے اسے شیطان کا خلیفہ کہا گیا جو مسلمانوں کو راہِ ہدائت سے بھٹکاتا

چاہتا ہے اور جس کی غداری عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی بدتر ہے۔

لیکن احمد خان نے اپنی جنگ جاری رکھی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس (1886) علی گڑھ تحریک کا مرکز بن گئی۔ اگرچہ علی گڑھ کا پروگرام کم وبیش شمالی ہندوستان کے اردو دان مسلمانوں تک محدود تھا لیکن اس ایجوکیشنل کانفرنس نے سرسید کے نظریات کو پورے برطانوی ہند میں پھیلا دیا۔ تاہم اس تحریک کے علاوہ بھی مختلف جگہوں پر تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ بنگال میں عبید اللہ سہروردی نے ڈھاکہ کالج قائم کیا جو علی گڑھ کی طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر گیا۔

"ہر جگہ مسلمانوں کے پست معیار تعلیم' بیکار محض باریکیوں پر مشتمل الہیاتی مناظروں اور پر تصنع انکسار' جس کے نتیجے میں اتنا ہو گا کہ کچھ بچے صوفی بن جائیں گے۔" پر ردعمل کو پیش نظر رکھا جائے تو احمد خاں کا عملی اوصاف پر زور دینا قابل فہم ہے۔ "کیا بچوں کے لئے یہ جاننا واقعی ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام کے سر پر ٹھیک 104472 بال تھے؟ خصوصاً جب انہیں اسلامی مذہبی اقدار کی کچھ خبر نہ ہو۔"

انہیں مسلمانوں کی تاریخ میں افسوس ناک حد تک عدم دلچسپی کا بھی احساس تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علماء جاننے کی کی زحمت ہی نہ کرتے کہ ایک خاص وقت میں کون سے واقعات ہوئے۔ ان کی دلچسپی فقط جنت اور اسے حاصل کرنے کے طریقوں تک محدود تھی (آج بھی برصغیر میں خاصے پڑھے لکھے مسلمانوں کو واقعات کے مابین زمانی تعلقات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں) لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ سید احمد خاں نے اپنا تعلیمی نظام وضع کرتے ہوئے صرف بالائی طبقہ کو پیش نظر رکھا تھا۔ نچلے طبقے کے مسلمانوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

1884ء میں سید احمد خاں نے لاہور میں دعویٰ کیا۔ آج ہمیں ایک جدید علم الکلام کی ضرورت ہے تاکہ ہم یا تو ثابت کر سکیں کہ علوم جدید کے اصول غلط ہیں یا پھر ہم اپنی دینی تشریح از سر نو کرنے کو تیار رہیں۔

چنانچہ انہوں نے قرآن کی ایک تفسیر قلمبند کرنے کا آغاز (1885) کیا۔ اس کام کے لئے انہوں نے جو نقطہ نظر اپنایا اسے 15 نکات کی شکل میں بیان کیا۔ ان کے نزدیک

قرآن اسلامی قانون کا واحد مبراء عن الخطا منبع ہے وحی کے مسئلہ پر وہ شاہ ولی اللہ سے بھی زیادہ بنیاد پرست اور قدامت پسند ہیں جن کی وہ کئی دوسرے مسائل پر تائید کرتے ہیں۔

"مجھے یہ تشریح قبول نہیں کہ قرآن کا مفہوم رسول اللہؐ کے قلب پر اتارا گیا جنہوں نے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ قرآن الفرقان بعینہ اِن ہی الفاظ میں نازل ہوا تھا اور انہوں نے محض یہ الفاظ لوگوں کو سنائے تھے"

زجبریل امیں قرآن بہ پیغامی نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنی کہ من دارم
خدا دارم دلی بریاں زعشقِ مصطفیٰ دارم
ندارد ہیچ کافر سازو سامانی کہ دن وارم

سید احمد کا رویہ پروٹسٹنٹوں سے ملتا جلتا ہے اور انہی کی طرح وہ "مافوق الفطرت اور اوہام" کو بنظر کراہت دیکھتے ہیں۔ ان کا رجحان قرآن کی عقلی تفسیر کی طرف تھا۔ چنانچہ وہ جنوں کا ایک "وحشی غیر متمدن قبیلہ" فرشتوں کو "تائید ایزدی" اور شیطان کو "جذبہ بد" خیال کرتے ہیں۔ یہ رجحان ان کی 1942ء کی اولین تحریروں میں نظر آتا ہے جن میں وہ پیغمبر اسلام کی ذات سے وابستہ عشو و زوائد علیحدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وہابیوں سے ایک طرح کی ہمدردی ہے جنہوں نے اسلام کو توہمات اور باطل متصوفانہ عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک رسالت ایک فطری مظہر ہے (یہاں وہ شاہ ولی کے خیال سے کچھ زیادہ دور نہیں) وحی کے لئے کوئی خاص جبرئیل فرشتہ لازمی نہیں۔ انہوں نے رسول کے معصوم ہونے کا دفاع کیا ہے۔ اگرچہ اپنے زمانے میں حدیث کو دیئے جانے والے مقام پر انہوں نے کڑی تنقید کی ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ

"مذہبی امور پر رسولؐ کی سنت ہم پر فرض ہے اور دنیاوی امور پر ہمیں اس سنت پر عمل کرنے کی اجازت ہے"

اس پر بھی وہ کہتے تھے کہ طبع سلیم پر گراں گزرنے والی احادیث پر عمل ضروری نہیں۔ اسی تعقلی طرز فکر کی وجہ سے انہوں نے قرآن و حدیث کے کچھ قوانین کی "عملی"

تشریح و تفسیر کی۔ اگرچہ کثیر الازدواجی منع نہیں لیکن عموماً انسانی فطرت کا تقاضا ایک ہی بیوی ہے اور غلامی اگرچہ شروع میں مروجہ تھی لیکن لگتا ہے کہ بعد ازاں منع کر دی گئی۔ ان کے نزدیک سود لینا جائز تھا اور قرآن کی سورہ النسا (5/33) میں قطع ید جیسی سزائیں صرف اس غریب معاشرے کے لئے ہیں جو چوروں اور بدکاروں کے لئے جیلوں کا بندوبست نہ کر سکتا ہو۔ سر سید احمد کے مطابق عورتوں کے لئے بہترین چیز پردہ ہے۔

سید احمد نے کلمہ الٰہی کی عملی تشریح پر اتنا زور دیا کہ ان کا تصور خدا بھی تنزیع سے مملو ہے جس کی روح کے تحت خدا فقط سبب اعلیٰ بن کر رہ گیا ہے۔ احمد خاں سے علماء کے دور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک عام شخص نے 'جو ان کے گروہ کا باقاعدہ تربیت یافتہ رکن بھی نہیں خود کو نازک الٰہیاتی مسائل پر بحث کرنے کے مقام پر فائز کر لیا ہے۔ احمد خاں کے نزدیک اعجاز قرآن اس کا بہ مثل طرز نگارش یا حسن خطابت نہیں بلکہ نیم وحشی بدوؤں کی تہذیب ہے۔ علماء کے نزدیک یہ نیا نقطہ نظر اضطراب انگیز تھا۔ روز حساب پر سید احمد کا ذہن زیادہ واضح نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ "نیکی اور بدی کی جزا اور سزا فطری قوانین کے مطابق ہو گی جو خدا نے وضع کر دیئے ہیں" لیکن اس مقام پر قرآن کی معادیاتی متون کے دعویٰ کو بھی سمجھنا ہو گا کہ انسانوں کو پیش آمدہ نتائج سے آگاہ کر کے اچھے اعمال کی طرف راغب کرنا اور برے اعمال سے روکنا۔ لیکن ان سارے معادیاتی واقعات میں "اختلاف" بھی کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔

احمد خاں کے نزدیک اسلام کو لاحق سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اسے فقہ کے مترادف خیال کیا جانے لگا تھا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ علماء کی بشری رائے کو منشائے الٰہی خیال جانے لگا تھا۔ (انہیں دنوں لارڈ کرامر نے لکھا تھا کہ اصلاح شدہ اسلام اصل اسلام نہیں) اس طرح قرآن اور حدیث کی بیان کردہ سادہ اور غیر متغیر' مذہبی سچائی پر ثانوی تشریحات کی گرد تہہ بہ تہہ چڑھ گئی تھی۔ قرآن کا کوئی بیان فطرت سے متصادم نہیں ہو سکتا کیونکہ وحی اور فطری قوانین باہم متماثل ہیں۔ کیا مکھیوں پر کام کرنے کی وحی کا نازل ہونا قرآن میں مذکور نہیں (سورہ 16/68) سید احمد کے نزدیک افعال خدا (یعنی فطرت اور فطری قوانین) اقوال خدا یعنی قرآن سے متماثل ہے اور یہ دونوں متضاد یا متصادم نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ مستقبل کے ایک مثالی مسلمان کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ پر ہو گا اور فطری علوم بائیں ہاتھ پر اور کلمہ طیبہ کا تاج سر پر ہو گا"

احمد خاں قرآنی احکامات کو معنوی گہرائی کی حامل سمجھتے تھے ان کی خوب صورت ترین تحریروں میں سے ایک نماز کی ادائیگی میں شامل حرکات کی علامتی تشریح پر ہے۔ جسے وہ عبادتوں میں سے افضل ترین سمجھتے تھے جبکہ دوسری طرف وہ انفرادی دعا کے سنے جانے کے قائل نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہر شخص کی دعا سنی اور پوری کی جانے لگے تو کائنات میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اگر انفرادی دعا کی بھی جائے تو اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ فرد میں تابعداری اور منشائے الٰہی پر راضی رہنے کا جذبہ پیدا ہو۔

احمد خاں کے اس نقطہ نظر کو ان کے قریب ترین دوستوں نے بھی نہیں مانا تھا۔

قادیانی فرقہ کے بانی غلام احمد قادیانی نے اس مسئلے پر سید احمد خاں پر جارحانہ حملے کئے تھے۔ دور اولیٰ کے کچھ معتزین کے ہاں بھی مذکورہ بالا نقطہ نظر ملتا ہے۔

سر سید جو اس وقت تک نائٹ کمانڈر آف دی سٹار آف انڈیا سے سرفراز کئے جا چکے تھے اور انہیں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری بھی مل چکی تھی ان میں ڈھونڈ نکالنا بہت آسان تھا انہیں اردو دان طبقے نے 'نیچری' کہا جس سے ان کی مراد ایسا شخص تھا جو قرآنی پیغام کے مافوق الفطرت پہلوؤں سے انکار کرے اور عقل محض کا شکار ہو جائے۔ ہندوستانی علماؤں نے ان کی مذمت بھی کی۔

پاکستان میں انہیں آج بھی نفاق انگیزی کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ وہ نماز میں پنہاں یگانگت کو ترقی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ان سب علماء سے زیادہ سخت رویہ جمال الدین افغانی نے اختیار کیا اور سید احمد خاں کو دہریہ اور انگریزوں کا پٹھو قرار دیا۔ لیکن اس فتویٰ کا تعلق سر سید کے یہاں اسلام اور ترک سلطان کو ساری دنیا کے مسلمانوں اور اس وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے بھی کا خلیفہ نہ ماننے سے ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک الگ ملت خیال کرتے تھے جسے ابھی پختگی کی ضرورت تھی وہ اپنے سرگرم معاون مولوی ذکاء اللہ کے اس خیال سے متفق تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو رہنمائی کے لئے بیرون ملک نہیں دیکھنا چاہئے۔

"ایک ہزار سال سے ہمارا اپنا مذہب اسلام ہند سے وابستہ ہے۔ اسلام نے

ہندوستان میں اپنی عظیم ترین کامیابیاں حاصل کیں اور اپنی ایک الگ تہذیب و تمدن کو جنم دیا"

سید احمد خاں سیاست میں اتنا کم دخل دیتے تھے کہ انہوں نے بدرالدین طیب جی کے کانگرس کا صدر بننے پر مسلمانوں کو سنجیدگی سے کانگرس میں شامل ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک تو انہیں اس تنظیم کا انگریزوں سے قدرے گستاخانہ رویہ پسند نہیں تھا اور دوسرے ان کا درست طور پر خیال تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے پر فرقہ واریت اٹھ کھڑی ہوگی اور مسلمان ہندو اکثریت کے غلام بن جائیں گے۔ مفید باہمی تعاون کے امکانات پر ان کے منفی احساسات کی ایک وجہ ہندی اردو تنازعہ تھا جو 1867ء میں ہندوؤں کے اس مطالبے سے شروع ہوا کہ عربی رسم الخط ترک کر کے ہندی رسم الخط اپنایا جائے۔ یہی وہ مقام تھا جب سید احمد خاں کو دونوں قومیتوں کے لئے مشترکہ تعلیمی پروگرام سے وابستہ امیدیں ترک کر کے صرف مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر توجہ مرکوز کرنا پڑی۔ اگرچہ مستقبل کی فرقہ واریت کی جڑیں اسی دور میں نظر آتی ہیں لیکن سر سید کو ہندوستان سے کوئی بغض نہ تھا۔ وہ ہندوستان کو ایک خوب صورت دلہن کہتے جس کی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان تھے۔ 1893ء میں انہوں نے یونائیٹڈ انڈیا پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (United India Patriotic Association) بھی بنائی۔ لیکن مسلم قومیت کے تصور کے بانی کے طور پر ان کا کردار آج بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق شاعرانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

"فرہاد نے شیریں اور نل نے دمن کو اس قدر نہ چاہا ہوگا جتنی محبت انہوں نے اپنی قوم سے کی۔ سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے ان کا یہی ایک ورد تھا۔ انہیں فنافی القوم کہا جائے تو قطعی مبالغہ نہ ہوگا"

درحقیقت انہوں نے ہی مسلمانان برصغیر کو ایک جدا اور متشخص گروہ ہونے کا احساس دلایا۔

سر سید انتھک کام کرنے والے تھے اردو میں ان کی تحریریں چھ ہزار صفات پر مشتمل ہیں انہوں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر رواں اور سلیس اردو کی ترویج کے لئے محنت کی لیکن ان کا خیال تھا کہ جدید مغربی تعلیم انگلش میں حاصل کرنا چاہئے کیونکہ اردو میں مبالغہ آرائی سے بچتے ہوئے ٹھوس حقیقت کو استعارے سے جدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ ولولہ

انگیز مقرر تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کرنے کے لئے اس مہارت سے یقینا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ ان کے سوانح نگار حالی نے اپنے رہنما کے خارجی اور باطنی کمالات بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیا تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید اس مشکل عبوری دور میں ایک مثالی رہنما کی تجسیم تھے۔ حالی نے 1898ء میں ان کی وفات پر مرثیہ لکھا جس میں یہ بات کہی گئی۔

اے عجب کز سوز اندوہ وفات مسلمی
مردم ہر کیش را آتش بجان اندافتند

سرسید کے گرد جمع بہت سے دوست رسالہ تہذیب الاخلاق نکالنے میں ان کی معاونت کرتے تھے ان میں سے ایک سید مہدی محسن الملک (1837-1907ء) شیعہ سے سنی ہوئے تھے۔ ان کی سرگرمیاں زیادہ تر حیدر آباد تک محدود تھیں۔ ان کے مصر کے مناروں (Manar) سے بھی روابط تھے۔ انہوں نے پرائمری یا کم از کم سیکنڈری سطح پر لازمی مذہبی تعلیم کی حمایت کی۔ تعلیم میں مذہب اور سائنس کے کردار پر ان کا نقطہ نگاہ سرسید سے زیادہ متوازن ہے۔ ان کا یہ خیال درست ہے کہ اسلامی تعلیمات کی جامد روایات کے باعث ہندوستانی اسلام پر ہندومت کے سائے پڑ رہے ہیں اسی سے مسلمانوں کو لاحق ایک اور خطرے یعنی ایک اجنبی ماحول میں اسلام کے مسخ ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ اس حوالے سے وہ ایک حد تک اقبال کے پیش رو ہیں۔ محسن الملک مسلم سیاست میں بھی معاونت کرتے تھے۔ انہوں نے 1900ء میں دوبارہ اٹھنے والے ہندی اردو تنازعے میں بڑا مضبوط نقطہ نظر اختیار کیا۔ اس دوران انگریزوں کی بے رخی سے ان کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے۔

محسن الملک کی اہمیت اپنی جگہ لیکن مغرب کے مستشرقین کو زیادہ دلچسپی چراغ علی کے کام سے تھی۔ یہ بھی محسن الملک کی طرح نظام کے دربار سے وابستہ تھے۔ جہاں 1895ء میں ان کی وفات ہوئی۔ سرسید کے ساتھیوں میں یہ سب سے زیادہ انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ انہوں نے مغرب میں قرآن اور اسلام پر ہونے والے کام پر معلومات اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ حدیث پر ان کے خیالات (Gldziher) سے ملتے جلتے ہیں جو اس نے چند سال پہلے علمی دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ حدیث پر ان کی تنقید اپنے سے پہلے کسی بھی دور کے مقابلے میں آگے نکل جاتی ہے لکھتے ہیں۔

"احادیث کے سیلاب نے جلد ہی عجب صورت حال پیدا کر دی۔ تمام اقسام کی لایعنیت اور جھوٹ ثابت کرنے کے لئے حضرت محمدؐ کا نام استعمال کیا گیا۔ غاصبوں نے اسے اپنے اقدامات کے جواز میں استعمال کیا"

سر سید کی طرح چراغ علی نے بھی فقہ کے جامد اطلاق کے خلاف آواز اٹھائی کیونکہ ان کے نزدیک قرآن دیوانی یا سیاسی ضابطہ قانون نہیں بلکہ ایک مذہبی کتاب ہے اور محمدؐ نے کبھی بھی مذہب اور سیاست کو یکجا نہیں کیا کہ

"ترقی اور بہتری کی تبدیلی کا انحصار قرآن میں بیان شدہ قوانین پر ہے نہ کہ شخصی فقہی قانون پر"

سید احمد نے کثیر الازدواجی کو کلی طور پر رد نہ کیا تو چراغ علی نے موقف اختیار کیا کہ اس کی تنسیخ قرآن میں بیان اصولِ مساوات کی ساخت میں شامل ہے۔ کیا کوئی شخص بیک وقت کئی عورتوں کو ایک جتنا چاہ سکتا ہے؟ انہوں نے ہی بعد میں آنے والی کئی مطبوعات کی راہ ہموار کی جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلام نے کئی نئے احکام سے عورتوں کو بلند معاشرتی مقام عطا کیا ہے۔

"عورتوں کی پسماندگی دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اِن کے نتیجے میں عورتوں کی معاشرتی حیثیت بحال ہوئی"

اگرچہ چراغ علی کے ہاں دانشورانہ گہرائی اور گیرائی نسبتاً کم ہے لیکن اپنے جرات مندانہ رویے کے باعث علی گڑھ تحریک کے ارکان میں سے ان کی شخصیت دلچسپ ترین ہے۔

لیکن جہاں وقار الملک، محسن الملک اور چراغ علی کی تحریریں جدید خیال مسلمانوں کے ایک حلقے تک محدود تھیں، سر سید کے ایک اور دوست عوام و خاص دونوں میں مقبول ہوئیں۔ ان کا نام الطاف حسین (1914-1837ء) اور تخلص حالی تھا۔ انہوں نے دہلی کے ایک مدرسے میں روایتی تعلیم پائی۔ غالب کے دوست تھے اور کچھ عرصہ شاعری میں ان سے اصلاح بھی لی۔ پھر لاہور میں انگریزی سے ہونے والے اردو ترجمہ کے اسلوب پر نظر ثانی کے لئے مامور ہوئے۔ اسی کام کے دوران انگریزی فکر سے واقفیت ہوئی۔ یہیں 1870ء کے بعد

کرنل ہالرائیڈ کے زیر اہتمام ہونے والی شعری نشستوں میں شرکت شروع کی۔ یہاں اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز آزاد بھی اپنی نظمیں پڑھتے تھے۔ حالی نے ان نشستوں میں جو نظمیں پڑھیں اردو دان طبقے کے لئے موضوع کے اعتبار سے نئی نہیں۔ ان میں "انصاف" اور "ایک بیوہ کی مناجات" بھی شامل تھیں۔ موخرالذکر میں ایک بیوی کی کسمپرسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ **1847**ء میں حالی بسلسلہ روزگار دہلی چلے گئے جہاں انہیں سرسید کے قریب رہنے کا موقع ملا جن کی انہوں نے بالاخر سوانح عمری (حیات جاوید) لکھنا تھی۔ **1879**ء میں انہوں نے "مدوجزر اسلام" لکھی جس نے انہیں لافانی کر دیا۔ یہ نظم مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس ہیئت کے مرثیے سے منسوب ہونے کی وجہ سے اردو دان طبقے پر اس کے اثرات فہمائش کے سے تھے۔ حالی کی یہ نظم تحریک احیائے ماضی اور سیاسی رومانویت کے اولین آثار میں شامل ہے۔ یہ اسلام کے دورِ اولیٰ کی شان و شوکت بیان کرتی ہے جو مسلمانانِ ہند کے غربت و عسرت پر قانع ہونے کی وجہ سے قصہ پارینہ بن گئی ہے۔

اس طویل نالہ و شیون میں وہ اپنے ہم وطنوں کو برا بھلا کہتا ہے کہ انہوں نے اپنی سابقہ عظمت کو فراموش کر دیا ہے۔ علماء میں رواداری نہیں ہے' طبیب جدید علوم کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں اور شعراء ایک دیوالیہ معاشرے کے طفیلی ہیں۔ بعد میں حالی نے اس نظم میں کچھ امید افزاء شعر بھی شامل کیے۔ یہ نظم جلد ہی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس نے مسلمانوں کو ان کی زبوں حالی کا احساس دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ ہندی مسلمانوں کی پہلی نظم تھی جس کا زور عشق حقیقی یا مجازی کی بجائے ٹھوس حقائق پر تھا۔ اپنی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں حالی نے روایتی شعراء پر بے رحمانہ تنقید کی وہ لکھنو کی غزل کو غیر اخلاقی لہجے میں محض پیچیدہ عشوہ گری خیال کرتے تھے۔ پیچیدہ شعری صنعتیں اور متصوفانہ بلند خیالی مسلمانوں کو بنیادی فرض یاد دلا سکتی ہے اور نہ ہی تابناک مستقبل کی راہ دکھا سکتی ہے۔ حالی کی طرح وہ بھی بیکار' اور اسی لئے مسموم' شاعری کی مذمت کرتا ہے۔

اردو کی نئی ابھرتی ہوئی ادبی صنف ناول میں بھی اسلام کی عظمت رفتہ کی طلب اور بہتر اور ارفع مستقبل کی امید نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی کے کچھ ہندی مسلمان مصنفین نے وکٹورین عہد کی تعلیمی کتب اور سر والٹر سکاٹ کے تاریخی ناولوں کی مثالیں اپنائیں۔ مصلح ناول نگاروں کا ایک اہم موضوع عورتوں کی حالت زار تھا۔ اس حوالے سے ناول لکھنے والوں

کے سرخیل ڈپٹی نذیر احمد (1912-1831ء) تھے۔ حالی نے بھی 1874ء میں "مجلس النساء" قائم کی تھی۔ اس معاملے میں ممتاز علی ان سب سے آگے نکل گئے۔ انہوں نے علی گڑھ سے رسالہ "تہذیب النسواں" نکالا اور اپنی کتاب "حقوق النسواں" میں خیال پیش کیا کہ عورتوں پر پردہ مسلط کرنا ناانصافی ہے۔ انہیں امید تھی کہ اس عبوری دور کے بعد ایک دن آنے والی نسلوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں مردوں کی ساتھی ہوں گی اور انہیں گھر میں وہ دلچسپی فراہم کریں گی جو آج میسر نہیں۔

نذیر احمد ایک سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے دوسری چیزوں کے علاوہ انکم ٹیکس ایکٹ اردو میں ترجمہ کیا ان کے ترجمہ قرآن کو بابائے اردو مولوی عبدالحق قرآن کا بہترین اردو روپ قرار دیتے ہیں۔ اپنے ناول "مراۃ العروس" میں انہوں نے مصلحین کے لئے ایک نمونہ قائم کیا۔ اس ناول میں وہ ایک برخود 'غلط' ست اور کاہل لڑکی کے کردار کا تقابل ایک محنتی اور چاک و چوبند لڑکی سے کرتے ہیں۔ جو اپنے خاندان کو خوش و خرم رکھتی ہے' اپنے شوہر کی اخلاقی مدد کرتی ہے اور اپنے کوارٹر میں لڑکیوں کی لکھائی پڑھائی کے لئے ایک سکول قائم کرتی ہے' ان دنوں باپردہ خواتین کے لئے گھر پر تعلیم کا انتظام اہم ترین موضوع تھا۔ لاہور کے ممتاز ماہر تعلیم جسٹس شاہ دین نے 1887ء میں تعلیم نسواں کی ابتر حالت کی طرف توجہ دلوائی اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح لڑکیوں کی بہتر تربیت کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ عالمانہ' جستجو نہ سہی لیکن لکھنے پڑھنے' حساب کتاب' حفظانِ صحت اور امورِ خانہ داری جیسی بنیادی مہارتیں لڑکیوں کو بہر حال سکھائی جانی چاہئیں۔ مصلحین ایک مثالی عورت میں جو صفات دیکھنا چاہتے ہیں انہیں ایک نظم کی گڑیا میں تجسیم کیا گیا ہے۔

متوسط طبقے کے دیندار گھرانے میں خواتین عام طور پر قرآن حفظ کرتی تھیں اور احادیث کے اردو ترجمے کی "مشکوٰۃ الصباح" اور "مشارق الانوار" جیسی کتابیں بغور پڑھتیں تھیں۔ بعض اوقات وہ فارسی بھی سیکھتیں۔ اس نظم کی ہوشیار گڑیا بھی کھانا پکانے اور حساب کتاب کی ماہر ہے۔ بالآخر اس کی مہمان نوازی سے ہی اس کے خاوند کی کشادہ دلی اور کامیابی کا پتہ چلے گا۔

انیسویں صدی کے اصلاحی ناولوں میں لڑکیوں کا ایک سکول لازماً شامل کیا جاتا تھا۔ سندھ میں جہاں کراچی میں ترکی کے اعزازی قونصلیٹ حسن علی آفندی نے علی گڑھ کی

طرز پر سندھ مدرستہ الاسلام قائم کیا تھا' سندھی کے ایک انتھک مصنف مترجم مرزا قلیچ بیگ نے 1892ء میں ایک ناول زینت شائع کیا۔ اس ناول میں وہ بچپن کی شادی کے خلاف بات کرتے ہیں کہ یہ لوگوں کو جلد کمزور کر دیتی ہے۔ وہ اس ناول میں اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ اپنی ہیروئن سے پردہ اور نقاب ترک کروا دیتے ہیں۔ یہ خاتون ابتداء میں اپنے شوہر کی اس تجویز کو رد کرتی ہے یہ پردہ دار خواتین کا مخصوص رویہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے اندر محفوظ بیرونی دنیا سے تعلق رکھے بغیر شاید جدید عورت پر ترس کھاتی ہیں" جسے اپنا ہینڈ بیگ بھی خود اٹھانا پڑتا ہے" اور جسے خریداری کے لئے بازار کی بھیڑ میں دھکے کھانا پڑتے ہیں جبکہ اچھے گئے دنوں میں "بازار خود گھر آجایا کرتا تھا۔ قلیچ بیگ نے مسئلے کا جو حل پیش کیا وہ تب حیران کن رہا ہو گا۔ کیونکہ سندھ کی معزز خواتین ملک کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ سخت پردے میں زندگی گزارتی تھیں لیکن اس کے باوجود صدی ختم ہونے سے پہلے اللہ بخش ابوجھا نے کراچی میں لڑکیوں کا سکول قائم کر دیا۔ اس سارے کام میں بمبئی اور کراچی کی ان بے شمار پارسی خواتین کی مثال نے بھی اہم کردار ادا کیا جو بے پردہ گھومتی اور اردو تھیٹر سے لے کر ہسپتالوں اور سکولوں تک میں نہایت عمدہ صلاحیت تک کا مظاہرہ کرتیں۔ برطانیہ کی بادشاہت ایک عورت کے پاس ہونے نے بھی اصلاح پسندوں کی عورتوں کی صلاحیتوں کو تسلیم کروانے کی کوششوں میں مدد دی۔ ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی مسلم دیسی ریاست بھوپال کی حکومت ایک خاتون نہایت عمدگی سے چلا رہی تھی۔

ان سارے تعلیمی ناولوں کے پلاٹ اکہرے تھے اور بقول ڈاکٹر محمد صادق ان سب کے ہیرو اور ہیروئنیں "خیر کے مافوق الفطرت پیکر" تھے۔ لیکن ان کا یہ رجحان وکٹورین' انگلینڈ اور جرمنی کے مثالی خاکوں سے مستعار تھا۔ اسی طرح سرسید بلکہ سید امیر علی کے زمانے ہی سے ممتاز مسلمان عورتوں کی اردو اور انگریزی میں لکھی گئیں قابلِ تقلید سوانح عمریاں خاصی مقبولیت پا چکی تھیں۔

نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں کثرتِ ازدواج کے برے نتائج اور تعلیم کی ضرورت کو کامیابی سے بیان کیا تھا۔ انہوں نے انگریز اور ہندوستانی قارئین سے دادِ تحسین وصول کی۔ اردو ناول میں پہلی بار ایک عام متوسط درجے کے گھرانے کو فطری مکالمات کی صورت پیش کیا گیا تھا۔ اب پڑھنے والوں نے جنوں پریوں کے قصوں سے بنائی گئی فارسی اور اردو داستانوں

کی رومانوی دنیا کو بحیثیت مجموعی مسترد کر دیا تھا۔ مقاصد کی ہم آہنگی کے باوجود نذیر احمد سر سید کے مغرب نواز رویے سے پوری طرح متفق نہیں تھے۔ ان کے ناول "ابن الوقت"" میں ایک نوجوان مسلمان خود کو مکمل طور پر غیر ملکی مفادات کے حوالے کر دیتا ہے اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی میں ہندوستان میں ہونے والی معاشرتی' مذہبی بحثوں میں ذرائع ابلاغ نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ 1877ء میں اپنا آغاز کرنے والا "اودھ پنچ" سر سید کی کھل کر مخالفت کرتا تھا اردو کے بہترین طنز نگار نے اپنی بیشتر شاعری اسی وسیع الاشاعت رسالے میں چھپوائی۔ یہ طنز نگار اکبر الہٰ آبادی (1846ء۔1921ء) تھے جو جج ہائی کورٹ کے مرتبے تک پہنچے۔ ان کی تربیت لکھنو کے نہایت نستعلیق ماحول میں ہوئی تھی۔ واحد مسلمان مصنف ہیں جنہوں نے جدیدیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے والے مسلمانوں اور اسلام کی روح سے زیادہ خارجی وضع قطع اختیار کرنے والے "منافق" مسلمانوں پر اپنی عمدہ شاعری میں سخت تنقید کی۔

اپنے ایک شعر میں وہ حافظ کا نیم مصرع استعمال کرتے ہوئے ڈارون کے نظریے کو شہیدِ محبت منصور حلاجؒ کی بلند خیالی کے تناظر میں دیکھتے ہوئے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں
بولا ڈارون بوزنہ ہوں میں
یہ سن کے کہنے لگے میرے اک دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

یہاں ہمیں Thus Spake Zarathastra(1883ء) میں نٹشے کے الفاظ ضرور یاد آتے ہیں۔ اکبر کو ان خیالات کا یقیناً علم نہیں تھا۔ تیس برس بعد 'اقبال کو ان کی یقیناً خبر ہو گئی جس کے کلام کے کچھ حصے میں حلاج مرد حقیقی کی مثال کے طور پر آیا۔

علی گڑھ سے وابستہ افراد میں سب سے روایت پسند شبلی نعمانی تھے جو اپنے اس رویے کے باوجود سولہ برس (1882ء۔1898ء) تک علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ شبلی نعمانی (1854ء۔1914ء) اردو میں تاریخ نگاری کے بانی ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم فقہ میں ہوئی۔ ہندوستان سے باہر کے پہلے پہل کے سفر میں ان کی ملاقات دمشق

میں نقشبندی بزرگ خالد الکردی سے ہوئی۔ یہ مظہر جانِ جاناں کی روایت پر عمل پیرا تھے اور انہوں نے سلطنت عثمانیہ میں سرہندی کے خیالات پھیلانے کے لئے کام کیا۔ شبلی نے قاہرہ میں محمد عبدہ سے بھی تعلقات استوار کئے۔ ان کی تصانیف سے جہاں ان کے اپنے نظریات کا پتہ چلتا ہے وہاں تبحر علمی بھی جھلکتا ہے۔ انہیں امید تھی کہ اسلام کا احیاء خود اس کے اندر سے کیا جا سکتا ہے۔ سر سید کے بر عکس "انہوں نے مغربی اقدار کو اسلامی نقطہ نظر سے سمجھا" ان کے کئی ہیروؤں میں سے ایک ابو حنیفہؒ تھے اور ان کے نام کا ایک حصہ نعمان' شبلی نے اپنے نام کے ساتھ لگا لیا۔ انہیں عمر فاروقؓ ایک مثالی حکمران نظر آتے تھے جن کے طرز حکومت میں مساوات اور انصاف کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ انہیں غزالی میں راسخ العقیدگی اور تصوف کا ایک امتزاج نظر آیا جو ان کے اپنے رویے کے بہت نزدیک تھا۔ انہوں نے مولانا رومی کو بھی اپنی تصنیفات کا موضوع بنایا۔ انہوں نے پہلی بار رومی کے مشہور شعر کے متعلق یہ کہا کہ اسے تناسخ کا بیان خیال کرنے کی بجائے ڈارون کے سے ارتقائی نظریات کا مظہر خیال کرنا چاہئے۔ شبلی کا آخری کام سیرت النبیؐ ہے جسے وہ مکمل نہ کر سکے۔ اردو کی اس پہلی سیرت النبی کو ان کی موت کے بعد بے وفا دوست سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔

شبلی، جنہوں نے فارسی شاعری پر ایک شوق انگیز تصنیف "شعر العجم" لکھی خود بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ کچھ نظمیں مسلم علاقوں میں غیر ملکی جارحیت پر لکھی گئیں اور کچھ عطیہ بیگم سے منسوب ہیں۔ بمبئی کی یہ نوجوان بوہرہ خاتون اقبال کے سفر جرمنی میں ان کے ہمراہ تھیں۔ 1894ء میں شبلی نے ہندوستانی اسلامی اداروں کے روایتی نصاب پر کڑی تنقید کی۔ جس میں کتابی عبارات سے چمٹے رہنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اور یونانیوں کے بعد دریافت ہونے والی کوئی بھی نئی چیز اس میں شامل نہیں تھی۔ اس لئے شبلی نے لکھنو میں ندوۃ العلماء نامی ایک ادارہ تحقیق قائم کیا۔ جس کا مقصد علی گڑھ کی بے جا جدیدیت اور دیوبند کی روایت پرستی کے درمیان راہِ اعتدال دریافت کرنا تھا۔ اس کا ایک مقصد مختلف مسالک کے علماء کو باہم قریب لانا بھی تھا۔ یہ پہلا ہندوستانی ادارہ تھا جس نے تنقید کے جدید طریقے اختیار کئے۔ اس کے اغراض و مقاصد اس کی پچاسویں سالگرہ پر چھپنے والے پمفلٹ کے مطابق مندرجہ ذیل تھے۔ انگریزی اس کے نصاب میں شامل تھی۔ وہاں افریقہ، برما، ملایا، تبت، نیپال، مڈغاسکر اور کئی دوسرے ممالک سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ شبلی کی سرگرمیوں کا

ایک اور نتیجہ دار المصنفین اعظم گڑھ تھا۔ یہ ادارہ ان کی وفات کے فوراً بعد قائم کر دیا گیا تھا اردو کا ایک مفید رسالہ معارف یہیں سے نکلتا ہے۔

جہاں سر سید اور ان کے رفقاء اپنے خیالات ہندوستانی مسلمانوں میں بذریعہ اردو تصانیف پھیلانا چاہتے تھے۔ وہاں ایک مفکر یورپ کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی کتب انگریزی میں لکھیں تاکہ مغرب کو اسلامی عظمت اور شان و شوکت کا قائل کر سکے۔ یہ سر سید کے نوجوان معاصر سید امیر علی تھے جن کا تعلق بنگال کے ایک شیعہ خاندان سے تھا۔ انہوں نے ہگلی کالج میں تعلیم پائی اور کرامت علی جونپوری کے خیالات سے متاثر تھے۔ جب 1869ء میں احمد خاں انگلینڈ گئے امیر علی بھی وہیں تھے۔ جہاں سے انہوں نے 1893ء میں بار ایٹ لا کیا۔

1877ء میں وطن واپسی کے بعد انہوں نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ جس کا مقصد "ہندوستانی نسلوں اور فرقوں میں ہم وطنی اور باہمی فلاح کے خیالات کو فروغ دینا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مفاد کا لفظ اور ان کی سیاسی تربیت" تھا۔ ان کی کچھ کتابیں اینگلو محمڈن لاء پر معیاری تصانیف خیال کی جاتی ہیں۔ 1983ء میں وائسرائے کونسل کے منتخب ہونے والے تین ارکان میں سے ایک امیر علی تھے۔ 1909ء میں انہوں نے لندن میں سکونت اختیار کی جہاں 1928ء میں ان کا انتقال ہوا۔

اپنے پہلے قیام لندن کے دوران امیر علی نے محسوس کیا کہ انہیں انگریزی میں محمدؐ پر لکھی گئی ایک انگریزی کتاب کا جواب دینا چاہئے۔ اس ضمن میں انہوں نے کتاب کا مواد جمع کرنا شروع کیا اور 1891ء میں "سپرٹ آف اسلام" منظر عام پر آئی۔ جس پر ان کی شہرت کا دارومدار ہے۔ یہ اسلام کی ایک آزاد خیال اور جدید تشریح ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شیعہ پس منظر سے تعلق رکھنے کے باوجود امیر علی نے اس کتاب میں پہلے تین خلفاء کی تعریف و توصیف کی۔ انہوں نے شکوہ اسلام کی ایک رنگین منظر کشی کی۔ سر سید کے مقابلے میں اس تمدن کے مذہبی پہلوؤں پر ان کے جذبات زیادہ شدت کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ایک پر شکوہ عالی مرتبت جدید مذہب اور ایک تہذیبی قوت ہے۔ جہاں سر سید نے یہ کہا کہ اسلام ترقی سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہاں سید امیر علی نے دعویٰ کیا کہ اسلام بجائے خود ایک ارتقاء ہے کیا محمدؐ عیسیٰؑ سے برتر نہیں تھے کہ انہوں نے غیر مکمل کام کی تکمیل کی؟ کیا ازمنہ

وسطیٰ کا مسلم تمدن عیسائی تمدن سے ہر طرح برتر نہیں تھا؟ وہ سپین کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "سپین جو کبھی علم و ہنر کا گہوارہ تھا' صدیوں کی ضوفشانی کے بعد یوں اجڑ نہ گیا ہوتا...... عیسائیت نے مسلمانانِ اہل اندلس کو ملک سے دھکیل دیا اور سپین سے زندگی کی ہر رمق چھین لی اور اسے علم و دانش کا قبرستان بنا دیا"

سید امیر علی کی کتاب "A Short History of Saracens (1899ء) اسی ایقان کی پیداوار ہے۔ مسلم سپین میں دلچسپی مسلمانوں کی اصلاحی احیائی تحریک کی خصوصیت یہ ہے۔ حالی کی مسدس کے وقت سے لے کر اسے بے شمار ناولوں اور نظموں کا موضوع بنایا گیا۔ اقبال کی عظیم نظم مسجد قرطبہ جزیرہ نمائے البیریا کے شاندار مسلم ماضی کی تڑپ کا آخری بڑا اظہار ہے ایک طرف امیر علی کی کتاب اور دوسری طرف شبلی کی سیرت النبیؐ عذر کے بعد حیات محمدؐ میں ایک نئی دلچسپی کی شاندار مثالیں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط اور وسیع ہوتی چلی گئیں۔ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کا سامنا تھا۔ جن کا پیغمبر اسلامؐ کے حوالے سے رویہ بہر حال دوستانہ نہیں تھا۔ اس لئے یہ بات قابلِ فہم ہے کہ انگلش میں محمدؐ کی پہلی سوانح عمریوں نے مصنفین کو مشتعل کر دیا۔ چونکہ مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ وہ ہمیشہ عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کا احترام کرتے رہے ہیں۔ انہیں مغربی مطبوعات میں اپنے نبی کی شخصیت مسخ کئے جانے پر یقیناً شدید صدمہ ہوا ہو گا۔ مشنری سکولوں سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ ول فریڈ کینٹ ویل سمتھ نے بڑے جامع انداز میں 1880ء کے بعد مسلم ہند میں پیغمبر اسلام پر لکھے گئے ادب کی اہمیت بیان کی ہے۔ اس تحریک کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ نہ صرف مقامی زبانوں کی عوامی شاعری بلکہ اعلیٰ فارسی اور اردو ادب میں بھی انہیں محبوب خدا اور شافع محشر قرار دیا گیا اور ان کی ذات سے معجزے منسوب کئے گئے۔ دلی کے عظیم علماء نے بھی اٹھارہویں صدی میں اپنی الٰہیات انہیں کے گرد مرتب کی کیونکہ جب تک ان پر ایمان کا قرار نہ کیا جائے اسلام ایک منفرد مذہب نہیں بنتا۔ شاہ ولی اللہ اور مظہر جانِ جاناں انہیں معمارِ ملت سمجھتے تھے اور درد نے طریقہ محمدیہ کو پروان چڑھایا جس نے 1820ء کی دہائی میں مجاہدینِ آزادی کو متاثر کیا۔ اسی دور میں شمالی افریقہ میں تجانیہ اور سنوسی کی تحریکیں بھی محمدؐ کی ذات کے گرد قائم ہوئی۔ بطور ایک حقیقی رہنما کے

محمدؐ کی مدح پہلے سے بھی زیادہ کی جانے لگی۔ سر سید جیسے جدت پسندوں نے ان کی ذات پر صدیوں سے پڑے داستانوی پردے ہٹائے۔

مصلحین نے اپنے ہم مذہبوں کو بتایا کہ محمدؐ کی حیات مقدس کا مطالعہ فقط مذہبی رسوم کی تفصیلات جاننے کے نقطہ نظر سے نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ان کی زندگی کو مکمل اور بھر پور طور پر ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے زیر مطالعہ رکھنا چاہئے۔ انیسویں صدی کے پروٹسٹنٹوں کی طرح، جنہوں نے مسیح کی سریت کی بجائے Leben Jesure پر زور دیا تھا، پیغمبر اسلام کی تعظیم ذات کے مختلف زاویوں کا اجتماع اقبال کے "جاوید نامہ" میں نظر آتا ہے۔

تم خدا سے مل کر ہو سکتے ہو مگر محمدؐ سے نہیں

مسلم ہندوستان پر مغربی نظریات اور رسوم و رواج کے تجاوزات پر ہونے والے رد عمل مختلف طریقوں سے سامنے آئے۔ لیکن شاہ ولی اللہ کا نام سر سید کے تعقل خلاف مافوق الفطرت سے لے کر قدامت پسندوں تک ہر تحریک میں ملتا ہے۔ راسخ العقیدہ گروہوں میں سے ایک اہلحدیث کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ صرف قرآن اور مستند احادیث کو ہی زندگی کا صحیح رہنما مانتے تھے اور اسی لئے وہ اجماع کی پابندی ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ مسلک برصغیر کے غالب حنفی مسلک سے الجھ گیا۔ حنفیوں کو اعتراز تھا کہ اہلحدیث ابو حنیفہؒ (اور درحقیقت چاروں فقہی مسلک کے آئمہ) سے محترز کیوں ہیں؟ بعد ازاں (سندھ میں 1920ء میں) یہ مخاصمت کبھی کبھار سیاسی چپقلش میں بھی نمودار ہوئی اگرچہ اہلحدیثوں نے، وہابیوں کی طرح، تصوف کو یکسر مسترد نہیں کیا لیکن یہ پیر پرستی کے خلاف تھے۔ اس لئے انہیں شعوری رجحانات پر عمل پیرا مسلک کہا جا سکتا ہے یہ اسلام میں خصوصاً ہندو اثرات کے تحت در کر آنے والی نئی رسومات یعنی بدعات کے خلاف تھے۔ اہلحدیثوں کے ممتاز ترین اور کثیر التصانیف رہنما صدیق خان ایک متنازعہ شخصیت تھے۔ صدیق خاں ایک ایسے غریب گھرانے میں پیدا ہوئے جو مخدوم جہانیاں کی اولاد ہونے کا دعویدار تھا۔ ان کے والد شیعہ تھے اور شاہ ولی اللہ کے ایک بیٹے کے شاگرد جن کے زیر اثر وہ سنی ہو گئے اور سید احمد بریلوی کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے۔ صدیق خان دہلی میں مشہور مفتی صدر الدین آزردہ (متقی 1868ء) کے شاگرد رہے جو غالب کے دوست تھے۔ 1859ء میں انہیں بھوپال کی تاریخ

لکھنے پر مامور کیا گیا جو رام پور کی طرح ایک مسلم ریاست تھی جہاں 1857ء کے بعد باکمال دانشور کھنچے چلے آئے تھے۔ اس وقت بھوپال پر سکندر بیگم کی حکومت تھی اس باکمال خاتون کے بعد اس کی بیٹی شاہجہان بیگم والئی ریاست بنی۔ صدیق خان کی شادی اگرچہ بھوپال کے وزیر اعظم کی بیٹی سے ہوئی جن سے ان کے کئی بچے بھی تھے لیکن 1870ء میں شاہجہان بیگم سے ان کی شادی کر کے بہاولپور کا نواب منتخب کر لیا گیا۔ بیوہ شہزادی کی اس شادی نے اضطراب کی فضا پیدا کر دی۔ اس کی ایک وجہ تو بیوہ کی شادی کے خلاف پایا جانے والا تعصب تھا اور دوسرے صدیق خان نے اس شادی کو اپنے مرشد احمد شہید کی بیوہ سے شادی کی مثال پر عمل کے لئے استعمال کیا تھا۔ اگرچہ شہزادی نے پردہ اختیار کر لیا لیکن وہ اپنے خاوند کے ذریعے حکومت چلواتی تھی۔ شہزادی کے خاندان نے "قنوج کے اس مولوی" پر سخت تنقید کی۔ انہیں شہزادی کے فیصلے پر اعتراض تھا۔ 1885ء میں برطانیہ نے اسے پین اسلامی پروپیگنڈے کے شبے میں معزول کر دیا۔ برطانوی پریس نے اسے "قلاش مہم جو" قرار دیا۔ 1890ء میں صدیق حسن خاں کا انتقال ہو گیا بھوپال کی نسوانی جانشینی مزید ایک نسل تک کامیابی سے چلتی رہی اور دربار ادبی اور مذہبی سرگرمیوں کا مضبوط گڑھ بن گیا۔

مذہبی موضوعات پر اس نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ جو زیادہ تر حدیث پر ہیں۔ اس وجہ سے ایک بنگالی عالم حدیث اس کا ذکر "ہندوستانی سیوطی" کے طور پر کرتا ہے۔

انہوں نے کوشش کی کہ قدیم صوفیانہ تصورات، جنہیں قرآن میں اسلام، ایمان اور احسان کے سہ گونہ راستے کی صورت بیان کیا گیا ہے، کو یکجا شکل میں پیش کریں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ رسمی عبادات مفصل جزئیات سمیت ادا کی جائیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک پر امن گھریلو زندگی کا مثالی نمونہ پیش کرنے کی کوشش بھی کی۔ چونکہ ان کا آخری کام عبدالقادر جیلانیؒ کی "فتوح الغیب" کا ترجمہ تھا اس لئے انہوں نے یقیناً تصوف کی مذمت نہیں کی ہو گی بلکہ وہ صوفیانہ تجلیات کو ممکن مانتے تھے اور اکثر اپنی خوابوں اور رویاء کا ذکر کرتے تھے۔ تاہم انہوں نے بعض صوفیاء کی مبالغہ آمیز قیاس آرائی کو خطرناک قرار دیا۔ تصوف نے برصغیر میں اشاعت اسلام میں مفید اور اہم کردار ادا کیا تھا۔ لیکن اس نے متصوفانہ فلسفے کے رجحانات کو اتنا مضبوط کر دیا کہ روحانی اور فطری پہلوؤں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی جو ابتدائی اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ صدیق خان کے اپنے افکار کی جڑیں شاہ ولی اللہ کے

مکتبِ فکر میں ہیں (درحقیقت حجۃ البالغہ کی پہلی چھپائی پتھر چھاپ Lithograph پر سب سے پہلے 1868ء میں بھوپال میں ہوئی۔

"ہندوستان میں مجھے فقط سید احمد شہید کے پیروکار ملے ہیں۔ انہوں نے کئی لوگوں کو اسلام کی اصل راہ پر لگایا ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے طریقہ محمدیہؐ اختیار کیا۔ لگتا ہے کہ وہ اپنے رسالہ "اقتراب اساسات" میں جس خاموش طرز عمل کی طرفداری کرتے ہیں' میر درد کے "رسالہ" سے ماخوذ ہے۔ ان کے عہد میں بھوپال میں جو مذہبی کلاسیک چھپے ان میں میر درد کی کتب بھی شامل تھیں۔

"اس دور خرابات میں ہر کسی کو اپنا تیر و تفنگ پس پشت ڈال دینا چاہئے۔ نہ کسی کو ہلاک کرنا چاہئے نہ کسی کی ہلاکت میں حصہ دار بننا چاہئے۔ شورش پھیلانا چاہئے نہ کسی کو اس کا مشورہ دینا چاہئے......
موجودہ دنیا ایک خواب وخیال ہے اور اس میں رہنے والے مسافر ہیں۔
آج انتشار کو اسلام کا نام دیا جاتا ہے اور اسے اصلاح کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔"

اپنی اس کتاب میں انہوں نے وہ فتنے گنوائے ہیں جو دجال کے ظہور کی نشانیاں ہیں۔ اس حوالے سے وہ شیعہ مسلک کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان نشانیوں میں سرسید اور مرزا غلام احمد بھی شامل ہیں۔ جن میں سے اول الذکر ان کے نزدیک "فطرت پرستوں کا پیغمبر جدید" ہے۔ ستم یہ ہے کہ عورت کی حاکمیت کو قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک قرار دینے والا شخص ایک حکمران خاتون سے شادی کر لیتا ہے۔ اہلحدیث کے کچھ معتقد نہایت سرگرم تھے۔ ایک آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرس قائم کی گئی۔ جس کا مرکز دلی میں تھا۔ اس کی پہلی میٹنگ 1912ء میں منعقد ہوئی۔ اس اہلحدیث مرکز میں سید ناظر حسین نے نصف صدی تک درسِ حدیث دیا۔ انہیں ایک چھوٹے گروہ "اہلِ القرآن" کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا جو قرآن کو مکمل ترین اور واحد سرچشمہ دین خیال کرتے تھے۔

مسلم فکر کی تشکیل میں ان گروہوں سے بہت زیادہ اور موثر حصہ دیوبند میں قائم ہونے والی دینی درسگاہ کا تھا۔ اس مدرسے کے روحانی سرپرستوں میں سے اولین شاہ ولی اللہ

تھے۔ جبکہ حاجی امداد اللہ (1815ء۔1899ء) نے اس ادارے کے قیام کی شروعات کیں۔ یہ کرشماتی رہنما متصوفانہ رجحانات رکھتے تھے اور چشتیہ صابریہ سلسلے سے متعلق تھے۔ 1857ء کی بغاوت میں بھی انہوں نے خاص کردار ادا کیا۔ جب ان کی مسجد جلادی گئی تو انہوں نے اعلانِ جہاد کر دیا۔ بعد ازاں ہجرت کر کے مکہ چلے گئے جہاں درس دیتے رہے جو ابتداء زیادہ تر مولانا روم کی مثنوی پر تھا۔ حج کے لئے مکہ آنے والے بہت سے نوجوان ہندوستانیوں کو متوجہ کیا اور دیوبندیوں کے ایک پیکر پدری بن گئے لیکن مکتب کی عمارت کی باقاعدہ بنیاد حاجی محمد عابد حسین نے دلی کے شعبہ تعلیم کے تین علماء کی مدد سے رکھی۔ اس کے سرپرست پرنسپل مولانا نانوتوی (1823ء۔1880ء) تھے۔ جو دلی کالج کے مملوک علی کے بھتیجے اور امداد اللہ کے مرید تھے۔ اپنی ایک چھوٹی سی فارسی نظم میں یہ غرقِ معاصی روح تصوف کے عین مطابق بحضورِ خدا عین گڑگڑاتے ہیں۔

درو نم رلبہ عشق خویشتن سوز
بہ تیر درد خود جان و رسم دوز
دلم راحو یاد خویش گردان
مراحب مراخویش گردان

انہوں نے رشید احمد گنگوہی کے ساتھ دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا جس کے روایتی نصاب میں جدید علوم اور انگریزی شامل نہیں تھے۔ پورا کورس پہلے دس سال پر محیط تھا جسے بعد ازاں کم کر کے چھ سالوں کا کر دیا گیا۔ یہاں کا فارغ التحصیل ایک سو چھ کتابوں پر عبور رکھتا تھا اعلیٰ فارسی کے نصاب میں رومی کی مثنوی سے اقتباسات شامل تھے۔ مولانا نانوتوی نے دیوبند کے جو آٹھ بنیادی اصول طے کئے ان میں چشتیوں کا سرکاری امداد سے گریز اور فتوح پر ایمان جھلکتا ہے۔

"جب تک مدرسہ کا کوئی باقاعدہ اور مقررہ ذریعہ آمدن نہیں بنایہ قائم رہے گا۔ انشاء اللہ' بشرطیکہ توکل اختیار کیا جائے اور اِس کی رحمت سے مایوس نہ ہوا جائے"

1893ء میں دارالفتاویٰ قائم کیا گیا جس نے اگلی کئی دہائیوں تک بے شمار فتاویٰ جاری کئے ہندوستان کے مختلف مدارس علیحدہ علیحدہ شعبہ ہائے دینی تعلیم میں اختصاص رکھتے

تھے۔ دہلی تفسیر اور حدیث، لکھنو فقہ اور خیر آباد کلام کے لئے مشہور تھے۔ لیکن دیوبند مشرق کی ازہر ہونے کا فخریہ دعویٰ کرتے تھے جس کا منتہائے مقصود مذہبی علوم کے تمام پہلوؤں کا امتزاج اور ایک "مذہبی شخصیت کی تعمیر" کرنا تھا یہ اور بات ہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل کو سرکاری ملازمت ملنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ دیوبند کے بانیان سرسید کو سم قاتل تصور کرتے تھے اور انہوں نے 1874ء میں اس کے طے کردہ پندرہ اصولوں کی تکذیب کی تھی۔ اسی ردعمل میں سرسید کی کانگرس مخالفت نے ان کے اندر کانگرس کے لئے ہمدردی پیدا کر دی اور انہوں نے برصغیر میں علیحدہ مسلم ملت کی حمایت نہ کی لیکن قومیت پرستانہ خیالات کے باوجود یہ آریہ سماج اور اس کی لوگوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی حکمتِ عملی کے خلاف لڑے۔ اس جدوجہد میں اصل اسلامی نظریات اور اقدار منظر عام پر آئیں۔ چنانچہ رشید احمد گنگوہی "جو اپنے دوستوں کی نسبت تصوف کی طرف زیادہ مائل تھے" فلسفے کی قدیم صوفیاء کی طرح شدید مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میری رائے میں فلسفہ بیکار مضمون ہے۔ یہ شریعت کی مناسب تفہیم کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس کے بعد زیر اثر انسان ملحدانہ افکار کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور فلسفہ کی تاریکیوں میں کھو جاتے ہیں۔ مدارس میں ان شیطانی مضامین کو ممنوع قرار دے دینا چاہئے"

یہ ایک اقامتی درسگاہ تھی جس میں پندرہ سو طالب علموں کی رہائش کا انتظام تھا۔ جن میں سے زیادہ تر نادار طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔

قبائلی علاقے سے طلباء یہاں حصولِ علم کے لئے آتے تھے۔ بعد ازاں اسلامی دنیا کے کونے کونے سے طالب علم یہاں آئے۔ انہیں عربی، فارسی اور اردو کتابوں کے نہایت عمدہ ذخیرے سے استفادے کا موقع ملا جن میں زیادہ تر اشاعتی اداروں سے تحفتاً آئیں تھی۔ ان اداروں میں سے لکھنو کا نول کشور پریس قابلِ ذکر ہے جس نے ہندو ہونے کے باوجود فارسی اور اردو کی بے شمار کلاسیک تصانیف سنگی چھاپ پر طبع کر کے ان زبانوں کی بیش بہا خدمت کی۔

دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے والے علماء میں سے ایک اشرف علی الفاروقی تھانوی (1836ء۔1943ء) تھے۔ دورانِ حج انہوں نے حاجی امداد اللہ کے ہاتھ پر چشتیہ

سلسلہ میں بیعت کی اور ہندوستان واپسی پر تھانہ میں بھون سکونت اختیار کی۔ ان کی بے شمار تصانیف ہیں۔ جن میں ایک طرف قرآن کی بارہ جلدوں پر مشتمل تفسیر (مطبوعہ دلی 1916ء) اور دوسری طرف ابنِ عربی کے دفاع میں لکھے ہوئے رسالے ہیں۔ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ابنِ عربی نے شرح محمدی اور عبادتِ اسلامی کا پرچم بلند کیے رکھا۔ اور مخصوص اور فتوحات میں ان کی تحریروں کا ازالہ ان کے دوسرے خیالات سے ہو جاتا ہے۔
لیکن تمدنی نقطہ نظر سے ان کی دلچسپ ترین تصنیف بہشتی زیور ہے۔ دس جلدوں پر مشتمل یہ کتاب نسوانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے اور ہندی مسلمانوں کے تمدن اور تعلیم نسواں کے خزینے میں ایک اہم اضافہ ہے عام طور پر اسے لڑکیوں کو جہیز میں دیا جاتا تھا۔
جب محمود الحسن دیوبند کے سربراہ بنے تو یہ مدرسہ اپنی ترقی کی معراج پر پہنچ گیا۔
علی گڑھ کے بالائی متوسط طبقے کی فضا کے برعکس دیوبند عوامی بے چینی کا مرکز تھا جس کی وجوہات میں سے ایک اس کی ابتدائی غربت اور حکومتی امداد سے انکار تھا۔ دیوبند کی فضا سے متاثر ہو کر علماء کے ایک گروہ نے "جمعیت العلمائے ہند" قائم کی جس نے آگے چل کر فکری سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان عملی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

ء

نئے راستوں کی تلاش میں پیدا ہونے والی آخری اور مشہور ترین تحریک احمدیہ تحریک تھی جسے مرزا غلام احمد قادیانی نے قائم کیا۔ اس کے منظر عام پر آتے ہی پنجابی اور اردو میں اس کے خلاف یا حق میں بے شمار رسالے تصنیف کیے گئے سر سید نے ان تحریروں میں حصہ نہ ڈالا کیونکہ

"اس از کار رفتہ تحریک میں کچھ نہیں رکھا۔ میں مسیحا کے ظہور پر کچھ
نہ لکھوں گا۔ اس کی بنیاد ہی من گھڑت کہانیوں پر ہے"

لیکن جیسا کہ بعد میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے ثابت ہوا اس "مہمل تحریک" کو مسلم دنیا میں بے چینی کا سبب بنتا تھا۔ اسے مسلمانوں اور غیر مسلم ہر دو نے ہر ممکن مثبت اور منفی انداز نظر سے دیکھا حتیٰ کہ خزاں 1975ء میں اسے مکہ میں غیر اسلامی قرار دے دیا گیا جس کی تقلید بعد میں پاکستان اور دوسرے مسلمان ممالک نے کی۔
مرزا غلام احمد قادیانی ایک پنجابی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کی

وفات 1908ء میں ہوئی۔ پہلے پہل انہیں غیبی آوازیں سنائی دینے لگیں جنہیں اس نے 1880ء میں چالیس سال کی عمر میں "براہینِ احمدیہ" کے نام سے قلمبند کیا۔ نو سال کے بعد اس نے اعلان کیا کہ اسے بذریعہ وحی مریدین سے بیعت لینے کو کہا گیا ہے۔ 1891ء میں اس نے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے ابتداء میں اسلام کی تلخیص کے لیے جو کوششیں کیں راسخ العقیدہ لوگوں نے بھی ان کی تعریف کی لیکن اس کے بعد اس کی تحریریں متنازعہ سے متنازعہ تر ہوتی چلی گئیں۔

کہا گیا کہ اس نے صفات پیغمبری سے متصف ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو محمدؐ کے خاتم النبین اور آخری وحی بردار ہونے کے عقیدے سے متصادم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دورِ اولیٰ کے صوفیاء کے دعاوی مرزا غلام احمد کے سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ ہو سکتا ہے' جیسا کہ ایم مجیب کا بھی خیال ہے' اس نے دوسرے بے شمار علماء میں سے ایک بنے رہنے پر اکتفا کرنے کی بجائے یوں ایک مسلمہ ہیئت مقتدرہ بنانے کی کوشش کی ہو تاکہ اس کے دعاوی استناد پا سکیں ایسا ہی چار صدیوں پہلے جونپور کے مہدی نے کیا تھا۔ غلام احمد اپنے کشف' رویا اور وحی الٰہی کا ذکر کرتا ہے جبکہ اس کے ماننے والے بذریعہ مباہلہ منکروں کی موت جیسے معجزات اس سے منسوب کرتے ہیں۔ احمدیہ کی تلخ ترین تصویر کشی ڈبلیو کینٹویل سمتھ نے کی ہے جس کے مطابق یہ "جدید مغربی افکار کی انگخت سے وجود میں آنے والا صوفیانہ روپ ہے۔

مرزا غلام احمد کے بعد اس کے ماننے والوں کی قیادت خلیفہ مولوی نور الدین (متوفی 1914ء) کے ہاتھ میں ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد یہ گروہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک لاہوری احمدی اور دوسرے جو اکثریت میں ہیں قادیانی کہلائے۔ لاہوری احمدیوں کی قیادت مولانا محمد علی کے ہاتھ میں تھی۔

لاہوری گروہ نے نسبتاً معتدل اور غیر مقلدانہ نقطہ نظر اپناتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ غلام احمد مجدد تھے اور انہوں نے کبھی دعویٰ نبوت کا اعلان نہیں کیا۔ اس گروہ نے یورپ' امریکہ اور خصوصاً مغربی افریقہ میں تبلیغی جماعتیں بھیجیں جنہیں کافی کامیابی ملی۔ اس جماعت نے کئی زبانوں میں قرآن کے تراجم کئے جن سے غیر ملکیوں کی قابلِ ذکر تعداد نے اسلام قبول کیا۔

قادیانیوں کے پاس ایک مثبت اور ٹھوس تعمیری لائحہ عمل موجود ہے۔ لیکن

1953ء میں پاکستان کا پہلا بڑا مذہبی بحران پنجاب میں 1953ء میں ہوا جو راسخ العقیدہ لوگوں کی ان سے نفرت کا نتیجہ تھی۔ جدیدیت کے جو رنگا رنگ رد عمل سامنے آئے ان میں سے کچھ اقلیتی مسلم گروہوں کی صورت میں تھے جنہیں آگے چل کر فیصلہ کن کردار ادا کرنا تھا۔ جب بدرالدین طیب جی کانگریس کے صدر بنے اور یوں مسلمانوں کے قیادت کے حوالے سے سر سید کے حریف ہوئے تو "ٹائمز آف انڈیا" نے اس پر امن فرقہ کے متعلق لکھا کہ ان کا تعلق "ایک اقلیتی فرقے سے ہے۔ جن کی کی کوئی صفت بھی بالائی ہندوستان کے جنگجو مسلمانوں سے مشترک نہیں"

طیب جی کا خاندان سلیمانی بوہروں سے تھا جو سولہویں صدی میں داؤدی بوہروں سے الگ ہوئے تھے۔ بوہرہ مسلمانوں کی سب سے چھوٹی اقلیتوں میں سے ایک ہے طیب جی خاندان کا پہلا ممتاز شخص' طیب علی بمبئی کا کامیاب کاروباری اور پہلا مسلمان تھا جس نے اپنے بچوں کو بغرض تعلیم 1851ء میں ہندوستان سے باہر بھیجا۔ طیب جی اور فیضی خانوادوں' جنہوں نے باہم بکثرت شادیاں کیں' کی خواتین نے 1894ء میں پردہ ترک کر دیا طیب جی ایسے قلیتی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے خلاف ہم وطن قدامت پسند سنیوں میں ایذا دہی اور تعذیب کے نہیں تو ایک خاص طرح کے شکوک و شبہات کے جذبات بہر حال پائے جاتے تھے۔ طیب جی کی شخصیت میں شمالی ہندوستانی جاگیردارنہ اور دکنی نوابیت کی اقدار شامل نہیں تھی اس لئے انہوں نے بلا کھٹکا ایک نئی بالائی متوسط کلاس کی تشکیل کی جس میں تاجر پیشہ کاروباری حضرات اور مغربی تعلیم یافتہ وکلاء کی اکثریت تھی یہ ایک حقیقت ہے کہ بنگال' بمبئی اور مدارس جیسے علاقوں' جن پر برطانیہ نے پہلے تسلط جمایا تھا' کے مسلمانوں میں دلی کے رہنے والوں کی نسبت نیا سیاسی شعور جلد پیدا ہو گیا تھا جبکہ دلی اور گردونواح کے مسلمان ابھی تک اپنے ماضی کے شاندار خوابوں اور مغل سلطنت کے احیاء کی امید پر زندہ تھے۔ نیا ابھرنے والا متوسط طبقہ 'جو ہندوستانی اسلام میں بالکل نیا عنصر تھا' پرانی اشرافیہ اور قدامت پسند سنیوں کے مقابلے میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا زیادہ طاقتور رجحان رکھتا تھا۔ طیب جی اس برادری کے واحد شخص نہیں تھے جنہوں نے کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور علی گڑھ کالج کی اعانت بھی کی۔ ان کے بہت سے مرد رشتے دار جدیدیت کی تحریکوں اور ہندوستانی ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری بھی شامل تھے۔ شیعہ قانون کے عظیم ترین ماہر اور اسلام کی جدید

تشریح پر کئی وقیع کتابوں کے مصنف آصف اے۔ اے فیضی اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جدید ہندوپاک کی مسحور کن خواتین میں سے ایک عطیہ فیضی کا تعلق بھی اسی فرقے سے یورپ میں اقبال کی دوست اور شبلی کی کچھ نظموں کی دیوی یہ خاتون تحریک آزادی نسواں کی سرگرم رکن تھیں۔ غیر بوہرہ پس منظر سے تعلق رکھنے والا اس کا خاوند فیضی راحمین مشہور مصور تھا۔ طیب جی خانوادے کی ایک خاتون ریحانہ دلی کی مشہور روحانی شخصیت تھی جن کی موسیقارانہ مہارت اور روحانی طاقت کے مسلمان اور ہندو دونوں معترف تھے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں فیضی طیب جی خاندان اور نواب آف مرشد آباد جیسے سرکردہ شیعہ خاندان باہم قریب آگئے۔ جن میں سے موخرالذکر خاندان سے اسکندر مرزا پیدا ہوئے جو پاکستان کے صدر رہے ہیں۔ اول الذکر خاندان نے بلگرامی سیدوں اور ممتاز سنی گھروں میں بھی رشتے ناطے کئے۔

اس وجہ سے ایک چھوٹی سی اقلیت سے تعلق رکھنے والے اس گھرانے کا اثر و رسوخ ہندوپاک میں حیرت انگیز طور پر مضبوط ہے۔ آج کے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ان کا قابلِ ذکر حصہ ہے۔

اسماعیلیوں کی دوسری شاخ کھوجہ بین الاقوامی سطح پر اور بھی نمایاں ہوئی۔ آغا خاں کے حقوق 1866ء میں بمبئی کے ایک جج نے تسلیم کئے تھے لیکن تیسرے آغا خان سلطان محمد شاہ نے بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی۔ اقبال سے چند دن پہلے 2 نومبر 1877ء کو پیدا ہونے والے آغا خاں مسلم لیگ کے قیام کی روح رواں تھے چونکہ انہیں گول میز کانفرنس میں ہمیشہ مدعو کیا جاتا تھا اس لئے تحریکِ خلافت میں بھی ان کا حصہ ہے۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنے فرقے کو جدید دنیا میں داخل کیا اور یوں اسے اسلامی دنیا کے سب سے ترقی پسند گروہوں میں سے ایک بنادیا۔ اشتراک باہمی کا ایک وسیع انتظام تعلیم نسواں اور حاضر امام کی عقلی اور عملی حکمت عملی ان کی مسلسل تعلیمی اور اقتصادی ترقی کی بنیادیں ہیں۔

بمبئی کا پہلا مسلمان مئیر بھی ایک کھوجہ تھا لیکن اس فرقے کے ممتاز ترین فرد محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ سندھ مدرسۃ الاسلام اور بمبئی میں تعلیم پائی جبکہ وکالت کی تربیت برطانیہ سے حاصل کی۔ انہیں بعد ازاں قائداعظم بنتا تھا جو مسلم لیگ کو پاکستان کی منزل کی طرف لے گئے جس کے پہلے گورنر جنرل وہ خود بنے تاہم یہ سب اگلے باب کا حصہ ہے۔

ساتواں باب

تقسیم بنگال سے تقسیم ہندوستان تک

اقبال کا عہد

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں برطانوی حکومت کے رد عمل میں مختلف مسلم گروہوں اور مسلکوں میں ایک روز افزوں اور ترقی پذیر احساس تشخص سیاسی شعور پیدا ہوا۔ جیسا کہ اس دور میں بننے والی ایسوسی ایشنوں کے ناموں سے پتہ چلتا ہے پر مسلم تحریک کے بڑے پہلو اسلام مخالفانہ حملوں کا ابطال، مسلم مفادات کا تحفظ اور مسلم یتامی کی دیکھ بھال تھے۔ ان پہلوؤں کی نمایاں ہونے کی ایک وجہ انہی سالوں میں ایسی ہندو تنظیموں کا منظر عام پر آنا تھا جو ہندو ازم کے قدیم تصورات کا احیاء اور تسلسل چاہتے تھے۔ مثال کے طور پر 1895ء میں مرہٹہ سیاست دان جی۔ بی تلک نے گشور کھشا اور مرہٹہ لیڈر شیواجی کی یاد میں تنظیمیں قائم کیں۔ کچھ مغربی حلقوں میں' جو دوپراں کے اپنشدوں کے لاطینی ترجمے کے باعث ہندوستان کی ایک خیالی تصویر ذہنوں میں سجائے بیٹھے تھے' ہندوازم کی اساطیر مقبول ہو گئیں۔ ان تاثرات کو اینی بیسنٹ (Annie Besant) کی تھیوسوفیکل سوسائٹی نے اور بھی مضبوط کیا۔ اسی مغربی طبقے کو ٹیگور کی شاعری میں ایک جسمانی لمسی اظہار محسوس ہوا۔ اس نے 1913ء کا نوبل پرائز حاصل کیا۔

1905ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے ایک نسبتاً بڑے صوبے بنگال کو فرقہ ورانہ خطوط پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوؤں نے اس عمل کے خلاف شدید معاندانہ

رویئے کا اظہار کیا اور پہلے بڑے فرقہ ورانہ فسادات ہوئے۔ اگرچہ یہ حکومت کو تقسیم 1911ء میں منسوخ کرنا پڑی لیکن ہندو اور مسلمان کے مابین تلخ احساسات پیدا کر گئی۔

1906ء میں مسلم لیگ کے قیام پر مسلمانوں کو پہلی سیاسی نمائندگی ملی۔ اس کے روحِ رواں آغا خاں تھے۔ جو ایک وفد لے کر وائسرائے کے پاس گئے جس نے شملہ میں 1906ء میں لیگ کا ایک نمائندہ سیاسی جماعت ہونا تسلیم کیا۔ مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے والے دوسرے نمایاں افراد میں سر سید کے دوست محسن الملک' سید حسین بلگرامی' عماد الملک اور ڈھاکہ کے شیعہ نواب شامل تھے۔ مسلم لیگ کا مقصد انگریزوں کی مخالفت اختیار کئے بغیر مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا تحفظ اور ان کی ترقی تھا۔ اس کے بانی جدت پسند اور انگریزوں کے وفادار مسلمانوں کے نمائندہ تھے جن میں زیادہ تر زمیندار طبقہ اور بالائی متوسط طبقہ کے لوگ شامل تھے۔

اسی لیے ہندوستانی مسلمانوں کے شبلی جیسے روایت پسند عناصر نے اس تنظیم کو خوش آمدید نہیں کہا۔ آنے والی دہائیوں میں دیوبندیوں نے اپنی لڑائی جاری رکھی۔ اگرچہ لیگ کے بانیان میں چند نہایت ممتاز شیعہ رہنما شامل تھے لیکن 1907ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس بھی فعال ہو گئی۔ شائد اس کی وجہ 1904ء اور 1908ء کے درمیان ہونے والے چند شیعہ سنی تنازعات ہوں۔ شیعہ کانفرنس کے روحِ رواں راجہ محمود آباد تھے جن کے بیٹے نے بعد ازاں تحریک پاکستان کی سرپرستی کی لیکن تقسیم کے کچھ عرصہ بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں سے مایوس ہو کر لندن میں سکونت پذیر ہو گئے۔

انگریز سے جس وفاداری کی تجسیم سر سید تھے" مسلم لیگ اس کی نمائندہ تھی۔ جب مسلم لیگ کی تشکیل ہو رہی تھی تو علی گڑھ سے ہی پہلی مرتبہ ایسے مسلم اخبار اور رسالے منظر عام پر آئے جن کا رجحان وفادارانہ نہیں تھا۔ شعلہ بیاں شاعر حسرت موہانی (1875ء۔1951ء) نے علی گڑھ سے اردوِ معلیٰ نکالا۔ وہ اپنی طویل سیاسی زندگی میں مسلم لیگ سے کیمونزم تک متنوع نظریات سے وابستہ رہے۔ خود کو درویش اور انقلابی سمجھتے تھے۔ لاہور میں "موضوعی طنز کے ماہر" مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار نکالا۔ نہایت جارح اور انگریز دشمن یہ اخبار دو عظیم جنگوں کے درمیان نکلنے والے کئی اخبارات کے لیے نمونہ تقلید بنا۔ لاہور ہی سے شیخ عبد القادر (بعد ازاں سر) نے مخزن کا اجراء کیا جو نسبتاً زیادہ تعلیمی'

ادبی جریدہ تھا۔ اقبال کی اولین نظمیں اسی رسالے میں چھپیں۔ ابوالکلام آزاد کا ترقی پسند اخبار "الہلال" (1912ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو بعد میں کانگریس کے حق اور تقسیم کے خلاف لکھنے والا ممتاز مسلم اخبار بن گیا۔ آزاد کے والد 1857ء میں ہجرت کر کے مکہ چلے گئے تھے جہاں 1888ء میں آزاد پیدا ہوائے۔ انہوں نے کلکتہ میں تعلیم پائی اور سر سید کی تحریروں سے متاثر ہو کر انگریزی سیکھی اور بنگال کی برطانیہ خلاف انقلابی قوتوں میں دلچسپی لینے لگے جن میں چکرورتی اور شری اروبند بھی نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ مصر ترکی اور فرانس کے اسفار نے ان کی برطانیہ دشمنی کی مزید تقویت دی۔ 1912ء میں انہوں نے ٹائپ میں چھپنے والا ایک رسالہ جاری کیا جس نے علی گڑھ گروپ کی برطانیہ نواز حکمت عملی اور سیاست کی کھل کر مخالفت کی اور اسی لیے کچھ عرصے کے بعد اس پر پابندی لگادی گئی۔ 1915ء میں آزاد نے ایک اور اخبار "البلاغ" شروع کیا۔ اس سے ذرا پہلے محمد علی جوہر (تولد 1878ء تعلیم علی گڑھ آکسفورڈ) نے ایک انگریزی اخبار کامریڈ (1911ء) کی اشاعت کا آغاز کیا تھا جس کے ایک سال بعد انہوں نے اردو اخبار "ہمدرد" نکالا۔ ان دنوں اخباروں نے مسلمان دانشوروں میں پین اسلامی جذبات کی ترویج کی۔

1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کا حق ملا جو سیاسی منزل کی طرف ان کا پہلا قدم تھا۔ اس کے باوجود غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ 1912ء کی جنگ بلکان ہندی مسلمانوں کی خود آگہی کی اٹھان کا اہم موڑ ثابت ہوئی جس کے دوران مولانا محمد علی نے ایک طبی وفد ترکی بھیجا۔ جنگ عظیم اول کے آغاز میں انہوں نے اپنی کتاب "The Choice of Turks" چھپوائی جس پر انگریز نے انہیں جیل بھجوا دیا۔ ہندوستانی دستوں کو، جن میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی، زبردستی ترکوں سے لڑوانے نے صورتحال پیچیدہ کر دی کیونکہ وہ لمبے عرصے سے ان کے مداح تھے اور ان کا سلطان، کم از کم نظری طور، پر دنیائے اسلام کا خلیفہ تھا۔ شیخ الہند محمود الحسن نے، جو گرفتاری سے بچنے کے لیے 1931ء میں مکہ روانہ ہو گئے تھے، سلطان ترکی سے ہندوستانی کی تحریک آزادی کے لیے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ ترک وزیر جنگ انور پاشا درۂ خیبر سے ہوتا ہوا برصغیر میں آکر برطانیہ سے جنگ کرے گا۔ مکہ اور کابل سے ہونے والی یہ سیاسی گٹھ جوڑ، جسے بعد میں ریشمی رومال سازش کا نام دیا گیا، جس میں

عبید اللہ سندھی بھی شامل تھے' دسمبر 1916ء میں ہونے والی عرب بغاوت کے بعد ناکام ہو گئی اور شیخ الہند کو ملک بدر کر کے مالٹا بھجوا دیا گیا۔

ادھر خود ہندوستان میں فرقہ ورانہ رجحانات جنگ کے دباؤ میں ختم ہوتے نظر آ رہے تھے اور لگتا تھا کہ 1916ء کا لکھنو پیکٹ (جس کے اہتمام میں کراچی کی کھوجہ برادری کے لندن میں تربیت یافتہ ہونہار نوجوان وکیل ایم۔ اے۔ جناح نے اہم کردار ادا کیا تھا) بنیادی سیاسی معاملات میں مفاہمت کا نقیب بنے گا۔ اپریل 1919ء میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام نے ہندو مسلم اتحاد کو مزید مضبوط کر دیا جس کے دوران دونوں مذاہب کے دو سو اناسی (279) افراد انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اسی سال دیوبند کے زیر اثر نئی نئی قائم ہونے والی جمعیت علمائے ہند نے عدم تشدد اور عدم تعاون کے حق میں ایک فتویٰ جاری کیا۔ یوں اس جماعت نے گاندھی کے نظریات کی پیروی کی جس کے بدلے میں گاندھی نے وعدہ کیا کہ وہ خلافت کی بقاء اور استحکام کے لیے مسلم تحریک کا ساتھ دے گا۔ شیخ الہند کا قیام مکہ کے دوران کی سرگرمیوں کی طرح اس فتویٰ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دیوبند کے رہنما عملی سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح کے طرزِ عمل سے انہیں امید تھی کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں پر اسلامی نظریات کے نفاذ میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ وہ بھی ان کے حالات اور واقعات کے رخ سے مطمئن نہیں تھے۔ اس اعتبار سے ان کا رویہ فرنگی محل' ندوۃ العلماء اور بریلوی مکتب فکر سے متضاد تھا جو قدرے کم متحرک تھے اور صورت حال کے تسلسل کے حق میں تھے۔ اختلافات اس حد تک بڑھے کہ دارلعلوم بریلی کے بانی احمد رضا خان (1856ء۔1921ء) نے عدم تعاون اور ہندوؤں سے مفاہمت اور بھائی چارے کے خلاف فتویٰ جاری کر دیا۔ جمعیت العلماء نے اپنے ایک رسالے کا اجراء کیا جس کے مدیران میں سے ایک نوجوان ابو الاعلیٰ مولانا مودودی نے لاکھوں ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے زیر اثر رکھا۔ ان کا تعلق اورنگ آباد دکن سے تھا۔ اس خلافت نظریے کو سب سے پہلے جمال الدین افغانی نے پیش کیا جو مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی مرکز کی تلاش میں تھے۔ جبکہ سرسید کو پین اسلام ازم کے خوابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے عثمانی سلطان کی اطاعت کو مسترد کر دیا تھا۔ کم از کم نظری طور پر اس مفروضے کی کوئی تاریخی بنیادیں نہیں کہ خلیفہ کو مسلم دنیا پر روحانی اقتدار بھی حاصل ہونا چاہیے۔ کلاسیکی ادوار میں بھی خلیفہ محض ایک سیاسی عہدہ تھا جو

شریعت کی رو سے علماء کی قانونی آراء کا پابند تھا۔ 1258ء میں جب بغداد کی عباسی خلافت منگولوں کے ہاتھوں ختم ہوئی تو مبینہ طور پر' اس گھرانے کا ایک خلف مصر میں نمودار ہوا جسے مملوک حکمرانوں اور بعض ہندوستانی سلاطین نے اپنی حکومتوں کو جائز قرار دلوانے کے لیے استعمال کیا۔ جب عثمانیوں نے 1517ء میں سلطان سلیم اول کے عہد میں مصر فتح کیا تو وہ اس خاندان کے آخری رکن کو اپنے ساتھ استنبول لے گئے اور 'روایت کے مطابق' اس سے خلافت لے لی۔ لیکن اپنی قلم رو سے باہر مسلمانوں کے عالمی روحانی رہنما کے طور پر یہ پہلی مرتبہ (Kuchk Kaynarca) کے معاہدے (1774ء) میں سامنے آئے جب عثمانی حکمران کو روسی ریاست اور خصوصاً کریمیا کے مسلمانوں کی نگہداشت کا حق دیا گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ازمنہ وسطیٰ میں صدیوں لفظ ترک مسلمان کے معنی میں استعمال کیا کیونکہ ''دلی کے بادشاہ اور مغل ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے اور فوجی اشرافیہ میں ترکی زبان صدیوں مروج رہی اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کی ترکوں کے ساتھ وابستگی قابل فہم ہے۔ کئی صدیوں تک عثمانی خلیفہ گمنامی کے اندھیروں میں رہنے کے بعد افغانی کے پروپیگنڈے کی وجہ سے دوبارہ زور پکڑ گیا۔ لیکن اس کی وجہ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ تجربہ بھی تھا کہ کسی بھی متنازعہ صورت حال میں اہل یورپ ہمیشہ ترکوں کے خلاف عیسائی طاقتوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ چنانچہ 1920ء میں مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی نے خلافت مینی فیسٹو شائع کیا اور انہی دنوں رہا ہونے والے ابوالکلام آزاد تحریک خلافت کے نظریہ ساز کی حیثیت سے سامنے آئے۔ انہوں نے ملوکانہ خلافت کا اسلام کا روحانی مرکز ہونا مان لیا اور مختلف ممالک میں اس کے نائبین مقرر کرنے جیسے رجحانات کا اظہار کیا۔ یعنی کہ عثمانی خلیفہ جو کہ روحانی رہنماء کی بجائے دنیاوی حکمران تھا سیاسی وفاداری کا مرکز تسلیم کر لیا گیا تحریک کے رہنماؤں میں حکیم اجمل خان' ڈاکٹر انصاری مولوی عبدالباری فرنگی محلی اور مالٹا سے رہا ہونے والے شیخ الہند شامل تھے جو اپنی زندگی کے آخری مہینے گزار رہے تھے۔ جون 1920ء میں لاڑکانہ (سندھ) مین منعقد ہونے والی ایک کانفرنس سے اس المناک تحریک کا آغاز ہوا جسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان خصوصاً سندھ سے ہزاروں مسلمان خاندانوں نے ہمسایہ مسلم ممالک میں پناہ حاصل کرنے کے لئے ہجرت کا آغاز کیا کیونکہ ان کے مذہبی رہنماؤں نے ہندوستان کو دارلحرب قرار دے دیا تھا۔ لیکن وہاں ان سے جو سلوک ہوا اسے

کسی طور پر بھی خوش آمدید قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاریخ خلافت کے ایک ممتاز رہنما نے شاہ امان اللہ سے مذاکرات کئے جو کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ خود افغانستان اپنے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ بہت سے مہاجرین راستے میں ختم ہو گئے جبکہ بچ جانے والوں میں سے کچھ اس وقت کے سوویت وسطی ایشیاء میں جا نکلے۔

1921ء میں مولانا آزاد نے جمعیت علمائے ہند کی سالانہ کانفرنس میں اسلامی اصولوں پر اپنے نظریات پیش کئے۔

> ''اسلامی شریعت میں اس دنیا اور اگلے جہان میں کوئی فرق نہیں' مسلمان صرف اس وقت خیر الامم کا درجہ حاصل کر سکتے جب وہ شریعت پر عمل پیرا ہوں' اسلامی شریعت قوانین کا واحد اور بہترین ماخذ ہے' مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ اجتہاد کی بندش اور مسلمانوں کا روح اسلام کی بجائے' فروعات سے وابستہ ہو جانا ہے''

آزاد کے حوالے سے آخری بیان خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ آزاد اسلام کی انسانیت نواز امثالیت پسندی کے علمبردار کے طور پر ابھر رہے تھے۔ وہ انتھک طور پر یہ منوانے کی کوشش کر رہے تھے کہ شریعت میں رواداری یا ہندوؤں کے ساتھ اچھے بھائی چارے کی ممانعت نہیں' بلاشبہ ان حالات میں یہ ایک نادر خیال تھا۔

تاریخ خلافت جلد ہی اپنی قوت کھو بیٹھی۔ **1921**ء میں خلافت کمیٹی نے ایک قرار داد منظور کی جس کے مطابق مسلمانوں کے لئے برطانوی فوج کی ملازمت حرام قرار دے دی گئی۔ اس سال دسمبر میں ہونے والے ایک کنونشن میں جمعیت العلماء نے امیر الہند' نائب خلیفہ کے چناؤ کے لئے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ ان کا مقصد ہندو غلبہ کے وسیع ملک میں مسلمانوں کے تشخص کو بچانے کے لئے پیٹر ہارڈی (**Pater Hardy**) کے الفاظ میں '' قانونی امتیازیت '' تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں ہندوستان میں تبلیغ کی آزادی ہو اور وہ یہاں کے غیر مسلموں سے آزادی لینے کی بجائے ان کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کریں تاکہ ان کے دل اسلام کی طرف سے سخت نہ ہوں۔

1921ء میں مالابار کے ساحل پر رہنے والے موپلوں نے بغاوت کر دی جس کے اثرات سارے ہندوستان نے محسوس کئے۔ زیادہ تر غریب مسلمانوں پر مشتمل یہ گروہ جو ماضی

میں بھی ایک سے زیادہ بار بغاوت کر چکا تھا' (آخری 1873ء) ہندو اور عیسائی دونوں سے جان توڑ کر لڑا۔ اس بغاوت کو برطانیہ نے بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔ ملک میں بلا امتیاز پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ گاندھی نے جزواً اس بغاوت کی وجہ سے عدم تعاون کی تحریک فروری 1922ء میں ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ گاندھی کے اس عمل سے خلافت کے رہنماؤں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور وہ مختلف سمتوں میں چل نکلے۔ مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں نے کانگرس سے رجوع کیا جبکہ علی برادران نے یہ تحریک خلافت جاری رکھی۔ اس تحریک کو دوسرا دھچکا مصطفےٰ کمال (اتاترک) کے اواخر 1923ء میں سلطنت ختم کرنے اور سابق عثمانی سلطان کو محض خلیفہ کے لقب تک محدود کر دینے سے لگا۔ اس نئی صورت حال سے پریشان ہو کر سید امیر علی اور آغا خاں دسمبر 1923ء میں اس امید پر ترکی گئے کہ وہ مصطفےٰ کمال اور عصمت انونو کو سلطان کا مرتبہ بڑھانے پر راضی کریں گے۔ لیکن ان کی مداخلت کا الٹ اثر ہوا اور 3 مارچ 1924ء کو خلافت ختم کر دی گئی۔

تحریک خلافت نے کچھ عرصہ ہندو مسلم تعاون برقرار رکھا۔ یہ واحد تحریک تھی جس میں ان دونوں نے عوامی سطح پر انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ کھولا' اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکنے کے باوجود اس کی یہ تاریخی اہمیت موجود ہے۔ 1924ء میں ایک بار پھر فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی جس کا نتیجہ فسادات کی صورت میں نکلا۔ اس کشیدہ ماحول کی ایک مثال رنگیلا رسول نامی کتاب ہے جو 1924ء میں شائع ہوئی۔ حرمت رسولؐ ابتدا ہی سے ہندوستان میں نازک مسئلہ رہی ہے جو بیس کی دہائی کی سیرت تحریک اور کئی رسالوں اور کتابوں کی تصنیف سے اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اس کتاب کے ہندو مصنف کو 1929ء میں دو مسلمان نوجوانوں نے قتل کر دیا۔ اس عمل پر ہندوستان کے سارے مسلمانوں نے دادِ تحسین دی۔ مسلمانوں کو دوبارہ ہندومت میں واپس لے جانے کی داعی شدھی اور ایسی دوسری فرقہ وارانہ تحریکوں کے باعث مسلک میں حجت بازی' مناظرہ اور بحث و مباحثہ کے دروازے کھل گئے۔ اس کا ردعمل مسلمانوں میں تبلیغ جیسی تحریکوں کی صورت سامنے آیا جس میں انتھک اور فصیح البیان مقررین نے لوگوں کو دعوت اسلام دی۔ تبلیغ کے رہنماؤں نے جن میں خواجہ حسن نظامی کا نام خصوصاً قابلِ ذکر ہے دینی تعلیم کا بندوبست کیا اور لوگوں کو خالص اسلام کی دعوت دی۔ ان کے مخاطب زیادہ تر اچھوت نیچ ذات کے ہندو اور ایسے لوگ تھے جو بظاہر اسلام قبول کرنے

کے باوجود مخلوط مذہبی نظریات اور رسوم و رواج پر عمل پیرا تھے۔ گاندھی نے اپنی عملی سیاست میں ہندو نظریات پر زور دیا اور دیومالائی مثالیں متعارف کروائی۔ جو جو ہندو اکثریت کے لئے عین فطری اور شناسا تھیں لیکن مسلمان اس پر برگشتہ ہو گئے کیونکہ ان کے لئے پورے ملک کے مقدر کے فیصلہ میں ذاتی مذہبی تصورات کا استعمال قابلِ قبول نہیں تھا وہ ہر حال ملک کی اہم اقلیت تھے اور ان نظریات سے کوئی لگاؤ نہ رکھتے تھے۔

جس معاملہ پر ہر مکتب فکر کے مسلمان کانگرس کے خلاف ہو گئے نہرو رپورٹ تھی جو 1928ء میں پیش کی گئی اس میں مسلمانوں کے لئے پہلے سے طے شدہ سیاسی نمائندگی کو خارج کر دیا گیا تھا۔ جمعیت العلماء نے اس کے خلاف بیان دیئے اور ایم اے جناح، جو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رکن تھے' کانگرس چھوڑ کر اپنی توجہ مسلم لیگ پر مرکوز کر دی۔ جدید طرز فکر کے اس دور میں مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم پہلو تعلیم میں دلچسپی تھی حیدر آباد دکن میں' جو لمبے عرصے سے مسلم تمدن کا مرکز چلا آرہا تھا' عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی گئی جس میں ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ اس مقصد کے لئے نصابی کتب کی فراہمی ایک دارلترجمہ کے قیام کی متقاضی تھی یہ ادارہ اردو دان طبقے میں فروغ علم کے سلسلے میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ جبکہ 1928ء سے آغاز اشاعت کرنے والا یونیورسٹی جریدہ "اسلامک کلچر" آج بھی اسلامی علوم کے بہترین رسالوں میں سے ایک ہے۔ 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے والے مسلم تعلیمی ادارے علی گڑھ کو قومیت پرست مسلمان انگریز نواز رویے کا مرکز خیال کرتے تھے۔ چنانچہ 1920ء میں ہی یہاں ایک نئی درس گاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بانی محمود الحسن' مولانا علی اور گاندھی تھے۔ 1925ء میں یہ ادارہ دہلی منتقل کر دیا گیا جہاں یہ بعد ازاں ایک بھرپور تعلیمی مرکز بن گیا یہاں کنڈر گارٹن سے کالج کی سطح تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اردو ذریعہ تعلیم کے حامل اس ادارے کو ایک قوم پرست اور آزاد ادارہ خیال کیا جاتا تھا۔ جامعہ کو اپنی آزادی پر فخر تھا اس نے حکومت کی کبھی کوئی امداد قبول نہ کی۔ اس کی بقاء اور ترقی خالصتاً اس کے عملے کی قربانیوں کی مرہونِ منت تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو تقسیم کے بعد ہندوستان کے پہلے مسلمان صدر بنے' کی طویل وائس چانسلری کے دوران یہ ادرہ اپنی معراج کو پہنچا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ان مسلم طالب علموں میں سے ایک تھے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ کے بجائے جرمنی کو منتخب کیا جسے پہلی جنگ عظیم

میں ترکی کی حمایت کے باعث مسلمان عزیز رکھتے تھے۔ جرمنی سے تعلیم حاصل کرنے والے مسلم نوجوانوں میں علوم بشری کے ایم مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین اور بین الاقوامی شہرت کے ڈاکٹر طبیعی علوم کے ماہر رضی الدین اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی جیسے لوگ شامل تھے۔ آنے والے دنوں میں یہی لوگ تحریک آزادی کے ہراول دستے میں شامل تھے ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین نے بیان دیا۔

"ہندوستانی مسلم اپنے تمدنی تشخص سے کسی طور دستکش نہ ہوں گے۔ وہ اچھے مسلمان اور اچھے ہندوستانی بننا پسند کریں گے"

جن سالوں میں ممتاز مسلمان رہنماؤں کے ایک اہم حصے نے عدم تعاون اختیار کیا' جو اکثر و بیشتر قید و بند پر منتج ہوتی تھی' اور جب تحریک خلافت پر معاشرے کے تمام طبقے متفق تھے۔ تو نامور شخصیات میں سے ایک کو 1922 میں نائٹ ہڈ سے سرفراز کیا گیا جو اس نے قبول بھی کر لیا۔ یہ شیخ محمد اقبال تھے جنہیں اس وقت سر اقبال کہا جانے لگا۔

اقبال 9 نومبر 1877ء کو آغاز خاں سے کچھ دن اور جناح سے گیارہ ماہ بعد پیدا ہوئے۔ اسی سال علی گڑھ نے کام شروع کیا۔ اقبال ایک کشمیری خاندان سے تھے جو شمالی پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں آباد ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے سکاٹش مشن کالج میں پائی اور بعد ازاں مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے جہاں گورنمنٹ کالج میں ان کے اساتذہ میں مستشرق سر تھامس آرنلڈ بھی شامل تھے۔ اقبال جلد ہی اچھے اردو شاعر کے طور پر مشہور ہو گئے۔ وہ حالی کے متعارف کروائے ہوئے جدید انداز میں شاعری کر رہے تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری فطرت پر ہے جس میں انگریزی اور ہندوستانی شاعری سے ماخوذ نظمیں بھی شامل تھی۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے لئے بھی لکھتے تھے۔

1905ء میں اقبال فلسفہ اور قانون کی تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے جہاں ان کے اساتذہ میں نو ہیگلی (Neo Hegeliaan) میک ٹیگرٹ (Mc Taggart) بھی شامل تھا۔ 1907ء میں وہ انگلینڈ سے جرمنی گئے جہاں ہائیڈل برگ میں کچھ جرمن سیکھی اور نومبر 1907ء میں میونخ یونیورسٹی میں اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "ایران میں فلسفہ الہیات کا ارتقاء" پیش کیا۔ ان کے مقالے کے نگران (Dokorvater) فریڈرک ہومیل تھے جو ارنسٹ ٹرمپ (1828-1885) کے جانشین تھے۔ جنہیں سندھی' پشتو' بلوچی اور براہی کے

لسانی مطالعے اور آدی گرنتھ کے ترجمے کے باعث آج کے مطالعہ پاکستان کا پیشرو خیال کیا جانا چاہئے۔ اقبال کا مقالہ ایرانی مذہبیت کے قدرے کم معروف پہلوؤں پر تھا۔ جنہیں زرتشتی عہد سے بابیت جیسی نسبتاً جدید تحریکوں کے منطقی ارتقاء کی صورت بیان کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے متعلق ان کے اپنے نقطہ نظر پر وحدت الوجود جیسی روایتی صوفی توجیہات کی چھاپ تھی۔ یہ طرز عمل ان کی نوہمگی دلچسپیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کی ساتھی عطیہ فیضی کی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جرمنی نے اقبال کو بہت متاثر کیا۔ گوئٹے کے لئے ان کی تعریف و توصیف کی کوئی حد نہیں تھی۔ چھوٹی سی نظم "ایک شام" Wanderers Nachtlied کے سحر میں لکھی گئی۔ اسی پر بس نہیں بلکہ فاؤسٹ اور میفسٹو کی شبیہیں اقبال کی دائمی دلچسپی کا مرکز رہیں اور اقبال کے 'اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں سے مطمئن نہ ہونے والے انسان پر ان کی پرچھائیاں ہیں۔

لاہور واپسی کے چند سالوں کے اندر اقبال میں گہری فکری تبدیلیاں آئیں۔ اقبال کے نظریہ حیات میں رومیوں (Vitalists) کا اثر واضح طور پر جھلکنے لگا وہ ہیگل کو ایک طرف ڈال کر نٹشے اور برگساں کے فلسفہ کو سراہنے لگا۔ ان کی اولین نظمیں کل ہندوستانیت کے جذبے کی عکاس ہیں۔

لیکن جنگ بلقان کے دنوں میں اس نے اپنی پہلی بڑی اصلاحی نظمیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" لکھیں جو پریشان حال مسلمانوں کی شکایت اور خدا کے ان کو جواب پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں اپنے مضمون اور ہیت میں مسدس حالی کے قریب ہیں۔

اقبال کی 1910ء میں تحریر شدہ ایک نوٹ بک افکار پریشان (Stray Re-flections) سے ان کی بدلتی ہوئی دلچسپیوں اور معاشرتی اور سیاسی امور میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ اسی سال اقبال نے علی گڑھ کالج میں (Islami a Social & Political Order) "اسلام بطور سیاسی اور معاشرتی نظام" پر تقریر کی "ہندوستانی مسلمانوں کے حیات باطن سے ترکِ استفادہ کی شکایت کرتے ہوئے سامعین کو ان کے اسلاف کی شکوہ و سطوت یاد دلائی۔ تاہم اسلام اور اس کے قوتِ محرکہ پر ان کا غیر متزلزل ایمان تھا۔ مولانا محمد علی نے 1912ء میں ایک مضمون "اسلام کا مستقبل" (Future of Islam) میں لکھا۔

"ڈاکٹر اقبال نے دلِ و جاں میں جاگزیں ہونے والے اخلاص سے
اپنے اس ایقان کا اظہار کیا کہ اسلام بطور ایک روحانی قوت ایک روز دنیا
پر غالب ہو گا اور اس کی سادہ "وطنیت" اوہام اور بے خدا مادیت ہر دو کا
قلع قمع کردے گی"

مولانا محمد علی کے اس "ہونہار جوان" کی اردو نظموں کے موضوعات۔ ان کے مستقبل کے کارناموں کے عنوان ثابت ہوئے جن میں خدا اور اس کے رسول کی مغلوب کن محبت اور کرداری قوت میں اسلام کی اصل اقدار کی اہمیت وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔

اقبال کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ پڑھاتے رہے۔ پھر وہ وکالت کی طرف متوجہ ہوئے جو ان کی خواہش سے زیادہ وقت کی طالب تھی اردو کے اس کامیاب شاعر نے جنگ کے دوران فارسی شاعری شروع کی۔ 1915ء میں ان کی پہلی فارسی، مثنوی 'اسرار خودی' منظر عام پر آئی جو بعد میں آنے والی باقی مثنویوں کی طرح 'مثنوی مولانا روم کی بحر میں لکھی گئی تھی یہ مثنوی اقبال کے مداحین کے لئے جھٹکے سے کم نہ تھی۔ شاعر نے خوب صورت اور پیارے تخیلات اور خوابناک زبان ترک کر دی تھی جس کے فارسی قارئین عادی تھی۔ اس کی بجائے وہ جدو جہد کی تلقین کرتا اور تعمیر شخصیت پر درس دیتا نظر آیا۔ اس کی اصطلاح خودی سے جو معنی وابستہ تھے 'ایران اور ہندوستان کے صوفی ادباء و شعراء کے نزدیک ہمیشہ ناپسندیدہ رہے تھے۔ اقبال نے افلاطون اور حافظ پر حملے کے لئے کہ انہوں نے اپنے افیون اثرات کلمات سے مسلم برادری کو گمراہ کر دیا ہے۔ اقبال کے ہاں حزن ویاس 'بلبل اور پگھلتی شبنم کی جگہ شاہین اور ہیرے کا جگر انسانی منزل کے استعارے بن گئے۔ آر اے نکلسن، جس نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ (1920ء) کیا بجا طور پر لکھتا ہے "اقبال اپنے عہد کا اور اپنے عہد سے آگے کا آدمی ہے 'لیکن وہ اپنے عہد سے غیر متفق بھی ہے" شاعر کا اپنا دعویٰ بھی یہی ہے۔

دو سال بعد اقبال نے "رموزِ بے خودی" لکھی 'جو اسرار خودی ہی کا تسلسل ہے۔ یہ کتاب صحت مند اسلامی معاشرے میں شخصیت کے کردار سے بحث کرتی ہے۔ اس کے مشمولات کو اقبال کے معاشرتی نظریات کہا جا سکتا ہے۔ پھر اقبال نے "پیام مشرق" میں گوئٹے کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ کتاب دراصل West Ostlicher Divan کا

جواب ہے۔ اس کتاب میں شاعر کی چند عمدہ ترین فارسی نظمیں اور یورپی مفکرین اور شعراء کے مقام و مرتبہ پر دلچسپ مرتبے شامل ہیں۔ تقریباً اسی دوران ان کا پہلا اردو مجموعہ 'جواب تک کی مطبوعہ شاعری پر مشتمل تھا' "بانگِ درا" منظر عام پر آیا۔ کتاب کا عنوان نہایت معنی افروز اور اہم ہے کیونکہ یہ اقبال کے اپنے متعلق خیالات کی نشان دہی کرتا ہے۔

اقبال وہ صدا ہے جو زرق برق مغربی شہروں اور ایران کے مہکتے گلزاروں میں بھٹکتے اور گم کردہ راہ مسلمانوں کو ان کی حیات و ایمان کے مرکز یعنی مکہ میں کعبہ کی طرف آنے کی دعوت دیتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اور انیسویں صدی کے مصلحین کی طرح اقبال کا آئیڈیل بھی عرب اسلام ہے۔ لیکن وہ عرب میں وہابی اسلام متعارف کرانے والے شاہ سعود کا جتنا مداح ہے اتنا ہی افغانستان کے شاہ اماں کی اصلاحات کا بھی جس کے نام اس نے پیامِ مشرق کا انتساب کیا۔

بعد کے سالوں میں اقبال پنجاب مسلم لیگ میں سرگرم رہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ ان کی عملی سیاست شاعری میں بیان کئے گئے بلند و بالا تصورات سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ یہ تصورات "زبور عجم" (1927) میں بیان ہوئے ہیں جس میں ان کی عمدہ ترین مناجات بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کی حیاتِ نو کے مسائل پر ان کے فلسفیانہ خیالات چھ لیکچروں میں شامل ہیں جو انہوں نے 1928ء میں حیدر آباد' مدراس اور علی گڑھ میں دیئے۔ ایک ساتواں باب "?Is Religion Possible" شامل کر کے ان لیکچروں کو Six Lectures on the Reconstruction of Religions thought of Islam کے نام سے ایک مجموعے کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ان کی واحد نثری تصنیف کا عنوان غزالی کی "احیا علوم الدین" کا آخری حصہ ہے۔ اقبال کا مقصد تھا کہ جدید فلسفہ اور نفسیات کو استعمال کر کے کلاسیک اسلامی افکار کی تشریح و توضیح کی جائے۔ لیکن بعض اوقات اس طرز فکر سے حیرت انگیز نتائج نکلتے ہیں جس کے باعث بعض مغربی اذہان ان کے کام کو فلسفیانہ نہیں مانتے۔ اس قدر بہر حال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اقبال بجائے منضبط اور منتظم فکر کے شاعرانہ فلسفہ دان تھا۔

1930ء کے آخر میں اقبال کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت پیش کی گئی۔ اس نے یہیں پہلی بار برصغیر میں ایک علیحدہ مسلم وطن کا تصور دیا اس نے اپنے صدارتی

خطبے کا اعلان ان الفاظ سے کیا۔

"میں اپنی زندگی بھر کے مطالعہ اسلام کی روشنی میں اخذ کردہ کچھ اصولوں کو آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں آپ کے فیصلوں کو ان اصولوں کی عمومی رہنمائی حاصل ہونا چاہئے"

اور وہ بعد میں کہتا ہے

"میں پنجاب' شمال' مغربی سرحدی صوبہ 'سندھ اور بلوچستان کو ایک واحد ریاست میں ضم دیکھنا چاہتا ہوں۔ چاہے برطانوی ہند کے اندر ہو یا اس سے باہر' میرے خیال میں متحدہ شمال مغربی ہندوستانی ریاست مسلمانان ہند کی آخری اور حتمی منزل ہے"

ہندوستانی سرزمین پر علیحدہ مسلم ریاست یا فیڈریشن کا تصور قطعاً نیا پن تھا۔ فرقہ ورانہ مسائل کے اس طرح کے حل کے امکانات پر آراء برطانوی حلقوں سے بھی آتی رہیں اور 1928ء کے سیاسی منظر میں موتی لال نہرو کی بے لچک حکمت عملی کے باعث ہندو مسلم اتحاد کا "ایم اے جناح جیسا حامی بھی قومیتی مسلم حکمت عملی کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر اقبال کے خوابوں کے وطن کو لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم چوہدری رحمت علی نے ایک نام دیا۔ اس نے مسلم اکثریتی صوبوں' بشمول کشمیر' کے ناموں کے پہلے حروف ملا کر ایک نام پاکستان بنایا جو بامعنی بھی تھا یعنی پاک لوگوں کی سرزمین' لیکن مسلم لیگ کو آزاد پاکستان کے حصول کو اپنی آخری سیاسی منزل قرار دینے میں مزید ایک دہائی لگی۔ اقبال نے اپنی 1910ء کی ڈائری میں لکھا تھا۔

"قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں' یہ سیاستدانوں کے ہاتھوں میں پنپتی اور فنا ہوتی ہیں"

1931ء کے آخری مہینوں میں اقبال نے آغا خاں کی زیر قیادت ہندوستانی مسلمانوں کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے دوسری لندن گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ واپسی کے سفر میں اس نے یروشلم میں عالمی مسلم کانگرس میں بھی شرکت کی۔ 1932ء کے آخر میں وہ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے وطن پلٹتے ہوئے اس نے اپنے پرانے ممدوح ہنری برگساں سے پیرس میں ملاقات کی۔ اسی دوران

انہوں نے لوئی میزینان Louis Massignon سے حلاج کی اپنی نٹشے کے فلسفہ کی روشنی میں تشریح پر بھی بات چیت کی۔ وہ فرانس سے سپین گئے جہاں میڈرڈ میں لیکچر دیا اور قرطبہ کی جامع مسجد دیکھی جس سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی عظیم ترین اردو نظمیں لکھیں۔ اٹلی میں اس شاعر فلاسفر نے مسولینی سے ملاقات کی اور اسے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ تاہم بعد میں اٹلی کے حبشہ پر حملے نے ان کا تعریفی رویہ تبدیل کر دیا۔

1932ء میں اقبال نے اپنا شاہکار "جاوید نامہ" پیش کیا جس کا انتساب ان کے نو عمر بیٹے جاوید اقبال کے نام تھا۔ اس میں مولانی رومی کی رہنمائی میں شاعر کے اجرامِ سماوی کے سفر کا حمائل بیان کیا ہے جو اسے مختلف ممالک اور مذاہب سے متعارف کرواتے ہیں۔ بالآخر شاعر اکیلا بارگاہِ الٰہی میں پہنچتا ہے لیکن وہ یہاں بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مقدر پر سوالات پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالآخر زندہ رود۔ اقبال کا جاوید نامہ میں نام۔ اس دریا کی شکل اختیار کر جاتی ہے جس کے ساتھ گوئٹے نے اپنی نظم میں حضرت محمدؐ کو بیٹھے دکھایا تھا۔ اقبال نے اس نظم کو فارسی روپ دے کر "پیام مشرق" میں شامل کیا تھا۔ جاوید نامہ اقبال کے تصورات کا اجمالی بیان ہے جس مہارت کے ساتھ اقبال نے دنیا کے مختلف مذاہب اور ان کی حقیقت کو علامات اور اشعاروں سے بیان کیا ہے اس پر مغرب کا عام قاری حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مذہبی روایات کا یہ علامتی بیان شاعر انسان کے مستقل حرکت اور مختلف مدارجِ زندگی پر مبنی سفر کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتا ہے جس کے آخری مرحلے میں وہ بحضورِ خدا پہنچ جاتا ہے جہاں اسے ابدی طور پر نمو پذیر رہنا ہے۔

1933ء میں یہ شاعر فلسفہ دان شاہِ افغانستان کی دعوت پر کابل گئے جو یونیورسٹی کے قیام پر مشاورت چاہتا تھا۔ ان کے دوست سلیمان ندوی اور سر سید کے پوتے اور بھوپال کے وزیر تعلیم سر راس مسعود بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چھوٹا سا فارسی دیوان "مسافر" دوران سفر کے احساسات کا بیان ہے۔ اسی دوران ایک اور چھوٹی سی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد" بھی کہی گئی۔ اس میں ایک بار پھر ہندوستانیوں کی قسمت پر ماتم کرتے ہوئے حقیقی روحانی غربت یا فقر کی تعلیم دی گئی ہے۔

اقبال ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں کی اور آکسفورڈ میں رہوڈز لیکچر دینے کی دعوت قبول نہ کر سکے کیونکہ گلے کی ایک بیماری کے باعث وہ بہ آوازِ بلند نہیں بول سکتے تھے اور ان کی

صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے احمد سرہندی کے مزار پر حاضری دی اور پانی پت میں حالی کی پیدائش کی سو سالہ تقریبات میں شرکت کی انہوں نے شعر کہنا ترک نہ کیا بلکہ اس کے برعکس ان کی اردو نظموں کا ایک مجموعہ بالِ جبریل کے نام سے 1936ء منظر عام پر آیا۔ اس کے ایک سال بعد ضرب کلیم چھپی۔ موخر الذکر میں زیادہ تر سیاسی اور معاشرتی برائیوں خصوصاً مغرب کی اندھی تقلید' پر تنقیدی نظمیں شامل تھیں جبکہ بالِ جبریل میں ان کی چند نہایت طاقتور نظمیں شامل ہیں جن کی زبان نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ اقبال نے ایک علیحدہ مسلم ریاست کی تخلیق پر حال ہی میں لندن سے پلٹنے والے مسٹر جناح کے ساتھ خط و کتاب بھی کی۔ اس کے باوجود وہ اکثر اوقات محسوس کرتے کہ ان کا سارا کام فضول ہے اور اس حوالے سے اپنا تقابل اپنے پسندیدہ "گل لالہ" سے کرتے اپنی زندگی کے آخری دور میں اقبال دوبارہ اسلامی قانون اور جدید دنیا کے لئے اس کی تشریح کی طرف متوجہ ہوئے لیکن بدقسمتی سے وہ اس زیرِ منصوبہ کتاب کو لکھ نہ پائے ان کے معاشرتی سیاسی خیالات جاننے کے لئے ان کے چھ لیکچروں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ قانون سازی کا نیا طریقہ اجماع کے قدیم اصول کی جگہ لے سکتا ہے جیسا ترکی میں ہوا جہاں پر خلافت کی جگہ قومی اسمبلی نے لے لی۔ (ہو سکتا ہے کہ یہ نقطہ نظر تحریکِ خلافت کا تاخیری ردعمل ہو) اگرچہ انہوں نے شرعی پرسانل لاء کی حمایت کی لیکن ان کے کچھ تبصرے نہایت جرات مندانہ ہیں۔

> "وہ تسلیم کرتے ہیں کہ روشن خیالی اور جدت پر مبنی تصورات تاریخ اسلام میں ہمیشہ نازک موڑ ثابت ہوئے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہر نسل کو اسلامی اصولوں کی تشریح اپنے سماجی حالات کے مطابق کرنے کا حق حاصل ہے"

اقبال کے آخری منصوبے بروئے کار نہ آسکے۔ نہ تو **Aids to Study of the Koran** اور نہ ہی **Book of the Forgothen Prophet** جن میں سے موخر الذکر کو نٹشے کی **Thus Spake Zarathustra** کا قائم مقام ہونا تھا۔ ان کے **1938**ء کے نئے سال کے پیغام سے امن عالم کے متعلق ان کی تشویش کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا آخری مضمون اپنے علیحدہ مسلم وطن کی جماعت میں اور احمد مدنی دیوبندی کے خلاف تھا

جو شیخ السند کے جان نشین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام قومیت سے ماورا ہے اور اس حوالے سے "اقبال اصل اسلام سے بھٹک گئے ہیں"

رات دیر تک ایک ملاقاتی H.H. Von Veltheim Ostrau سے جرمن فلسفہ پر بحث مباحثہ کے بعد 21 اپریل 1938ء کو علی الصبح اقبال گزر گئے۔

"سچا مسلمان موت کا استقبال مسکراہٹ سے کرتا ہے"

اس کی وفات پر ہندوستان کے تمام طبقوں نے سوگ منایا اور ہندوستانی ادب کی قد آور شخصیت رابندر ناتھ ٹیگور نے آہ بھری۔

"اقبال کی موت سے ادب میں خلا پیدا ہوا ہے جو گہرے گھاؤ کی طرح بھرنے میں وقت لے گا"

اقبال پر لکھے گئے ادب میں تقسیم کے بعد بے تحاشا اضافہ ہوا کتابوں، مضامین اور رسالوں کی تعداد اور اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ اقبال کا ایک طالب علم پڑھ نہیں سکتا۔ ڈبلیو کینٹویل سمتھ نے بالکل درست تبصرہ کیا ہے اقبال شناسی ہندوستانی اسلام میں خاصا بڑا پیشہ بن چکا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں چلنے والی ہر روحانی، سماجی اور سیاسی تحریک کو اقبال کی تصانیف سے ان کے اپنے نقطہ نظر کے جواز میں شعر مل جاتے تھے اگر ان کی تصنیفات سے ان کے آزاد خیال یا قدامت پسند ہونے کا ثبوت ڈھونڈنا ہو تو ترقی پسند اور رجعت پسند ہر دو ان کے الفاظ کو اپنی مرضی کی تشریح پہنا سکتے ہیں۔

اقبال کی تصانیف سے ایک فکری ڈھانچے کی تشکیل واقعی مشکل ہے۔ فلسفے میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ ایسا منضبط مفکر نہیں جو ایک واضح اور منطقی فکری نظام کی تشریح کرے۔ اس کے دلائل میں شاعرانہ رجحانات ہمیشہ غالب ہوتے ہیں۔ بطور شاعر کے بھی وہ فن برائے فن کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری کو ایک حیات افزاء قوت کے طور پر ہونا چاہئے نہ کہ مدہوش لوگوں کے خوابِ غفلت کی طرح، جیسا کہ وہ بیشتر کلاسیکی کی فارسی شاعری کو سمجھتا تھا بلکہ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے شاعری کا سہارا لیا ہے اس لئے تھا کہ اس کے ہم وطن اس طرز کلام سے مانوس ہیں، درحقیقت ہے بھی ایسا ہی۔ ایک اچھا فقرہ یا مترنم شعر قاری کے ذہن میں اتر جاتا ہے اور چند روز میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر لیتا ہے غالباً اسی وجہ سے اقبال کے ہاں ایسی مترنم بحریں استعمال کرنے کا رجحان غالب ہے۔

جنہیں بآسانی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں متضادات کو ایک جگہ لانے اور کلیدی الفاظ کی تکرار بھی اسی اہتمام کا حصہ ہے۔ فن کا یہ پہلو اقبال اور ان کے مرشد مولانا روم میں مشترک ہے۔

یورپی فلسفے پر اقبال کا طرز فکر اس کے کچھ قارئین کے لئے حیران کن ہے لیکن اس کے باوجود ممتاز جرمن فلسفہ داں (Rudolf Pammwitz) کے خیال میں اقبال کے نٹشے کی تشریح کلیتاً درست اور بامعنی ہے۔ نٹشے کے ساتھ اقبال کا تعلق اس کے مداحوں میں بھی موضوع تنقید بنا رہا۔ لیکن وہ اس جرمن فلسفہ دان اور اس کے سپر مین کے تصور کا اندھا مقلد نہیں بلکہ وہ اس کا نقاد ہے۔ اقبال اس کی واردات کی گہرائی' عیسائیت میں یونانی فلسفیانہ رجحانات کے خلافت جدوجہد اور بے پناہ رجائیت کا معترف ہے لیکن وہ نٹشے پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ "لا" یعنی کلمہ ایمان کی ابتدائی منزل یعنی نفی تک محدود ہو کر رہ گیا اور مقام "الا" یعنی خدا تعالیٰ کی ہمہ گیر حاکمیت کے اقرار کی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ تکنیکی اصطلاحات میں بات کی جائے تو یوں ہے کہ نٹشے لاوجودیت کا قائل تھے لیکن اس کی لاوجودیت' وجودی اثبات کی طرف سفر کا پہلا اور ضروری قدم تھا۔ اسی طرح اقبال نے مولانا روم کی جو تشریح کی ہے وحدت الوجود کی روشنی میں کی گئی سینکڑوں دوسری تشریحات کے مقابلے میں اس عظیم صوفی شاعر کے اصل خیالات کے زیادہ قریب ہے۔ اقبال نے رومی کے متحرک تصورِ جہان اور عشق پر جو زور دیا ہے وہ اس کی اہم ترین دریافتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اقبال کو اپنا مثالی انسان تخلیق کرنے اور مسلمانوں کو مردِ مومن کے اثرات سے آگاہ کرنے' کے لئے نہ تو نٹشے کی خوشہ چینی کی ضرورت تھی اور نہ ہی ابنِ عربی کے انسان کامل سے۔ اس کی بجائے خدا کا سچا بندہ وہ ہے جو ہجوم سے متمیز ہو جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے "مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ" سورہ 7/197 ایسا انسان ہمیشہ سے صوفیاء کے نزدیک مثالی رہا ہے۔ واضح رہے کہ مکمل انسان کا نظریہ نہ صرف نٹشے اور سٹرنر (Stir-ner) کے زیر غور رہا بلکہ اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی میں شری اروبند واور دوسرے مفکرین نے بھی اس مثالی شخصیت پر غور کیا۔ خدا کو عظیم ایگو ماننے اور خدا اور بندے کے درمیان تعلقات شخصی کے اثبات کے حوالے سے بھی اقبال بیسویں صدی کے کچھ یورپی مفکرین کے ہم نوا ہیں۔

انہوں نے قرآن کی روشنی میں آدم کا نائب خداوند اور شریک کار کی حیثیت سے از سرنو جو جائزہ لیا جو ایسے معاشرے میں بہت اہم تھا جہاں قیاس آرائی پر مبنی تصوف' توکل پر بے جا زور اور بے شمار مذاہب کے قواعد اور عقائد کے زیرِ اثر اسلام تیرہ سو برس کے عرصے میں متحجر ہو چکا تھا۔ اقبال نے ہم وطن مسلمانوں کو اصل اسلام کی طرف لے جانے کا خواب دیکھا جو یونانی فلسفے سے داغ دار نہیں تھا۔ اپنے ان عزائم میں وہ دہلی کے اٹھارہویں صدی کے عظیم مصلحین کی صف میں کھڑے تھے صوفیاء کو جمود کا الزام دینے اور ان کی نظری بحثوں اور شاعری کو ملت اسلامیہ کے لئے خطرہ قرار دینے میں بھی وہ ان کے ہم زبان تھے۔ پیر کی اپنے جاہل مریدین پر بے حساب گرفت بھی انسانی نشوونما کے لئے اتنی ہی خطرناک تھی جتنی تنگ ذہن ملا کی جس نے درس تحریک دینے والے دین کو قرآن اور حدیث کی تشریح در تشریح کے بوجھ تلے دبا دیا تھا۔

ان کے نزدیک اندھی تقلید مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھی۔ تقلید سے ان کی مراد صرف فقہی مکاتبِ فکر کی پیروی نہ تھی بلکہ مغرب کی نقالی بھی تھی جو زیادہ تباہ کن تھی۔ اقبال نے 1905ء کے انگلینڈ میں مغربی سیاست اور نسوانی تحریکوں کا مشاہدہ بھی کیا۔ اس لئے وہ مغربی نسوانی آزادی کی تحریکوں سے بھی اتنے ہی متنفر ہیں جتنے مغربی سیاست سے۔ وہ عورت کو ماں کے روپ میں دیکھتے ہیں اور جاوید نامہ میں آزادی نسواں کی خواتین کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے جنسی آزادی کے حصول میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ مغربی عورت کے خاکوں میں ان کا رویہ اپنے سے پہلے پائے جانے اردو اظہاری اور بیانی کلیشہ کا ہے۔ وہ عورتوں کی انتخابی سرگرمیوں کو اپنی ایک اوّل دور کی نوٹ بک میں "بدحالی سے مداوا کی بجائے خاوندوں کیلئے پکار قرار دیتے ہیں۔ لیکن اپنے اس آزادی نسواں کے خلاف رویے کے باوجود انہوں نے بیوی کے مرنے کے بعد اپنے بچوں کی تربیت ایک جرمن خاتون کی زیر سرپرستی کروائی۔ لیکن تقلید مغرب پر اپنی اس ساری تنقید کے باوجود ان کے افکار مارٹن بیر (Martin Buber) اور Teilhard De Chardin جیسے معاصرین سے متماثل ہیں۔ انسان کو اس اسرار کو قبول کرتے ہوئے زندگی گزارنا ہے کہ خدا شخصی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کل پر محیط سپر ایگو ہے۔ اسے اس واردات سے گزرنا ہے کہ دوران عبادت اس کی اپنی

ایگو کس طرح عظیم ترین ایگو سے آگاہ ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کے نزدیک اصل عبادت یہی ہے کہ اس کے ارادے کی قلب ماہیت اس طرح ہو کہ وہ رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہو جائے۔ دوران خلوت وہ رضائے الٰہی سے جتنا آگاہ ہو گا اتنا ہی وہ واپسی پر اسے دنیا پر منکشف کرنے پر قدر ہو گا۔ زندگی کا مقصد اپنی ذات کو خدا کے سمندر میں گم کر دینا نہیں بلکہ' جیساکہ نقشبندی سکھاتے ہیں' ایک بدلی ہوئی شخصیت کے طور پر واپس لوٹ آنا ہے تاکہ اس دنیا میں کام کر کے اس کا ترفع کیا جا سکے۔ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہر بشر کو اس عمل سے گزرنا چاہئے لیکن اس عمل کی کامل ترین مثال پیغمبر کی ذات ہے۔ وہ بلند ترین ممکن مقام یعنی عبدہ (سورہ 71/1) کے مقام پر پہنچ گئے۔ آپ خدا کے قریب ترین تھے اور اس کی رضا کو اہلِ زمین تک لانے کا ذریعہ تھے۔ یہ مثالی کردار نٹشے کے سپر مین سے قطعی متضاد ہے جو اس وقت ظاہر ہوا جیسا "خدا مر چکا ہے"۔ عشق رسول ملت کی رگوں میں خون کی مانند دوڑتا ہے اور مسلمانوں کی زندگی کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ کیونکہ وہ بلند ترین آرائشوں کی تجسیم ہے۔ چنانچہ اس کا حتمی ہونا اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے۔ اقبال اس عقیدے کو فلسفیانہ اصطلاحات میں بیان کرتا ہے جس سے زیادہ آزاد خیال مفکر خطرناک نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

اقبال کا شاعرانہ بیان کسی ایک روشن مرکز سے پھوٹتی کرنوں کی طرح ہے اور یہ مرکز وحدانیت ہے۔ زندہ خدا کی وحدت یا آخری نبی کا منفرد مرتبہ' بذریعہ وحی اتری ایک کتاب اور ایک مرکز عبادت یعنی کعبہ ایسی علامات ہیں جن پر سب مسلمانوں کو متحد ہو کر ایک ملت بننا چاہئے اور توحید کی زندہ شہادت بن جانا چاہئے۔

معصوم پیدا کئے گئے انسانوں کو اپنی تکمیل کے لئے ساری عمر جدوجہد کرنا ہوتی ہے اس راز کی بہترین شاعرانہ شبیہہ پیام مشرق کی تسخیر فطرت سے بنتی ہے۔ اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ "شیطان کا آدم کو بھٹکانا پدر آدم کے لئے مقام شکر ہے' کیونکہ وہ جہد مسلسل کی لذت سے آشنا ہوا۔ شیطان اور اپنی خواہشات اسفل سے متواتر جہاد کے باعث وہ مرد مومن کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر شیطان اسی آدم کو سجدہ کرے گا۔ جو اس نے قرآن کی سورہ 2/31 کے مطابق کرنے سے انکار کر دیا۔

اقبال کی توجیہات اتنے متنوع طریقوں سے کی جا سکتی ہے کہ ولفرڈ کینٹویل سمتھ

نے اس کے لئے دو ابواب مختص کیے ہیں ایک باب میں اس پر بطور مصلح بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں بطور ایک رجعتی کے۔ مشرقی یورپ اور ہندوستان کے کئی شارحین نے انہیں صرف معاشرتی مصلح کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ وہ اصطلاح کے درست معنی میں وہ سوشلسٹ نہیں تھا۔

"انہیں منطقی اور تجزیاتی سطح پر سرمایہ داری کی خرابی کا علم نہیں لیکن وہ انسان سے محبت کے باعث جذباتی سطح پر سوشلسٹ تھے (ڈبلیو سی سمتھ)"

اگرچہ انہوں نے بے خدا کمیونزم پر تنقید کی ہے تاہم وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ محض ایک ابتدائی مرحلہ ہو جس کے بعد تسلیم یعنی "الا" کی منزل آئے۔ انہوں نے ایک عمدہ نظم "لینن بحضور خدا" بھی لکھی۔ انہوں نے سرمایہ داری اور سامراجیت پر سخت تنقید کی لیکن کوئی جامع اقتصادی' سیاسی اور معاشرتی نظام پیش نہیں کیا۔ وہ اپنی وفات کے نو سال بعد ہونے والی خونریزی کی پیش بینی نہ کر سکے۔ نہ ہی دو حصوں پر مشتمل پاکستان ان کے خاکے میں شامل تھا جو دو ملکوں میں بٹ گیا۔

اقبال کے وہ نظریات جن میں خدا کے عظیم ترین خودی ہونے اور خدا اور انسان کے درمیان ذاتی تعلقات پر زور دیا گیا ہے بیسویں صدی کے بعض مغربی اور مشرقی مفکرین کے تصورات کے خاصا نزدیک ہیں' لیکن اسلام کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ان کی وابستگی اپنی جگہ مسلمہ اور غیر متاثر رہتی ہے۔

اسلامی ہند کا کوئی شاعر برصغیر سے باہر اقبال سے زیادہ معروف نہیں۔ لیکن جنگوں کے درمیانی سالوں میں اور بھی کئی مصلحین پیدا ہوئے۔ طیف کے دوسرے سرے پر مولانا ابوالکلام آزاد کھڑے ہیں جن کا بیان ایک طاقتور صحافی اور تحریک خلافت کے نظریہ دان کی حیثیت سے پہلے آ چکا ہے۔

1931ء ہندی مسلمانوں کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ خلافت کے عزم مصمم رکھنے والے راہنما مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں ایک پر تاثیر تقریر کرنے کے بعد فوت ہو گئے تھے۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے ہندی مسلمانوں کی اس دوہری مشکل کا ذکر کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنے خصوصی سیاسی مفادات کا تحفظ بھی عزیز ہے۔ اس کانفرنس کے بعد ایم اے جناح اپنے ملک کی صورتِ حال

سے مایوس ہو کر لندن میں سکونت پذیر ہو گئے۔ جمعیت العلمائے ہند نے 1931ء میں سہارنپور کے اجلاس میں اپنے آئینی منصوبے کے چودہ نکات کا اعلان کیا اسی سال مولانا آزاد کی ترجمان القرآن کی پہلی جلد منظر عام پر آئی۔ قرآن کی یہ تفسیر اور ترجمہ صرف پہلی تئیس سورتوں پر مشتمل ہے اور کبھی مکمل نہ ہو سکا۔ اس کتاب نے اپنی خوب صورت اردو کے باعث اہلِ ذوق سے دادِ تحسین وصول کی۔ اس میں شامل سورہ فاتح کی تفسیر سے آزاد کے مذہبی نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ نظریات ہندی تصوف کی نمائندہ ہمہ گیر وحدت سے پھوٹتے ہیں اور اقبال کے تصورات سے کافی مختلف ہیں۔ آزاد کے نزدیک اپنے اپنے مقام پر تمام مذاہب سچے ہیں اور اسلام کو ان پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے اس کے کہ یہ معلمین اور مذاہب کی تعلیمات کے درست عقائد کی تصدیق کرتا ہے۔ سورہ فاتح کی ابتدائی آیات کی روشنی میں آزاد خدا میں ربوبیت، رحمت اور عدل کی خصوصیات دیکھتا ہے۔ ربوبیت کی اصطلاح دورِ اولیٰ کے صوفیاء نے بھی استعمال کی۔ وہ اسے خدا تعالیٰ کی جلالت کلی کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن آزاد کے ہاں یہ اصطلاح رحیم و کریم کی جامع تعبیر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یعنی کہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفت جس کے تحت وہ ایک بچے کی تخلیق کرتا ہے اور اس کے رحم مادر میں آنے کے ساتھ ہی نگہداشت اور پرورش کا بندوبست کرتا ہے جو اس کی مکمل ترین نشوونما ہونے تک جاری رہتی ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد رحمت کو تقدیر سے وابستہ کرتے ہیں جو اس کے نزدیک محض قسمت نہیں بلکہ اپنے لفظی مادے کے مطابق ہر مخلوق کے لئے ایک متناسب حصہ مقرر کرنے کا نام ہے اس رحمت میں "ہدایہ" بھی شامل ہے۔ جانوروں کی سطح پر یہ ہدایہ زندگی گزارنے کی جبلت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے جبکہ ارفع درجے پر یہ پہلے زبان اور پھر تعقل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کے باعث انسان دوسری مخلوقات سے متمیز ہے۔ حتیٰ کہ تعقل کو بھی خدا کی فہم اور اس تک رسائی کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ آزاد نے یہ ترتیب قرآن کی سورہ 87/23 سے اخذ کی۔

انسان کو یہ سیکھنا ہے کہ صرف خدا ہی رحمت کا سرچشمہ ہے اور یوں حقیقی موحد بن جاتا ہے۔ انسان اور خدا کو محبت کا رشتہ باہم منسلک کرتا ہے یہاں قاری کو غزالی کی "احیاء علوم الدین" کے باب کتاب المحبہ کا بیان یاد آجاتا ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں کہ آزاد کو عیسائیت اور اسلام کی روح کافی متشابہہ نظر آتی ہیں لیکن وہ زور دیتے ہیں کہ اسلام خدا کی لا

محدود رحمت کے ساتھ ساتھ تصورِ عدل بھی دیتا ہے جس کا مطلب ہر طرح کی زیادتیوں سے گریز ہے۔ اسلام کی صوفیانہ تشریح کو اپنی الٰہیات کی بنیاد بنانے والے دوسرے مفکرین کی طرح آزاد بھی سہ پہلو مذہب کی بات کرتے ہیں یعنی اسلام جس کا مطلب ایک مسلمان کا سا رویہ اور عمل ہے ایمان جو ایقانِ باطن کا حامل ہے اور سب سے آخر میں احسان جو ان کے نزدیک حقیقت کے حتمی ادراک کا اظہار ہے اگرچہ آزاد اپنشدوں کی منفی الٰہیات کی لطافت اور ترفع کے مداح ہیں لیکن وہ قرآن کے بتائے گئے تنزیہہ اور تشبیہہ کے درمیانی وسطی راستے راہ اعتدال کو ترجیح دیتے ہیں۔

آزاد کی الٰہیات اصطفائی ہے یعنی کہ ان کے ہاں جو جہاں سے اچھا ملے لے لینے کا رجحان موجود ہے جس میں وہ محبت پر خاصا زور دیتے ہیں لیکن انہوں نے جمال کے عنصر کو بھی اقبال سے زیادہ اہمیت دی۔ ان کے نزدیک جمال رحم کا جزو لازم ہے وہ ہر جگہ جمال کا ادراک کرنے اور اس آہنگ کے اثبات کی کوشش کرتے ہیں جو تخلیق کا حتمی مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دو قومی نظریے اور ہندی مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کے تصورات سے چڑ تھی۔ خیال رہے کہ آزاد زندگی کے منفی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ لیکن ان کا ایمان ہے کہ راہِ ہدایت کے بنیادی اصول کے باعث باطل بالآخر ختم ہو جائے گا۔ ان کا تصورِ عشق کلاسیکل صوفی اصطلاح محبہ کے نزدیک ہے جبکہ اقبال کا عشق' جو ایک متحرک محبت اور اصولِ زندگی ہے آزاد کے تصور سے خاصا مختلف تھا۔ ان کا عشق نرم جو اور نرم خو ہے جبکہ اقبال کا عشق متلاطم اور آتشیں ہے۔ لیکن اس مسئلے پر آزاد نے بھی اقبال سے اتفاق کیا ہو تا کہ مذہب کی روح اور اس کی رسوم ایک چیز نہیں۔ راسخ العقیدہ علماء نے آزاد اور اقبال دونوں پر ناک بھوں چڑھائی کیونکہ وہ خدا کی دی ہوئی شریعت اور انسان کی بنائی ہوئی فقہ کو باہم متفق اور متحد دیکھنا چاہتے تھے۔

اقبال کی طرح آزاد نے بھی فرد کے کردار پر کافی غور و فکر کیا۔ تقسیم کے بعد جب وہ وزیر تعلیم بن چکے تھے۔ ایک سمپوزیم میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ انسانی فطرت اتنی بلند اور ارفع ہے کہ انسانی تعقل اس سے بلند کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتی۔

اس نظریے کے تائید میں وہ چندو گیا اپنشد اور ایک مشہور حدیث سے تائید حاصل کرتے ہیں۔ حدیث کا ترجمہ اس طرح ہے "جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو

پہچانا" یہیں پر صوفی فکر آزاد اور پیامبر مفکر اقبال میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اقبال کا مثالی انسان تخلیقی اصول کے ساتھ بنیادی وحدت کی واردات سے گزرنے والا عاشق نہیں بلکہ ایک شخصی خدا کا شریکِ کار اور انتھک خادم ہے۔

آزاد کی تفسیر قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے ہم مذہبوں اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل پر گہری تشویش تھی اس حوالے سے ان کے خیالات جاننے کے لئے ذیل میں دیا گیا ایک اقتباس موزوں رہے گا۔ جو 1942ء کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے۔ اس وقت تقسیم ہند کے خیالات مسلمانوں میں جڑ پکڑ رہے تھے۔

> "اپنے مسلم ہونے کا احساس میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ میں اپنی تیرہ صدیوں پر محیط ثقافت کا ایک شمہ تک چھوڑنے پر تیار نہیں۔ بطور مسلمان میرا حق ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک اور جذبہ بھی میرے اندر موجود ہے۔ میرا انسان ہونا اس جذبے کی نفی نہیں کرتا۔ مجھے اپنے ہندوستانی ہونے پر بھی فخر ہے ہمیں یہاں ایک عظیم ورثہ لائے اور ہندوستان نے بھی ہم پر اپنے خزینوں کے در کھول دیئے۔ ہم نے یہاں مساوات اور جمہوریت متعارف کروائی"۔

جدید ہندوستان کے اسلام کی ایک اور دلچسپ شخصیت عبید اللہ سندھی ہیں یہ اقبال اور آزاد دونوں سے بڑے تھے۔ سکھ سے مسلمان ہونے کے بعد ان کی ابتدائی تربیت سندھ کے ایک مشہور پیر کے زیرِ اثر ہوئی۔ کچھ عرصہ دیوبند میں بھی زیر تعلیم رہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران یہ کابل میں ہندوستانی آزاد حکومت قائم کرنے والوں میں شامل تھے۔ اس کوشش کو کانگریس کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اسی دوران انہوں نے ریشمی رومال تحریک میں بھی حصہ لیا۔ برطانوی حکومت نے انہیں جلاوطن کر دیا اور انہوں نے بیس سال سے زیادہ عرصہ مختلف ممالک میں گزارا۔ 1922ء میں سات ماہ تک ماسکو میں کمیونسٹ پارٹی کے مہمان رہے۔ ترکی میں اتاترک کی اصلاحات کا مشاہدہ کیا۔ پھر وہ مکہ میں مقیم ہو گئے۔ جہاں انہوں نے تفسیر قرآن "الہام الرحمان" پر کام کیا جسے بعد ازاں اس کام کی بنیاد پر ان کے تاتار شاگرد موسیٰ جار اللہ نے از سر نو مرتب کیا۔ وہ 1939ء میں ہندوستان واپس آئے عبید اللہ

سندھی جو بقول ڈبلیو کنٹویل سمتھ کے ایک آتش گیر شورشی تھے' نے وحدت الوجود کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کیا۔ لیکن وہ ہندوستان میں لسانی بنیادوں پر فیڈریشن کے حق میں تھے۔ چونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں بہت سی نسلوں کو اکٹھے پرامن طور پر رہنا پڑے گا اور یہ کہ ہندوستان میں مذاہب میں ایک وحدتِ مقصد موجود ہے اس لئے انہوں نے جمہوریت' اقتصادی ترقی اور وراثت میں ملے معاشرتی طرز عمل میں مثبت تبدیلی کے خواب دیکھے۔ انہیں تمام مسائل کا حل اپنے اسلامی سوشلزم میں نظر آتا تھا۔ لفظ جہاد کو وہ مکمل ذمہ داری کے معنی میں لیتے تھے۔ جس میں تلوار' قلم' زبان اور رائے کا بے خوف اظہار سب شامل تھے۔

عبیداللہ سندھی خود کو شاہ ولی اللہ کا پیروکار اور شارح خیال کرتے تھے لیکن انہوں نے شاہ ولی اللہ کی روحانیات کی تشریح بالکل ذاتی رنگ میں کی۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ سے سبق سیکھا کہ "اسلامی انقلاب کی روح یہ ہے کہ ہر سامراجیت کو کچل دیا جائے" تو مندرجہ بالا حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ بعض دوسرے بشمول ولی اللہ' مسلم لیڈروں کی طرف انہیں عربی النسل ہونے کا گھمنڈ نہیں تھا اور وہ اس پر پریشان بھی نہیں تھے۔ بلکہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اسی رویئے کی وجہ سے وہ قرآن میں ایسے کنایہ ڈھونڈتے ہیں جو دوسرے مذاہب کے حق میں ہو وہ اس لیے ان کے نزدیک سورۃ 2/59 کے صابیوں میں برہمن اور بدھ بھی شامل تھے۔ اسی طرح کی تشریح میں وہ سورہ 72 میں مذکور جنوں کی معاملے میں اور بھی آگے نکل جاتے ہیں ان کے خیال میں قرآن سننے والے جنوں کے جس گروہ کا ذکر ہوا ہے وہ دراصل ایک خاص ملک مثلاً عرب کے ملک سے باہر کے انسان ہیں۔ جنہوں نے ریاضتوں سے روحانی طاقت حاصل کر لی ہے وہ ان لوگوں میں راہبوں' یوگیوں اور بھکشواں کو شامل کرتے ہیں۔

عبیداللہ سندھی کی قرآنی تشریح اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن نے جدید سندھی تفاسیر کو بہت متاثر کیا۔ اس کی ایک مثال مولانا تاج الدین امروتی کی تفسیر ہے۔ آپ بھی عبیداللہ سندھی کی طرح آزادی کے مجاہد تھے اور سکھر کے نزدیک رائس کینال کے عین وسط میں تعمیر شدہ ان کی چھوٹی سی مسجد انگریزوں کی کھدوائی جانے والی نہر کی خاطر مسجد کے انہدام سے انکار کی گواہی دیتی ہے۔

دیوبند مکتب فکر سے متاثر ہونے والوں میں مولانا محمد الیاس (1885-944) بھی شامل ہیں۔ ان کا اندازِ فکر عبید اللہ سندھی سے متضاد تھا۔ تحریک ایمان کے بانی مولانا محمد الیاس نے اپنی تحریک کی بنیاد سورہ 3/104 پر رکھی۔

مفلوک الحال طبقے میں پیدا ہونے والے مولانا الیاس' جو ہکلاتے بھی تھے' نے مدارس قائم کئے اور عوام الناس کو ادھر راغب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے دہلی کے علاقے میں گھر گھر جا کر لوگوں کو دعوت دی کیونکہ مومنین کی خدمت کرنا وقف علی اللہ ہونے کی علامت ہے۔ انہوں نے زیادہ تر کام دہلی کے نواح میں بسنے والے میواتیوں میں کیا جنہیں سالار مسعود کے ہاتھ پر قبول اسلام کا دعویٰ تھا۔ لیکن ان کے ہاں بیشتر رسومات غیر اسلامی تھیں۔ ابتدائی صدیوں میں یہ لوگ سلاطین دہلی کیلئے مستقل سر درد بنے رہے۔ مولانا محمد الیاس نے ان میں سے بہت سوں کو خالص ترین اسلام کی طرف مائل کیا جس کی انہوں نے دارالحکومت میں بھی تبلیغ کی۔ صابریہ اور چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھنے والے محمد الیاس نے عدم تعاون اختیار کیا جس کی وجہ ان کے نزدیک 'انگریز کا اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہونا تھا۔ وہ اسلام کے معاملے میں انتہائی راسخ العقیدہ شخص تھے اور عورتوں کے پردے کے بڑی شدت سے قائل۔ ان کا کام اسلام کے لئے انتہائی جانثاری اور خلوص کی ایک اعلیٰ مثال ہے جس کی تعریف ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی کی۔ لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو ان کے سخت نقاد ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو حالیہ سماجی اور سیاسی حقائق سے منقطع رکھا۔

مولانا الیاس کا احاطہ کار محدود تھا اور ان کی تبلیغی سرگرمیاں بھی ایک خاص علاقے سے باہر نہ نکل سکیں۔ لیکن ایک اور دیوبندی اپنے ماننے والوں کی ایک منظم جماعت بنانے میں کامیاب ہو گئے جس نے وقتاً فوقتاً سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ یہ مولانا مودودی ہیں جو 1903ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم دیوبند میں ہوئی جہاں وہ دائیں بازو سے وابستہ تھے انہوں نے اپنی اولین تحریروں سے ہی زندگی مکمل طور پر اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ جب ہم اس کی ایک تصنیف میں پڑھتے ہیں۔

> "سورج' چاند اور تمام ستارے مسلم ہیں۔ اسلام ہی انسان کا فطری مذہب ہے جو کسی خاص ملک یا قوم سے وابستہ نہیں۔ ہر دور' ہر قوم اور تمام ممالک کے خدا شناس لوگ اِسی مذہب پر عمل پیرا رہے۔ ان

سب کا مذہب اسلام ہی تھا خواہ وہ اسے اس خاص نام 'اسلام' سے پکارتے تھے یا نہیں"

تو ہمیں یہ امر نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ بہت موقف اختیار کر لیتا ہے کہ راست بازی کی کوئی قدر سچے اسلامی عقیدے سے باہر نہیں۔ لیکن مودودی کی راست بازی دورِ اولیٰ کے زاہدوں کے اسلامی نظریات سے مشابہ ہے جس کی اٹھان خوف پر ہے۔ خدا کے عذاب کا خوف' دوزخ کا خوف اور عورتوں سے واسطہ پڑنے کے نتیجے میں بشری امکانات کا خوف اسی لیے مودودی پردے کے سختی سے قائل ہیں۔ قرآنی احکام تعزیرات کے نفاذ پر بحث کے دوران وہ مغربی معاشرت کا خاکہ اڑاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ وہاں یہ سزائیں بے معنی ہوں گی کیونکہ

"وہاں جنسی انگیخت کی شدت اور کثرت ہے اور فحش کتابیں' فلمیں اور گانے عام چلن بن چکے ہیں' وہاں مخلوط محافل عین تہذیب خیال کی جاتی ہیں"

لادینیت' قومیت اور جمہوریت ہی تمام آفات کی جڑیں ہیں چنانچہ مودودی ایک حکومت الٰہیہ 'زیادہ سے زیادہ اس میں ایک مخصوص طرح کی جمہوریت شامل کر لیں' کے علمبردار ہیں۔ جس میں واحد قانون ساز اللہ کی حکومت مسلمان مل جل کر چلائیں۔ ہر اکثریتی مسلمان ملک کو شریعت بطور ملکی قانون کے تسلیم کر لینی چاہئے۔

دوسرے دیوبندیوں کی طرح مودودی بھی نظریہ پاکستان کے خلاف تھے لیکن تقسیم کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ 1941ء میں قائم کی گئی جماعت اسلامی کی صورت میں ان کے پاس کافی موثر قوت موجود تھی۔ یہ جماعت اطاعتِ امیر کے اصولوں پر چلتی ہے اور عملی اغراض و مقاصد کے ہر حوالے سے پاکستان کی واحد منظم مذہبی جماعت ہے۔ اس کے پاس ایک ٹھوس لائحہ عمل موجود ہے۔ اپنے جذبہ یگانگت' اظہار یک جہتی اور ضرورت مند افراد کی مدد کا جذبہ رکھنے والے کارکنوں کی وجہ سے یہ جماعت طالب علموں تک میں کسی نہ کسی حد تک مقبول ہے۔ اس کے ارکان نے پاکستان کے آئین میں زیادہ سے زیادہ اسلامی دفعات شامل کروانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

ایک اور مصلح کا ذکر بھی باقی ہے جو مولانا مودودی کا ہم عصر تھا اور جس نے

1938ء میں دہلی میں ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام اقبال کی ایک نظم کے نام پر "طلوع اسلام" رکھا گیا۔ ان کا نام غلام احمد پرویز تھا اور یہ سرکاری ملازم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "ایک جدید اور خوشحال معاشرے کے راہ کی رکاوٹ مذہبی رہنما ہیں۔ پرویز نے اسلامی معاشرے کی تعمیر میں احادیث کے مفید استعمال کو خارج از امکان قرار دیا ہے۔ اسلامی ریاست پر ان کے نظریات غیر معمولی اور نئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن میں مذکور خیر دراصل ایک فلاحی معاشرے کی تعمیر کا حکم ہے جو اپنے تمام امکانات کے ساتھ قائم کیا جانا چاہئے۔ ان کے معاشرتی نظریات بھی خاصے جرات مندانہ ہیں اور کئی علماء کا ان پر فتویٰ تکفیر جاری کرنا قطعی تعجب انگیز نہیں۔ نظری سطح پر وہ جگہ بارتھی (Barthian) الٰہیات سے مماثلت رکھتا ہے۔ خدا اور انسان کے باہمی تعلق کے بیان میں یہ مماثلت خصوصیت سے نمایاں ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان خدا سے براہ راست رابطہ نہیں کر سکتا۔ اس رابطہ کا آغاز لازماً خدا کی طرف سے ہونا چاہئے۔ خدا نے اپنا آپ قرآن کی وساطت سے بیان کر دیا ہے اس لئے عظمت اور نظامِ خداوندی کی تفہیم کی واحد بنیاد یہ کتاب ہے۔ وہ تصوف کو مکمل طور پر مسترد کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہ انسان کی وہ علم حاصل کرنے کی کوشش ہے' جو اس کے لئے روا نہ رکھا گیا۔ پرویز مذہب کو بارتھین کے سے مفہوم میں لیتا ہے' یعنی اسے انسان کی ایجاد خیال کرتا ہے جس کے لئے اسلام ایک چیلنج ہے پرویز کے پاکستان میں آباد ہونے کے بعد دانشوروں کے ایک مخصوص حلقے میں اپنے نظریات کی تبلیغ جاری رکھی لیکن جماعت اسلامی کے مقابلے کی بھرپور تنظیم نہ بنا پائے۔

اس صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں جب بر صغیر کے طول و عرض میں سول نافرمانی پھیلی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کئی تنظیمیں منظر عام پر آئیں۔ سب سے پہلی اور بلاآخر سب سے موثر' خدائی خدمت گار تحریک تھی جو عبدالغفار خاں نے شمال مغربی سرحدی صوبے کے پٹھانوں میں قائم کی۔ ان کا مقصد انسانی بھائی چارہ اور خدمت خلق تھا۔ کلیتاً انگریز مخالف عبدالغفار خاں نے ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے پہلے کانگرس سے تعاون کیا۔ اس کی تحریک عدم تشدد کی پرچارک تھی۔ اپنی خود سری کے لئے مشہور پٹھانوں میں اس طرح کی تحریک چلانا واقعی ایک کامیابی تھی۔ اسی لئے عبدالغفار خاں جلد ہی سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ خدائی خدمت گار جو اپنی وردی کے باعث

سرخ پوش کہلاتے تھے قبائلی اور دیہاتی علاقوں میں کامیاب تھے۔ انگریزوں نے ان سے لڑائی کی جس میں ان کی معاونت کچھ وفادار مقامیوں نے کی جن میں چھوٹے سے پہاڑی علاقے دیر کا نواب بھی شامل تھا۔ عبدالغفار خاں ایک افسانوی شخصیت بن گیا۔ اس کی شہرت بعد ازاں اس کے بیٹے ولی خاں کو ورثے میں ملی۔ جب برصغیر کی تقسیم کا معاملہ سنجیدگی اختیار کر گیا تو سرخ پوشوں نے ایک اور تقسیم کا پرچار شروع کر دیا۔ وہ پشتو خواں علاقوں کو متحد کر کے پشتونستان بنانا چاہتے تھے۔ 1946ء میں پیش کیا جانے والا خیال اب بھی زندہ ہے اور پاکستان کی مختلف حکومتیں ولی خاں کے خلاف سیاسی اقدامات کرتی رہی ہیں۔

خدائی خدمت گار کی تشکیل کے دورانیہ ہی میں پنجاب کے مسلمان رہنماؤں نے ایک جماعت احرار کے نام سے 1930ء میں قائم کی۔ اس میں چند کانگریسی مسلمان بھی شریک ہوئے جو مسلم لیگ میں شمولیت نہیں چاہتے تھے۔

خدائی خدمت گاروں کی طرح احرار سے وابستہ لوگ بھی انگریز مخالفت میں کٹر تھے۔ ان کے ترجمان عطاءاللہ شاہ بخاری' جن کا شمار ہندی مسلمانوں کے چند بہترین مقررین میں ہوتا تھا' عوام کی ایک بڑی تعداد جلسوں میں اکٹھا کر لیتے تھے۔ تاہم جب کانگرس نے 1940ء میں ستیہ گرہ شروع کی تو احرار میں پھوٹ پڑ گئی۔ تاہم احرار کے کئی سابقہ رہنما پاکستانی سیاست میں کردار ادا کرتے رہے۔

1931ء میں ابھرنے والی تیسری بڑی تحریک' خاکسار تحریک تھی جو شمال مغربی سرحد سے شروع ہوئی لیکن جلد ہی پنجاب' یوپی اور دوسرے علاقوں میں پھیل گئی۔ ان کے بانی عنائت اللہ مشرقی (1963-1888ء) اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے کیمبرج میں ریاضی اور طبیعات پڑھی تھی اور مغربی علوم سے اچھی طرح واقف تھے۔ مشرقی نے ایک ایسی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی جس کے کئی حوالے سے اقبال کے تحرک کا عملی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام عمل ہے اس تنظیم کا رکن خاکی یونیفارم اور بیلچے سے مسلح ہوتا تھا اور خود کو اسلام اور خدا کا سپاہی خیال کرتا تھا۔ ان کی فوجی تقسیم مجاہد' پاکباز اور جانباز پر مشتمل ہوتی تھی جانباز' چنیدہ افراد ہوتے تھے جو اپنے اطاعت نامہ پر خون سے دستخط کرتے تھے۔ ان تینوں کے علاوہ محفوظ دستے بھی تھے جنہیں معاونین کہا جاتا تھا یہ سب ارکان ایک امیر یعنی مشرقی کی اطاعت کرتے تھے ہر شام انہیں فوجی قواعد کروائے جاتے۔

پھر انہیں درس دیا جاتا جس کا موضوع عام طور پر اسلام کا بالآخر فاتح عالم ہونا اور اس کا ایک خوش حال اور صحت مند معاشرہ کی ضمانت ہونا ہوتا تھا۔ علامہ مشرقی کے مرتب کردہ اس پروگرام' جسے ایس بیلجان "جدید مسلم احکام عشرہ" قرار دیتا ہے' میں اسلام کو مبراء الخطا الٰہیاتی سماجیات کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس عوامی تحریک میں شامل لوگوں نے عدم تعاون کی نسوانی تحریک اور مسلمانوں کو قابلِ عمل راہ ہدایت دکھانے میں ناکام مذہبی رہنما پر اپنے رہنما کے حملوں کا ساتھ دیا۔ علامہ مشرقی نے کہا کہ

"ان کی غربت' جہالت' محرومی' بے کسی' بے حسی اور بدحالی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کچھ بھی ہوں اپنی قوم کے رہنما نہیں ہو سکتے"

بیلچہ اس تنظیم کی مذہبی علامت تھا جو انہیں نہ صرف جنگ خندق میں مصروف حضرت محمدؐ کی یاد دلاتا تھا بلکہ اور بھی بہت سے کام دیتا تھا۔ لاہور کے ایک ناخواندہ اور جانثار خاکسار نے اپنے بیلچے کے سوا سو استعمالات پر ایک طویل نظم لکھی۔

رفتہ رفتہ خاکساروں کا اثر و رسوخ پورے ملک میں پھیل گیا۔ 1939ء میں انہوں نے لکھنو میں شیعہ سنی فسادات میں مداخلت کی اور 1941ء میں اپنا ہیڈ کوارٹر علی گڑھ منتقل کر لیا۔ اس وقت حکومت نے تمام غیر سرکاری فوجی قواعد پر پابندی عائد کر دی تھی۔ علامہ مشرقی جیل میں تھے اور جماعت کو دو سالوں کے لئے غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ بالآخر جب جنگ کے خاتمے پر ان کی سرگرمیوں پر سے پابندیاں جزوی طور پر اٹھائی گئیں تو اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے اور عوام کو پیش کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

ان فیصلہ کن سالوں میں علاقائی جماعتوں نے بھی عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جموں و کشمیر میں شیخ عبداللہ نے مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی جس میں بیشتر مسلمان شامل ہو گئے جن کی اس گزشتہ ایک صدی سے ہندو راجاؤں کے تحت چلی آنے والی ریاست میں اکثریت تھی۔ بنگال کی طرح کشمیر میں بھی مسلمانوں کا تعلق اقتصادی طور پر کمزور طبقوں سے تھا۔ بنگال میں کرشک پرجاتے آئینی پروگرام کے ذریعے زرعی انقلاب کو اپنا مطمع نظر بنایا اس لئے یہ پارٹی اکیلے مسلمانوں کا ادارہ نہیں تھا اس کے رہنما فضل الحق' جو 1937ء کی مخلوط کابینہ کے وزیراعلیٰ تھے' نے کانگرس کے متذبذب رویے سے مایوس ہو کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد ازاں مسٹر جناح سے اختلافات کے سبب پارٹی رکنیت سے معطل بھی

رہے۔

کچھ تحریکیں پیشوں کی بنیاد پر بنائی گئی تھیں ان میں جولاہوں کی انصار پارٹی اور دھنیوں کی پارٹی قابلِ ذکر ہے' جو خود کو منصور حلاج کی رعایت سے منصوری کہتے تھے لیکن یہ تنظیمیں لمبا عرصہ نہ چل سکیں۔ بڑی سیاسی جماعتوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور باہمی انفرادیت کے باعث چھوٹی جماعتیں ان میں ضم ہوتی گئیں۔

ایک اور انگریز دشمن تحریک جس کا ذکر کرنا ضروری ہے سندھ میں حروں کی تحریک ہے جن کی سرگرمیوں کو ایچ۔ ٹی۔ لیمبرک (H.T. Lambrick) نے بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ جس میں حروں کی مذہبی اور اس کے ساتھ ساتھ ان سرگرمیوں کا حال بھی ملتا ہے جنہیں مذہبی' بہر حال قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حر یعنی آزاد پیر پگارو کے چنیدہ درویش ہیں جو قادریہ سلسلے کی ایک شاخ کا مذہبی پیشوا ہے۔ اس خاندان کے پہلے ممتاز نمائندہ پیر محمد راشد (متوفی 1817ء) تھے۔ یہ خاندان اوائل وسطی دور میں سندھ آیا اور لاکھی میں آباد ہو گیا۔ بعد میں انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر کنگری منتقل کر لیا۔ سندھ کی تمدنی زندگی میں اس خاندان کا کردار خاصا اہم ہے۔ انیسویں صدی میں یہ خانوادہ دو شاخوں میں بٹ گیا پگارو یعنی پگڑی والے اور جھنڈے دار یعنی کہ جھنڈے والے۔ اول الذکر شاخ نے پہلے سید احمد بریلوی کا ساتھ دیا تھا۔ مکمل طور پر جانثار مریدوں کا گروہ پیر پگاڑو صبغت اللہ ثانی کے عہد میں منظر عام پر آیا۔ جسے وہ کسی طور پر مظہر الٰہی سے کم خیال نہیں کرتے تھے۔ اس کے حروں کا رجحان کانگریس کی طرف تھا۔ اس کے حروں نے انگریزوں سے جنگ کی جس میں انہوں نے ہر وہ طریقہ استعمال کیا جو ذہنوں میں آسکتا ہے اس لڑائی میں ان کا اپنا اور ان کا ساتھ نہ دینے والے سندھیوں کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ 1940ء میں پیر پگاڑو کو بمبئی میں پھانسی دیئے جانے کے بعد بھی حروں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ کئی اعتبار سے' اگرچہ چھوٹے پیمانے پر' حروں کا تقابل اسماعیلی رہنما حسن بن صباح کے فدائین سے کیا جاسکتا ہے۔

تحریک آزادی ہندوستانی مسلمانوں کے کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہ تھی شاعر بھی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے جوش ملیح آبادی کی طرح اس دن کے نغمے گائے جب جیل کی دیواریں ٹوٹ گریں گی اور لوگ آزادی اور خوشی

کی زندگی گزاریں گے۔ بنگال میں نذرالاسلام کی نظمیں بنگالی ادب میں ایک نیا تیکھا اور متحرک اضافہ ہے یہ نظمیں لوگوں میں جوش و خروش کا جذبہ بیدار کرنے کا سبب بنیں۔ 1936ء میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین نے مذہبی یا تمدنی کی بجائے نئے معاشرتی نظام کے حوالے سے ایک نئے ہندوستان کے ظہور کی امیدوں کا اظہار کیا۔

"نوجوان مثالیت پسندوں کے ہاتھ میں سوشلزم ایک آلہ تھا جسے وہ لوگوں کی اکثریت کو باہمی اختلاف بھلا کر اپنی غربت کے مداوا کی جدوجہد کا درس دینے کے لئے استعمال کر سکتے تھے"

حتیٰ کہ اقبال نے بھی ایک ایسی مثالی ریاست کا خواب دیکھا جس میں اسلام کے سماجی مساوات کا بنیادی اصول بروئے کار لایا جائے گا۔ دیوبندیوں میں سے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ارتکاز کی ممانعت 'امداد باہمی کے اداروں کے قیام اور سہولتوں اور موقعوں کی مساوی فراہمی کے نظریات "اپنی کتاب اسلام کے معاشی نظام" میں بیان کئے جو اشتراکی رنگ لئے ہوئے تھے۔

لیکن تمام جماعتوں اور گروہوں اور اسلامی نظریات کی مختلف تعبیریں کرنے والے علماء میں ایک امر مشترک تھا یعنی انگریزوں سے آزادی لیکن کانگرس کے علاوہ صرف ایک اور جماعت فیصلہ کن حیثیت حاصل کر سکی اور یہ جماعت مسلم لیگ تھی۔ 1906ء میں قائم ہونے والی اس جماعت میں ممتاز مسلمان مفکر اور سیاستدان شامل تھے۔ لیکن یہ کبھی بھی کوئی بڑا کردار ادا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ پنجاب مسلم لیگ میں علامہ اقبال اور سر محمد شفیع بھی شامل تھے اس کی تاریخ کا نیا دور اس وقت شروع ہو سکا جب محمد علی جناح کو انگلینڈ کی خود ساختہ جلاوطنی ترک کر کے ہندوستان واپس آنے پر قائل کر لیا گیا۔ جناح نے مسلم لیگ کو حقیقی مسلم تحریک بنا دیا اور دوہری رکنیت پر پابندی لگا کر اسے واضح طور پر کانگرس مخالف رنگ دے دیا۔ بالآخر لیگ حصولِ پاکستان کے لئے ذریعہ بنی اور اقبال نے 21 جون 1937ء کو جناح کو ایک خط میں لکھا۔

"آپ واحد ہندوستانی مسلمان ہیں جنہیں مسلم قوم آنے والے طوفان میں رہنمائی کے لئے موزوں سمجھتی ہے"

آنے والے طوفان کے آثار نظر آرہے تھے 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ

کے نامزد نمائندوں میں سے صرف 4.5 فیصد کامیاب ہو سکے۔ اس سال جناح نے علی گڑھ میں طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جذبہ پروگرام کے کچھ اہم نکات بیان کیے۔

> "لیگ نے آپ لوگوں کو رجعت پسند مسلمانوں سے آزاد کروا کر اس اہل بنا دیا ہے کہ آپ قوم کے خود غرض اور غدار عناصر کو مسترد کر سکیں' اس نے آپ کو مولویوں اور مولاناؤں کے طبقے سے آزادی دلوائی ہے"

بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ دیوبند مکتب فکر کے رہنماؤں نے لیگ کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ کچھ عرصے کے بعد مودودی نے اعلان کیا کہ جناح کا پاکستان "ایک کافرستان ہوگا" مغربی طرز فکر کے جدت پسند لیگی رہنماؤں اور روایت پرست قدامت پسندوں کے درمیان اس کھینچا تانی کے نتائج و عواقب نو مولود مملکت پاکستان کو وجود میں آنے کے کئی سال بعد تک بھگتنا تھے۔

کانگریس کا اب بھی دعویٰ تھا کہ وہ سمیت مسلمانوں کے سارے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ اسی بنیاد پر وہ لیگ کو بے وقعت سمجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ جبکہ لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی ترجمانی کا دعویٰ تھا جب لیگ نے دو قومی نظریہ قبول کیا اور 23 مارچ 1940ء کو ایک علیحدہ ملک پاکستان کی تخلیق کے لئے کام کرنے کا فیصلہ کیا تو ان دو جماعتوں کے درمیاں چپقلش اور بھی بڑھ گئی جناح' اب قائداعظم' نے دو قوموں کے مختلف تمدنی رویوں پر اپنے خیالات کا اظہار بڑے رواں انداز میں کیا ہے۔

> "ہندومت اور اسلام لفظ مذہب کے محدود معنی میں دو الگ مذاہب نہیں بلکہ دو الگ اور متشخص اور متمیز نظام ہائے حیات ہیں۔ ایک ہندوستانی قوم نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ یہاں ہندو اور مسلمان ہیں جو مختلف مذاہب' فلسفوں' رسوم و رواج اور ادب کے ماننے والے ہیں"

دیوبند کے مولانا مدنی جن کے ساتھ اقبال کا اسلام میں "قوم" اور "ملت" کے تصور پر مناظرہ چل رہا تھا' نے پاکستان کے منصوبے کو "مسلم اقلیتی علاقے میں ان کے لئے پیام اجل" قرار دیا۔ 1940ء میں ہندوستانی قومیت پرست جماعتوں نے سندھ کے

وزیر اعلیٰ اللہ بخش کی صدارت میں آزاد مسلم کانفرنس میں شرکت کی۔ صرف خاکسار اور مسلم لیگ شامل نہیں تھی یہاں اظہارِ خیال کیا گیا کہ

"ملک کے ہر کونے کھدرے میں مسلمانوں کے گھر اور ان کے بزرگوں کے مزار ہیں جو انہیں جان سے عزیز ہیں"

ایک سال بعد مولانا مودودی نے پٹھانکوٹ میں جماعت اسلامی قائم کی ان کے نزدیک مسلمان ایک قومیت نہیں بلکہ ایک گروہی جماعت تھے۔ تاہم شبیر احمد عثمانی نے' جس نے کچھ عرصہ بعد پاکستان میں "جمعیت العلمائے ہند" کی اولاد جمعیت العلمائے پاکستان قائم کی' بیان دیا کہ

"جنہیں پاکستان پر آل انڈیا مسلم لیگ کے بے دینوں کی حکومت کا خوف ہے' انہیں خود لیگ میں شامل ہونا چاہئے تاکہ پاکستان پر مسلمانوں کی حکومت کو یقینی بنا سکیں"

صوبائی مسلم لیگ کے نظریات ہمیشہ لیگ کی عمومی حکمت عملی سے ہم آہنگ نہیں ہوتے تھے۔ سندھ میں جی۔ ایم۔ سید نے "سندھ سندھیوں کے لئے" کا نعرہ بلند کیا حالانکہ سندھ 1937ء میں بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ ہو کر مسلم اکثریت کا صوبہ بن چکا تھا۔ 1944ء میں پنجاب مسلم لیگ نے سیاسی معاملات پر مرکز سے اختلاف کیا۔ بنگال میں جسے مستقبل کا مشرقی پاکستان بننا تھا' لیگ ابو الہاشم کی متحرک قیادت میں کام کر رہی تھی جس نے تقسیم کے بعد ڈھاکہ میں واقع اپنی اسلامی اکیڈمی میں اسلام کی جدیدیت پر کام کیا۔

نظریہ پاکستان کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ مستقبل کی ریاست کے طرز حکومت پر کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اس کی واضح شکل ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ 1944ء کی جناح گاندھی بات چیت میں ابھی طے نہیں ہو سکا تھا کہ آیا چھ صوبے (بلوچستان' سندھ' شمالی مغربی سرحدی صوبہ' پنجاب بنگال اور آسام) مکمل پاکستان میں شامل ہوں گے یا صرف ان کے مسلم اکثریت کے علاقے۔ لیکن پاکستان کے غیر واضح اصطلاحات میں پیش کئے جانے کے باوجود زیادہ سے زیادہ لوگ اس تصور کے گرد جمع ہو رہے تھے اور جنوری 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لئے مختص تمام نشستیں جیت لیں۔ تقسیم کی صورت میں مادر وطن کے ٹکڑے ہونے کے تصور نے فرقہ ورانہ تناؤ میں اضافہ کر دیا اور فرقہ ورانہ فسادات ہونے

لگے۔ اس کا آغاز کلکتے میں 1946ء کے مسلم کش فسادات سے ہوا۔ اگلا شہر بمبئی تھا۔ اس کے بعد دوسرے شہر بھی لپیٹ میں آ گئے۔ دسمبر 1946ء میں پنجاب کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کو اسمبلی سے الگ کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں پنجاب میں عوامی سطح پر سول نافرمانی کی تحریک چلی جس میں مسلمان خواتین نے سرگرمی سے حصہ لیا اور اعلیٰ درجے کے سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ تاہم سکھوں نے پاکستان کے منصوبے کی شدید مخالفت جاری رکھی کیونکہ اس کے نتیجے میں ان کے صوبے پنجاب کی تقسیم ناگزیر تھی۔ مشرقی پاکستان میں ہونے والے قتل میں سکھوں کے اس رویے کا بڑا ہاتھ تھا۔ 1940ء اور 1947ء کے درمیان جناح گاندھی اور برطانوی ہیئت مقتدرہ کے درمیان بے شمار مذاکرے اور تبادلہ وفود ہوا لیکن اس کا تعلق مذہبی کی بجائے سیاسی تاریخ سے ہے ان کے نتیجے میں 14 اگست 1947ء کو برصغیر تقسیم ہو گیا جیسا کہ سر پرسی وال سپئر (Percival Spear) نے لکھا

> "اقبال کے نظریہ، رحمت علی کے تخیل اور مسلمانوں کے خوف کو جناح کی عملی دانش نے مسلمانوں کے اتحاد میں بدل دیا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سے وہ کبھی اس طرح متحد نہ ہوئے تھے۔ اسی اتحاد کے باعث وہ ایک سیاسی تخلیق میں کامیاب ہو پائے"

اختتامیہ

برصغیر کی تقسیم جسے اقبال' جناح اور ان کے ہم خیال فرقہ ورانہ مسائل کا حل خیال کرتے تھے' 14 اگست 1947ء کو ہوئی۔ لیکن جس چیز کی پیش بینی اس عمل کے حامی اور اپنی نئی ریاست میں اپنے منفرد تشخص کی تشکیل کا خواب دیکھنے والے لاکھوں مسلمان نہیں کر سکتے تھے' پاکستان میں شامل ہو جانے والے علاقوں سے ہندوؤں اور ہندوستان میں آ جانے والے علاقوں سے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر انخلاء تھا اور نہ ہی انہیں اس خوں ریزی کا اندازہ تھا جو تقسیم کے بعد کے چند مہینوں میں ہوئی۔ اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچنے والے مہاجرین کی آبادکاری اور دو' اور بعد ازاں تین' ملکوں کے درمیان سیاسی تناؤ اس پر مستزاد تھا۔ پاکستان کو عملی طور پر تقریباً ہر شعبہ زندگی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے دونوں حصوں کے درمیان دو ہزار میل کا فاصلہ اور دو رسم الخط (ایک فارسی اور دوسرا دیوناگری) کی دوری حائل تھی۔ جہاں بھارت کو ایک چلا چلایا دارالحکومت دہلی ملا وہاں پاکستان کو اپنا دارالحکومت نئے سرے سے قائم کرنا پڑا اور پھر سندھ اور پنجاب کی اصل آبادی آنے والے مہاجروں کے لئے جن میں سے بیشتر نے حصول پاکستان کے لئے قربانی دی تھی پاکستان کو ان نئے آنے والوں میں سے بہت سے دانشور رہنما اور محافظ ملے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے سالوں تک مہاجر کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گزاری۔ خواجہ معین الدین کا ڈرامہ "لال قلعہ سے لالو کھیت" ان لوگوں کی حالت زار کو منعکس کرتا ہے۔

پاکستان کا سب سے اہم اور جیسا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ثابت ہوا' اور سب سے مشکل کام ایک ایسے آئین کی تشکیل تھی جو ملک کے اسلامی اور جدید تشخص دونوں کی ضمانت دے سکے۔ تقسیم کے ایک سال بعد 1948ء میں قائداعظم ایم۔ اے جناح کی وفات اور ان

کے لائق جانشین لیاقت علی خان کا 1951ء میں قتل ملک کے لئے نئے خطرات کا سبب بنا۔ آنے والے تیس سالوں کی تاریخ پر قابلِ ذکر اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے باوجود آئین کے لئے جدوجہد پر تیزی سے بدلتی ہوئی حکومتوں اور کئی فوجی حکومتوں کے سائے ہیں۔ ملک کو آزاد خیال اور ترقی پسند انداز میں آگے بڑھانے کے خواہشمند پاکستانیوں اور ملک کو خالصتاً اسلامی ریاست بنانے کے حامی قدامت پسند علماء کے درمیان کشمکش کا پہلا اظہار پنجاب میں احمدیوں کے خلاف تشدد کی صورت میں ہوا۔ پاکستان کا اس وقت کا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ عدالتی کمیشن نے فسادات کی وجوہات پر تحقیقات' منیر رپورٹ کی صورت میں پیش کی۔ اس رپورٹ کے مطابق ان المناک فسادات کی وجہ برطانوی نظام کے تربیت یافتہ ججوں اور روایتی علماء کے مابین تناقضِ فکر تھی تناقضِ فکر کا یہ عنصر آنے والے سالوں میں نہ صرف موجود رہا بلکہ بڑھتا چلا گیا۔

جدید دنیا کے متصادم نظریات کے مدمقابل نقطہ نظر تشکیل دینے کی کوششیں کی گئیں۔ بہت کم پاکستانی سماجی انصاف کے حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم کی اسی رائے سے اتفاق کریں گے۔

"اگر مارکسزم سرمایہ داری نظریہ کی ضد نظریہ ہے تو پھر اسلام کو ان دونوں کا جدلیاتی امتزاج خیال کیا جانا چاہیے"

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ بنیادی اسلامی مسائل کی تشکیل نو اور سنت کے فعال ہونے کے تصور پر زور دیتے ہوئے خصوصاً سرگرم تھا۔ ادارے کا متحرک ڈائریکٹر فضل الرحمٰن سنت کو اصولِ حرکت قرار دیتا تھا۔ لیکن کچھ حلقوں کو یہ اصول بھی زیادہ جرات آزما معلوم ہوا اور فضل الرحمٰن کو پاکستان چھوڑنا پڑا۔ جہاں دوسرے پاکستانیوں نے ملک کی علتِ وجود کی تعبیر قومیت کی بنیادوں پر کرنے کی کوشش کی وہاں جماعت اسلامی دوبارہ اسلامی اصولوں پر اتر آئی۔ ایک طرف مغربی پاکستان کے چار صوبوں کی مختلف لسانی روایات اور دوسری طرف رقبے میں چھوٹے لیکن زیادہ آبادی کے مشرقی پاکستان کے درمیان آویزش 1971ء کی جنگ کے بعد ملک ٹوٹنے پر منتج ہوئی۔ پاکستان کے مذہبی' سماجی اور دوسرے شعبوں میں ابھرنے والی تحریکوں سے انصاف کرنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اقبال کے بعد (اور زیادہ تر اس کے باعث) کوئی جدت پسند دانشور منظر عام پر نہ آیا۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت تقسیم کے وقت تقریباً چالیس ملین افراد پر مشتمل تھی۔ اسے بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم ابو الکلام آزاد تھے جبکہ کرسی صدارت پر بھی دو مسلمان ڈاکٹر ذاکر حسین اور فخر الدین احمد براجمان ہوئے جبکہ دوسری طرف پاکستان میں اقلیتی مذہب کا کوئی فرد صدر نہیں بن سکتا تھا۔ باقی ہر عہدہ ان کے لئے کھلا تھا۔ ہندو راجہ کی غالب مسلم اکثریت کی ریاست کشمیر کے ہندوستان سے الحاق اور مسلم حکمران کی ریاست حیدر آباد پر ہندوستان کے قبضے نے نئے تنازعات کھڑے کر دیئے۔ کشمیر آج بھی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بنیادی وجہ تنازعہ ہے۔ دوران تقسیم مسلمانوں کی تعذیب اور اس کے مابعد اثرات سے ان خدشات کی توثیق ہوئی جن کی بنیاد پر انہوں نے ایک مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ گاندھی کی مفاہمانہ حکمت عملی کے مخالفین میں سے ایک نے اسے 1948ء میں قتل کر دیا جس سے مسلمانوں کا خوف اور بھی بڑھ ہو گیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو، جن کی حالت کو ایس عابد معین نے اپنی کتاب The Destiny of Indian Muslims میں سب سے بہتر طور پر بیان کیا ہے، انڈین یونین کی سیکولر سیاست میں اپنی جگہ بنانے کے راستے تلاش کرنا تھے۔ ان میں سے کئی نے اسلام کو مذہبی، معاشرتی اور سیاسی اصولوں کے مجموعے کی بجائے، اصطلاح کے مغربی مفہوم میں مذہب خیال کرنا شروع کر دیا۔ انڈین، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز اور "اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی" اسلام کی جدیدیت میں پیش پیش ہیں۔ اے۔ اے علی جیسے مفکرین نے ایک غیر مذہبی سیاست میں مسلم الٰہیات کے تصورات کی تشکیل پر کلیہ وضع کیا کہ "اگر ہم قرآن کی طرف پلٹ نہیں سکتے تو ہمیں اسے لے کر آگے بڑھنا ہوگا"

پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی بیسویں صدی کے چیلنجوں کے جوابات ڈھونڈے گئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں پاکستان میں واقع ہونے والے کسی بھی مذہبی وقوعے کے اثرات ہندوستان میں لازماً محسوس کئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے شادی بیاہ کی رسوم جیسے معاشرتی رواجوں، عورتوں کے مقام اور متصوفانہ رجحانات پر تقسیم کے بعد دونوں حصوں میں آنے والی تبدیلیوں کے مطالعے کی ضرورت ہے۔

موجودہ صورت حال پر نہ تو خسرو کے بیان کردہ شکوہ اسلام کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ

ہی حالی کی بیان کردہ مایوس کن صورت حال کا۔ اسلام کا "اجماع ضدین" اور انفرادیت سے مرکب کی دونوعی آج بھی ایک خاص حد تک موجود ہے لیکن آج حیثیت مجموعی برصغیر کی تین ریاستوں (ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش) میں اسلام کے مطالعے کے لئے مشترکہ اساس ڈھونڈنا ممکن نہیں۔ اقبال کے صد سالہ جشن (1977ء) میں اس کے کام کے از سر نو جائزے سے پاکستان اور ہندوستان میں اسلام کی مختلف الجہت توجیہات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے باوجود قرآن کی اس آیت کو دہرانا بے محل نہ ہو گا جسے اقبال اور دوسرے جدت پسند مسلمان اپنے ہم وطنوں کے روشن مستقبل کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

"خدا ان کا مقدر نہیں بدلتا جو اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتے"